

جُمْلہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

جوئے نوز	_____	نام کتاب
علامہ غلام احمد پرویز	_____	مصنف
طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)	_____	ناشر
۲۵، بی، گلبرگ-۲، لاہور۔ ۵۴۶۶۰	_____	طابع
فون: ۸۹۲۳۶	_____	مطبع
فائدہ منصور نسیم	_____	
التور پرنٹرز و پبلشرز	_____	
۳/۲ فیصل نگر، ملتان روڈ	_____	
پوسٹ بکس ۲۱۹۰، لاہور۔ ۲۵	_____	
ٹیلیفون ۴۵۸۵۸۲۶	_____	
۴۵۸۶۸۳۱	_____	
۱۹۴۵ء	_____	ایڈیشن
۱۹۵۶ء	_____	دوسرا ایڈیشن
۱۹۶۲ء	_____	تیسرا ایڈیشن
۱۹۸۶ء (بلا ترمیم)	_____	چوتھا ایڈیشن
۱۹۹۳ء	_____	پانچواں ایڈیشن

طلوع اسلام ٹرسٹ کی شائع کردہ کتب کی جُمْلہ آمدن

شُرکائی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست مضمونات

جُوئے نور

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۴	اہمیت۔		
۵	حضرت نوحؑ کا وطن		
۶	اور آپ کا زمانہ		
۶	قرآنی حقائق اور تاریخی شواہد۔		
۷	حضرت نوحؑ اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔	۱	۱۔ طوفانِ نوحؑ
۷	آپ اس قوم میں پہلے رسول نہیں تھے۔	۲	حضرات انبیائے کرامؑ کا سلسلہ الذہب (شجرِ طیبتہ)
۸	اس قوم کی حالت کیا تھی؟	۳	انسانی آبادی کا اولین سرچشمہ!
۸	مکشی، خدا فراموشی، جور و استبداد	۴	تاریخ کی قیاس آرائیاں
۸	حضرت نوحؑ کی دعوت، انقلاب، یعنی حکومت صرف	۵	اقوامِ عالم کی ابتدائی تقسیم
۸	خدا کی جائز ہے اور کسی کی نہیں۔	۶	سامی النسل اقوام کے مولد و مسکن
۹	اور اس حکومت کے مرکز کی اطاعت ضروری	۷	محلِ قدیمہ کی تاریخ میں سرزمینِ عرب کی

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۰	اپنوں اور غیروں کا قرآنی معیار۔ ایک عظیم الشان حقیقت کی تبیین۔	۱۰	اس دعوت کی مخالفت اور مخالفت کے اسباب (۱) تعلیدِ آباء۔ اسلاف پرستی
۲۲	قوموں کی تشکیل کا معیار	۱۱	ہرزمانہ میں یہی لغزش کی گھاٹی بنتی ہے۔
۲۳	نیشنلزم کی لعنت	۱۱	(۲) نشہ حکومت کی سرستیاں۔ اربابِ اقتدار اپنی سطوت و استبداد کو نہیں چھوڑنا چاہتے۔
۲۴	قرآنی معیارِ قومیت۔ کفر اور ایمان	۱۲	مخالفت ہمیشہ سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے کہ یہ انقلاب سب سے زیادہ انہی کے خلاف ہوتا ہے۔
۲۶	شعوب اور قبائل کس طرح باقی رکھتے ہیں؟	۱۳	طبقاتی تقسیم اُس وقت بھی موجود تھی اور انقلاب اسی کے خلاف تھا۔
۲۷	”عمل غیر صالح“ کی ایک غلط توجیہ۔	۱۴	اور پیشوں کی تقسیم بھی۔
۲۸	ایک اور اہم حقیقت۔	۱۵	پچلے طبقے نے دعوت کو قبول کیا۔ مخالفین نے مشہور کر دیا کہ یہ داعی انقلاب (معاذ اللہ)
۲۹	عذابِ الہی اور حوادثِ ارضی و سماوی کا تعلق۔ یہ حوادث انسانی اعمال کا نتیجہ نہیں ہوتے تھے۔ رسول کو پہلے آگاہ کر دیا جاتا تھا۔	۱۶	پاگل ہے۔ تخویف و ترہیب کے حربے۔
۳۰	کیا طوفانِ نوح عالمگیر تھا؟	۱۷	یہ اعتراض کہ یہ رسول ہمارے جیسا انسان کیوں ہے؟ حضرت نوح ان کی اصلاح کی طرف سے بازو کس ہو گئے۔ کشتی کی تیاری۔
۳۱	حضرت نوح کی عمر کتنی تھی؟	۱۸	قوم کا مسخر! ظہورِ ناسخ کا وقت۔
۳۲	واقعہ حضرت نوح کے متعلق تورات کی تفصیل حقیقی آسمانی تعلیم اور محض تعلیم کافری۔	۱۹	طوفان! بلا نیگہ طوفان!! کشتی کی سلامتی۔
۳۳	مسلم اور اسلام۔ از اقل تا آخر ایک ہی حقیقت۔	۲۰	”اہل“ سے کیا مراد ہے؟
۳۴	سامی اقوام کے باقی انبیائے کرام حضرت نوح کی نسل سے تھے۔		
۳۵	”طوفان“ کا تذکرہ دیگر اقوام میں۔		
۳۶	ہندوؤں کے ہاں!		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۳	اس باطل عقیدہ کا بصیرت افروز بطلان		نہ معلوم مزید تحقیقات کس نتیجہ پر لے جائیں گی!
۵۴	یہ لوگ آنکھیں رکھتے تھے۔	۴۱	خلاصہ مبحث
	لیکن وحی کی روشنی سے انکار کی وجہ		(انبیائے کرام کی انقلابی تحریک کا مقصد)
	سے آنکھیں کچھ کام نہ دیتی تھیں	۴۳	۲۔ قوم عاد
۵۵	یہی کچھ آج بھی ہو رہے۔	۴۴	قوم فوج کی بربادی کے بعد بنی سام کی پہلی ترقی
۵۶	اوپھے ہتھیار!		قوم عاد سے ہوئی۔
"	ظہورِ ناسخ کا وقت	۴۵	ان کا علاقہ احقاف تھا۔
۵۸	بربادی اور عبرت انگیز بربادی۔	"	حضرت ہوڈا انہی کی طوفِ بھوت ہوئے تھے۔
	آندھی اور جھکڑ کا تباہ کن عذاب۔	"	اس قوم کو دولت و ثروت کی فراوانی ملی تھی۔
۵۹	جماعتِ مومنین کی حفاظت۔	۴۶	انہی کو عادہ ارم، ذات العماد کہتے ہیں۔
"	نگہ باز گشت۔	"	نہ صرف دولت و حشمت بلکہ علم و بصیرت بھی۔
"	محکومی و رسوائی خدا کا عذاب ہے۔		لیکن.....
۶۰	سعد و نحس کا فلسفہ۔	۴۷	نشہ حکومت کی بدستی نے حقائق کو جھٹلایا۔
	یہ اپنے ہی اعمال کے نتائج ہیں۔	۴۸	حضرت ہوڈنے حکومتِ البیہ کے انقلاب کی
۶۱	۳۔ لقمان (حکیم)		دعوت دی اور کہا کہ قوانین خداوندی کے
"	شریعتِ حضرت ہوڈ کا متبع حکمران۔		اتباع سے اور بھی قوت میں اضافہ ہوگا۔
	حکمتِ لقمانی		(ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ)
۶۲	کتاب و حکمت کا قرآنی مفہوم	۴۹	نظامِ حکومتِ خداوندی کی عملی تشکیل۔ اطاعتِ مرکز۔
"	شرک سے اجتناب۔	۵۰	اربابِ اقتدار کی طرف سے مخالفت۔
۶۳	صلوٰۃ امر بالمعروف والنہی عن المنکر	۵۱	تسخیرِ ادراس تہزار۔
"	حسن معاشرت۔	"	لیکن جو اب میں تمکنت و متانت۔
۶۴	خلاصہ مبحث۔	۵۲	اسلاف پرستی کا جذبہ۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷۹	رہنے چاہئیں	۶۷	۴۔ ناقہ صالح (قومِ ثمود)
۸۰	مخالفین کی طرف سے سرکشی۔	۶۸	اُمّ سائبہ کا دوسرا مشہور قبیلہ
۸۱	متمفقہ سازش سے اونٹنی کی ہلاکت	۶۹	جس کا سکن وادیِ قرنیٰ اور دار الحکومت
۸۲	ہلاکت انیکز عذاب۔	۷۰	مجر تھا۔
۸۳	زلزلہ۔ کڑک۔ گرج۔ آتش نشانی۔	۷۱	اور زمانہ اڑھائی ہزار سے ۱۴۰۰ ق. م
۸۴	یہ تھی "خدا کی تدبیر"	۷۲	محلّات اور قلعوں کی مالک۔ دولت
۸۵	اور اس کا نتیجہ! ہلاکت و بربادی۔	۷۳	کی فراوانی۔
۸۶	یہ کچھ کیوں ہوا؟ صفتِ رحیمیت کا تقاضا	۷۴	انہی کی طرف حضرت صالح مبعوث ہوئے۔
۸۷	قانونِ مکافات کی ہمہ گیری۔	۷۵	قوم کی حالت۔ مفسدین (فساد کے کہتے ہیں)۔
۸۸	جماعتِ مومنین کو بچا لیا گیا۔	۷۶	حضرت صالح کی دعوتِ انقلاب۔
۸۹	(قوموں کی اجلِ معین)	۷۷	حکومتِ الہیہ کے قیام کی دعوت۔
۹۰	رسولِ اجر نہیں مانگتا۔ ایک عظیم اعلانِ حقیقت۔	۷۸	ہر غیر خدائی طاغوتی قوت کی اطاعت سے انکار
۹۱	ناقہ۔ کس طرح آیتِ اللہ تھی!	۷۹	اربابِ اقتدار کی طرف سے مخالفت۔
۹۲	ناقہ صالح اور کعبۃ اللہ۔	۸۰	دیوانگی کی تہمت!
۹۳	ایک لطیف مماثلت۔	۸۱	وہی اعتراض کہ ایک انسان رسول کیسے؟
۹۴	خلاصہ بحث۔	۸۲	بازاریت
۹۵	۵۔ خلیلِ اکبر حضرت ابراہیمؑ	۸۳	اسلاف پرستی
۹۶	ملتِ حنیفہ کے موٹس اولیٰ	۸۴	(ایک اہم نکتہ۔ رسول شروع سے ہی
۹۷	سلسلہ نسب حضرت نوح سے دسویں پشت میں	۸۵	ایک ممتاز شخصیت کا مالک ہوتا ہے)۔
۹۸	آپ کا زمانہ؟ قریب سنہ ۲۲ ق. م	۸۶	خفیہ سازشیں۔ قتل کی تدبیریں۔
۹۸	پیدائش؟ بجکہ میں۔ لیکن مسلک؟ بت شکنی!	۸۷	ناقہ صالح۔ ایک واضح نشانی۔
		۸۸	رزق کے سرچشمے سب کے لئے یکساں طور پر کھلے

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	منہ سے بول اُٹھے۔	۹۹	مقام بلند! امامتِ نوح انسانی۔
۱۱۸	یہی واقعہ، باندازہ دیگر۔	۱۰۰	دعوتِ توحید کی ابتداء خود اپنے گھر سے۔
۱۱۹	معبد میں تیشہ ابراہیمی۔	۱۰۱	دعوت کا جواب؟ دھمکی!
۱۲۰	اور طوفان انگیزی۔	۱۰۲	دعوت کا جواب۔
۱۰۱	بادشاہ کے دربار میں۔	۱۰۳	دعوتِ مغفرت اور پھر اس سے بھی بریت۔
۱۲۱	حجّتِ ابراہیمی کا معجزانہ انداز و اسلوب۔	۱۰۴	گھر سے باہر، قوم سے خطاب۔
۱۰۲	بادشاہ لاجواب ہو گیا۔	۱۰۵	جواب میں وہی "اسلاف پرستی" کی دلیل!
۱۲۲	آتشیں تیزو!	۱۰۶	شُرک کی بنیاد اور اس کی بیخ کنی۔
۱۲۳	اور حضرت ابراہیم کی سلامتی۔	۱۰۷	دعوتِ توحید کے بصیرت افروز دلائل۔
۱۰۳	ہجرت۔	۱۰۸	بُت تراشی افکِ عظیم ہے۔
۱۲۵	اس سے مفہوم؟ ایک عظیم الشان انقلاب کی تمہید!	۱۰۹	ستارہ پرستی کے خلاف ایک اچھوتا اندازِ تذکیر۔
۱۰۴	خاکِ وطن اور ایمانِ مؤمن کا باہمی تعلق۔	۱۱۰	اجرامِ فلکی کی نظر فریب تا جاکیاں اور ان کی "الومیت" کی تردید۔
۱۲۶	ہجرتِ آئینِ حیاتِ سلم ہے۔	۱۱۱	معبودِ حقیقی کی طرف رجوع۔
۱۰۵	نئی سر زمین میں اولاد۔	۱۱۲	اس واقعہ کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ۔
۱۲۷	کبرِ سنی میں اولاد کی بشارت۔	۱۱۳	رسولِ تجارت و مشاہدات کے بعد اتقرانی
۱۲۸	سر زمینِ حجاز میں شاخِ اسماعیل کی تخم ریزی۔	۱۱۴	طور پر حقیقت تک نہیں پہنچتا بلکہ اس پر
۱۲۹	بے برگ و گیاہ زمین میں حسین شادا بیاں۔	۱۱۵	حقیقت خدا کی طرف سے بے نقاب ہوتی ہے۔
۱۳۰	حضرت اسماعیلؑ کو ایک شہر میں لا کر بسایا گیا تھا۔	۱۱۶	بت شکنی کا واقعہ ایک اور اندازِ موعظت
۱۳۱	اس واقعہ کے متعلق تورات کا بیان۔	۱۱۷	معبد میں کہرام مچ گیا۔
۱۳۲		۱۱۸	حضرت ابراہیم سے استفسار
		۱۱۹	جواب کا نرالا انداز جس سے حقیقت خود

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۳۶	قلب و نگاہ کے بُت کدوں میں چھپے ہوئے بتوں کی شکست و ریخت۔	۱۳۳	بعض افسوسناک افسانہ تراشیاں۔
..	کسی "آفل" میں مجبور ہونے کی صلاحیت نہیں ہو سکتی۔	۱۳۴	یہود اور مستشرقین کی تاسف انگیز روش۔
۱۳۷	آفل کا مفہوم فلسفہ جدید کی رو سے۔	۱۳۵	لیکن اعترافِ حقیقت (حاشیہ)
"	ملتِ ابراہیمی کے اتباع کی تاکید۔	۱۳۶	تسلیم و رضا کا مقام بلند۔ بیٹے کی قربانی۔
۱۳۸	صحیفِ ابراہیمی کا ذکر قرآن کریم میں۔	۱۳۷	مقامِ مسلم۔
"	اب تعلیمِ ابراہیمی قرآن کریم کے اندر ہے۔	۱۳۸	لیکن حضرت اسماعیلؑ ایک "بڑی قربانی" کے لئے وقف کر لئے گئے تھے۔
۱۳۹	حضرت ابراہیمؑ یہودی یا نصرانی نہیں تھے۔	۱۳۹	یہ "ذبحِ عظیم" (بڑی قربانی) کیا تھی؟
۱۴۰	بعض متعصب مستشرقین کی ایک عجیب کوشش۔	۱۴۰	خدا کے گھر کی پاسبانی کی خدمتِ عظیم
۱۴۱	وہ ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کوئی نیا دین نہیں۔	"	اس صحرائی قربانِ گاہ کی عظمت۔
"	لیکن اسلام کا یہ دعویٰ ہی کب ہے؟	"	تعمیرِ کعبہ کا حسین منظر۔
"	حضرت ابراہیمؑ نے اسلام پیش کیا۔	۱۴۱	مخلصانہ التجائیں اور والہانہ دعائیں۔
۱۵۱	اسلام کیا ہے؟	۱۴۲	ایک پیکرِ نوزائیت کی آمد کی تمنائیں۔
"	تمام انبیائے سابقہ کا دین۔	۱۴۳	یوں تعمیر ہوا ملتِ حنیفہ کا مرکزِ محسوس۔
"	لیکن اب قرآن کے اندر۔	"	مسلمِ اول۔
"	حتیٰ کہ نام بھی وہی — مسلم	۱۴۴	قلبِ سلیم اور طبعِ علیم۔
۱۵۲	اسلام کے متعلق ایک اصولی نکتہ۔	"	صاحبِ علم و بصیرت۔
		"	اور وارثِ قوت و شہمت۔
		"	ایک ذات میں پوری کی پوری ملت منعکس
		۱۴۵	فرد اور جماعت کا باہمی ربط و تعلق۔
		۱۴۶	توحید کا بلند اور لطیف مقام۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	لیکن حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں وہ ایک نظام ہیئت اجتماعیہ کی شکل میں سامنے آتا ہے۔	۱۵۲	کائنات کی ہر شے ایک اصول کے ماتحت چل رہی ہے۔
	دین صرف اخلاقی ضابطہ کا نام نہیں۔	"	انسانوں کیلئے اصول زندگی کا نام اسلام ہے۔
	نبوت کے ساتھ ملکِ عظیم بھی۔	"	اسلام اب قرآن کے اندر ہے۔
	افضلیت اور قیادت اُمم۔	۱۵۳	قومیت اور اسلام۔
۱۶۱	تمام دنیا کی امامت لیکن خدا کی خلائی۔	"	قومیت کے مختلف ملت، حنیفہ کا اسلامی مسلک۔
"	اجزائے قیام حکومتِ الہیہ۔	"	حضرت نوح سے لیکر حضور خاتم النبیین
"	یہ تمام انعامات موردی نہ تھے، جو ہر ذاتی پر منحصر تھے۔	"	تک۔
"	لیکن مسلمانوں کی کیا حالت ہے؟	"	معیار تقسیم کفر و اسلام
۱۶۲	احیائے قوم کا دشوار گزار مرحلہ۔	"	فمن تبعنی فانہ منی کا عظیم نشان
"	" تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟ حضرت ابراہیمؑ کی بے تابی تمنا۔	"	اصول۔
"	موت اور حیات کا قرآنی مفہوم۔	۱۵۴	اس کے ماتحت اپنی ساری قوم اور اعزہ سے قطع تعلق۔ وطن کا رشتہ بھی اسکے
۱۶۳	اس قسم کے مردے کیسے زندہ ہوں گے؟	"	سامنے کوئی پیر نہیں۔
"	اپنی طرف مالا س کرنے سے۔	۱۵۵	یہ عظیم نشان مسلکِ اُسوۂ حسنہ ہے
۱۶۴	حضرت ابراہیمؑ نے سچ مچ کے مردوں کی نسبت ایسا نہیں کہا تھا، نہ ہی کوئی نبی ایسا کہے گا۔	"	جس کے اتباع کی تاکید کی گئی ہے۔
"	ایک عظیم نشان حقیقت کی وضاحت۔	۱۵۶	اسی اصول کی دلائل و وضاحت۔
۱۶۵	حضرت ابراہیمؑ کو اس بارے میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں تھا۔	۱۵۷	باز، بخوشتن نگر۔
"		۱۵۸	فرقہ پرستی کا شرک
"		۱۵۹	نسل اور وطن کا بڑا کدو
"		۱۶۰	ذریعتِ ابراہیمیٰ پر انعامِ خداوندی۔
"		"	دین یوں تو شروع سے ایک ہی چلا آ رہا تھا

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۹۱	یہ خرابیاں اس قدر عام ہو چکی تھیں کہ سوسائٹی انہیں معیوب ہی نہیں سمجھتی تھی۔	۱۷۶	لیکن بخاری شریف کی ایک روایت کیا کہتی ہے؟
۱۹۲	تذکرہ و معظمت کا جواب۔	۱۷۷	اسی قسم کی اور روایات
۱۹۳	اور دھمکیاں بھی۔	۱۷۸	ایک اور تقرقہ دینے والی روایت۔
۱۹۴	ظہورِ ستارح کا وقت۔	"	(معاذ اللہ) کذب کا بہتان۔
"	(حضرت ابراہیمؑ کی رقیق قلبی)	۱۷۹	ان روایات میں دین کی صحیح پوزیشن کیا ہے؟
۱۹۵	فرستادگانِ خداوندی۔	۱۷۷	حضرت اسماعیلؑ اور یعقوب علیہم السلام
"	ان کے بارے میں قوم کا رویہ۔		قرآن نے ان حضرات کا جمالی ذکر نہایت حسن و خوبی سے کیا ہے۔
"	حضرت لوطؑ کا اضطراب۔		لیکن تورات میں اور یہی کچھ ہے۔
۱۹۶	قوم لوطؑ پر عذاب۔	۱۸۰	"ذبیح اللہ" حضرت اسماعیلؑ ہیں
"	کوہِ آتش فشاں کی شعلہ باریاں۔	"	یا حضرت اسحاقؑ؟
۱۹۸	حضرت لوطؑ کے "اہل" اور آل کو بچالیا گیا۔	۱۸۲	حضرت یعقوبؑ کے متعلق تورات کی روایت
"	اہل (اور آل) کا قرآنی مفہوم) وہی جو پہلے بیان ہو چکا ہے (تذکرہ لوطؑ و ابراہیمؑ میں)۔	۱۸۳	استدراک
"	یعنی جماعتِ مومنین نہ کہ رشتہ دار	۱۸۵	حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ بت شکنی کے متعلق ایک وضاحت۔
۱۹۹	اگر بیوی بھی اس جماعت میں داخل نہیں تو اہل میں سے نہیں ہو سکتی۔	۱۸۷	حضرت لوطؑ علیہ السلام (۲۲۰ ق م)
"	(داستانِ عبرت) لیکن اربابِ بصیرت کے لئے۔	۱۸۸	حضرت ابراہیمؑ کے بچنے، سدوم کی بستی کی طرف۔
۲۰۳	تورات کا بیان۔	۱۹۰	یہ قوم، لواطت کی شرمناک فحاشی کی مرکب تھی۔
"	ایک ایسی حیا سوز داستان جس سے انسانیت کی روح کانپ اُٹھے۔	۱۹۱	اور رہزنی کی بھی۔
۲۰۴	بعض ضمنی گوشے۔		

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۲۶	کشکش حرم و دیر!!	۲۰۴	(i) بیٹیوں سے کیا مراد تھی؟
"	دونوں میں فرق	۲۰۵	(ii) ہمان کون تھے؟
۲۲۸	جذباتِ بیباک کی دست درازیاں۔	۲۰۸	خلاصہ بحث (۱) از حضرت ابراہیمؑ تا حضرت لوطؑ
"	اور حضرت یوسفؑ کا فرار۔	۲۱۳	حضرت یوسف علیہ السلام
"	یہ دوڑے۔ وہ پکے۔ دروازہ کھلا	۲۱۴	بلندی سیرت کا ایک مرقع زریں۔
"	اور سامنے۔	۲۱۵	پہلا خواب، یعنی آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر۔
"	ہوسِ خام کی پست فطرتی، حضرت یوسفؑ کے	۲۱۶	برادرانِ یوسفؑ کی آتشِ حدودِ رقابت۔
"	خلافِ اہتمام!	۲۱۸	ایک خفیہ سازش
۲۲۹	دامینِ یوسفؑ کی پاکیزگی کی شہادت۔	"	باپ کا خدشہ۔
۲۳۰	إِنَّ كَيْدَ كُنَّ عَظِيمَةً کا مفہوم! ایک	۲۱۹	(حضرت) یوسفؑ کو اندھے کنوئیں میں ڈال دیا گیا۔
"	ضمنی گوشہ۔	"	غم و اندوہ کی تابکیوں میں نورمانی کی تجلیاں
"	غیر فطری تہذیب میں غیرت کا شہرہ؟	"	بھائیوں کی واپسی۔ مکرو فریب کا پورا سوانگ۔
۲۳۱	عورتوں کے ہاتھ کاٹ لینے کے واقعہ کی توجیہ۔	۲۲۰	صبرِ یعقوب۔
۲۳۳	امراة العزیز کا جذبہ انتقام!	۲۲۱	حضرت یوسفؑ قافلہ والوں کے ہاتھ میں۔
۲۳۴	اور ایمانِ یوسفی کی کوہِ تمثالی!!	۲۲۲	اور پھر مصر کے بازار میں
"	بلا جسم، قید و بند۔	۲۲۳	وہاں سے عزیز کے محلات میں۔
۲۳۵	قید خانہ کے ساتھیوں کے خواب۔	۲۲۴	چوپانی سے جہانبانی کے سرروز کی تعلیم
۲۳۶	قید خانہ میں وعظِ یوسفی!	۲۲۵	حسن سیرت اور حسن صورت کا معصوم ہتہ۔ یوسف
"	دین کا اساسی اور بنیادی اصول۔	"	اور فقہِ سلمانوں کا بیگز رنگین! عزیز
۲۳۸	ان الحکم الا للہ	"	کی بیوی۔
"	اس اصول کی وضاحت۔	"	
"	خوابوں کی تعبیر۔	"	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۴۰	اب حضرت یوسفؑ "بے نقاب" سامنے آگئے۔	۲۳۹	بادشاہ کا خواب
۲۴۱	عفوگناہ۔ دامانِ یوسفی کی وسعتیں۔	۲۴۱	اس کی تعبیر اور اس کے ساتھ ہی تدبیر
۲۴۲	پیر مین یوسفی کے ساتھ مراجعت۔	"	بادشاہ نے قید سے نکالنے کا حکم بھیج دیا۔
"	شیمم یوسفی کی عطر بیزیاں۔	۲۴۲	لیکن حضرت یوسفؑ نے کہا کہ.....
۲۴۳	گرمنا آپہنچا اور.....	"	بلندی سیرت کا مظاہرہ
۲۴۴	سارا گھرانہ جانبِ مصر روانہ ہوا۔	"	لیکن تورات کا بیان۔
"	عزت و تکریم کی مسندیں بچھائی گئیں۔	۲۴۳	اور خود ہمارے ہاں کی ایک روایت۔
۲۴۶	بعض ضمنی گوشے۔	"	معاملہ کی تحقیق۔
"	(i) تاویل الاحادیث سے مفہوم کیا ہے؟	۲۴۴	اور اس کا نتیجہ؟ حضرت یوسفؑ کی تربیت
۲۴۸	(ii) خوابوں کی دنیا۔	۲۴۵	منصبِ جلیلہ پر سرفرازی۔
"	علم تجزیہ نفس کی تحقیق	۲۴۶	تمکن فی الارض۔
۲۴۱	خوابوں کی تعبیر کا مسئلہ	۲۴۷	برادرانِ یوسفؑ (حضرت یوسفؑ) کے حضور۔
۲۴۲	قصہ حضرت یوسفؑ کے خواب	۲۴۸	حسن سلوک کے ساتھ واپسی۔
۲۴۳	خوابوں کی توہم پرستی	۲۴۹	دوسری مرتبہ۔ بن یامین کو ساتھ لے کر
"	قرآن کریم کی تفسیر علم تعبیر کی رو سے	۲۵۰	حضرت یعقوبؑ کی بیٹوں کو تاکید
۲۴۴	(iii) سجدہ تعظیمی سے مراد	۲۵۱	قافلہ کی واپسی۔ شاہی کٹورہ کی گمشدگی۔
۲۴۵	(vi) کیا حضرت یوسفؑ نے ایک غیر خدائی	۲۵۳	پیالہ بن یامین کی بوری سے برآمد ہوا۔
"	نظام حکومت میں شرکت کی تھی؟	"	یہ کیسے ہوا؟
۲۴۷	خلاصہ مباحث۔	۲۵۵	برادرانِ یوسفؑ کا جگر پاشش طعن۔
۲۴۹	حضرت شعیب علیہ السلام	۲۵۷	اور باپ کے متعلق اپنی قساوت قلبی کا مظاہرہ
۲۵۰	قوم مدین کون تھی؟	۲۵۸	حضرت یعقوبؑ کا صبر اور دردِ فراق کی شدت
"	انہی میں حضرت شعیبؑ پیدا ہوئے۔	۲۵۹	تیسری بار پھر مصر۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۸۷	لہذا اسے سیاست سے واسطہ کیوں ہو؟	۲۸۰	حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ کے تعلقات
۲۸۸	آپ اپنی نمازیں پڑھتے رہیے، ہمارے معاملات	۲۸۱	اصحاب الایکہ
..	میں دخل نہ دیکھئے۔	۲۸۲	حضرت شعیب اپنی قوم کی طرف پہلے رسول نہ تھے۔
..	اس مسلک کی رو سے حق و باطل کی تمیز ہی باقی	..	اس قوم کی عام حالت
..	نہیں رہتی۔	..	سربایہ داری کی لعنت
۲۸۹	اسی لئے کہہ دیا جاتا ہے کہ عالمگیر سچائیاں سب	..	قوت کاٹھ
..	جگہ یکساں ہیں۔	۲۸۳	فتنہ و فساد
۲۹۰	قوم کے اعتراض کا جواب۔	..	بنی اسرائیل کے خلاف مختلف حربے۔
..	اسلاف پرستی کا مسلک غلط ہے۔	۲۸۴	دعوت شعیبی۔
۲۹۱	قوم نے کہا کہ اگر تمہارے ساتھ ہماری برادری کے	..	خدا کی محکومیت، مرکز حقہ کی اطاعت، قانون
..	آدمی نہ ہوتے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے۔	..	مکافاتِ عمل پر ایمان۔
..	اس کا جواب۔	..	دعوت کا جواب!
۲۹۲	قوم کے دیگر اعتراضات مسجور بشریت۔	۲۸۵	استبداد کی دھمکی۔
۲۹۳	ظہورِ نجات کا وقت۔	۲۸۶	ایک بہت بڑا اعتراض۔
۲۹۵	عذاب	..	مذہبِ خدا اور بندے کے درمیان ایک
۲۹۴	خلاصہٴ محبت۔	..	پرائیویٹ تعلق کا نام ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تعارف

میں نے اپنے دور کے تعلیم یافتہ طبقہ تک قرآنی حقائق پہنچانے کا جو سلسلہ ”معارف القرآن“ کے نام سے شروع کیا تھا اس کی پہلی جلد ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں خدا کے تصور، صفاتِ خداوندی اور خدا اور انسان کے باہمی تعلق پر تفصیلی بحث کی گئی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں اس سلسلہ کی دوسری کڑی شائع ہوئی، جس میں تخلیقِ انسانی، آدم، ملائکہ، ابلیس، وحی، رسالت جیسے اہم عنوانات کے بعد حضرت نوح، حضرت ہوڈ اور حضرت صالح اور ان کی اقوام کا تذکرہ آگیا تھا۔ اسی سال اس کی تیسری جلد شائع ہوئی جس میں حضرت ابراہیم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک کے انبیاء کرام کے کوائف حیات اور ان کی اقوام کا ذکر تھا۔ ۱۹۴۹ء میں اس سلسلہ کی چوتھی کڑی شائع ہوئی جو حضور قائم النبیین کی سیرتِ طیبہ پر مشتمل تھی۔

۲۔ اس سلسلہ کی اشاعت کے بعد محسوس ہوا کہ اکثر احباب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ معارف القرآن کسی ایک کتاب کا نام ہے جو کئی جلدوں میں شائع کی گئی ہے۔ حقیقت یہ نہیں تھی۔ اس سلسلہ کی ہر کڑی، ایک خاص موضوع پر مشتمل تھی اور خود مکنتھی۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ اس کے جدید ایڈیشن الگ الگ عنوانات سے شائع کئے جائیں۔ چنانچہ اب سلسلہ کی مختلف کڑیاں یوں ہیں:

۱۔ من ویرزواں؛ خدا اور بندے کا باہمی تعلق۔

۲۔ ابلیس و آدم؛ انسان، آدم، ملائکہ، ابلیس، شیطان، جنات، وحی اور رسالت جیسے

اسی موضوعات پر مشتمل۔

۳۔ جوتے نور؛ حضرت نوح سے لے کر حضرت شعیب تک کے آسمانی انقلاب کے پیامبروں کے کوائفِ جمیلہ۔

۴۔ برقی طور؛ صاحبِ ضربِ کلیمی اور فرعون کی اویزشس۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی ہجرت آموز سرگزشت۔

۵۔ شعلہ مستور؛ حضرت عیسیٰ کے کوائفِ حیات، جدید انکشافات کی روشنی میں۔

۶۔ معراجِ انسانیت؛ صاحبِ قرآن (علیہ السلام) کی سیرتِ طیبہ، قرآنی آئینہ میں۔

۷۔ انسان نے کیا سوچا؟ انسانی فسکرنے وحی کی راہ نمائی کے بغیر زندگی کے اہم اور خدانے کیا کہا یعنی مسائل حل کرنے میں کیا کیا کادشیں کیں اور کس طرح ناکام رہی اور پھر وحی نے ان مسائل کو کس حسن و خوبی سے حل کر دیا۔

۹۔ جہانِ فردا؛ مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق قرآنی تفصیل۔

۱۰۔ کتابِ التقدير؛ دنیائے فکر کے مشکل ترین مسئلہ کا آسائیں قرآنی حل۔ اپنے موضوع پر منفرد کتاب۔

ان کے علاوہ لغات القرآن (چار جلدوں میں) شائع کی گئی اور اس کی روشنی میں مفہوم القرآن جس میں پورے قرآن کریم کا مسلسل مفہوم آگیا ہے۔ ان تصانیف کو ملک میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

یہ ہے قرآن کریم کی فکر اور تعلیم کو عام کرنے میں میری حقیر سی کوششوں کا اجمالی تعارف۔ اب میں گذشتہ کئی برس سے تبویب القرآن کے مرتب کرنے میں مصروف ہوں۔ اس انسائیکلو پیڈیا میں قرآن مجید کی تعلیم اس طرح مدقن کر دی جائے گی کہ آپ جس موضوع کے متعلق چاہیں، قرآن کریم کے تمام مقامات بیک وقت آپ کے سامنے آجائیں۔ (خدا مجھے اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے)۔

۳۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے زیر نظر کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۶ء

میں شائع ہوا جو مدت سے نایاب تھا۔ اب اس کا تیسرا ایڈیشن نظر ثانی کے بعد پیش خدمت ہے۔ اس میں حضرت نوح سے لے کر حضرت شعیب تک کے انبیائے کرام اور ان کی اقوام کا تذکرہ آگیا ہے۔ سطحی نگاہ سے دیکھتے تو ایسا محسوس ہوگا گویا یہ محض دقائق نگاری ہے لیکن بنظر تعمق غور کیجئے تو ان تذکروں میں حقائق و عبرت کی ہزار داستانیں مضم

برومندی کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر میری اس کوشش سے کوئی ایک سعید روح بھی قرآن کریم کے قریب آگئی تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری دیدہ ریزی کا صلہ مل گیا۔

۵۔ آیات میں اوپر سورت کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا۔ مثلاً ۴/۱۲ سے مراد ہے سورہ النساء کی بارہویں آیت۔ اب آئیے یہ دیکھیں کہ آسمانی انقلاب کے ان داعیان نے کس طرح خدا کا پیغام ان اقوام تک پہنچایا۔ اقوام ^{مخ} کی طرف سے اس کا ردِ عمل کیا ہوا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا اور آج اس میں ہمارے لئے کیا سا ان عبرت پوشیدہ ہے۔

والسلام

پرویز

۲۵/بی گلبرگ۔ لاہور

اگست ۱۹۶۲ء



بِسْمِ اللَّهِ مَجْرِيهَا وَمُرْسِيهَا ط (۱۱/۴۱)

طُوفَانِ نُوحٍ

سفینہٴ برگ گل بنالے گا قافلہٴ مُورِنا تو اس کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہوگا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حضرت نوح علیہ السلام

دُور اُفتی مُبین پر، تاروں کی چھاؤں میں، انسانی رشد و ہدایت کی آسمانی قندیلیں ہاتھ میں لئے نورانی پیکروں کا جو مقتدر قافلہ دکھائی دیتا ہے، قرآن کریم نے اس کے تذکرہ جمیلہ کی ابتداء حضرت نوح سے کی ہے۔

آج دنیا کے گوشے گوشے میں انسانوں کی آبادی نظر آتی ہے لیکن دنیا شروع سے اسی طرح آباد نہیں چلی آئی۔ علمائے تاریخ الامم رفتہ رفتہ اثری انکشافات سے اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ نسل انسانی کا اولیٰ سرچشمہ کسی ایک مقام پر تھا۔ جہاں سے اس کی سوتیلی بھڑکیں اور ندیوں اور دریاؤں کی شکل میں اطرافِ عالم میں بہ نکلیں۔

وَ اللَّهُ أَنْزَلَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ۚ (۱۷/۷۱)

اور اللہ نے تم کو زمین سے نباتات کی طرح پھیلایا۔

لے اس سے مراد سلسلہ ارتقا کی رو سے نسل انسانی کا ظہور پذیر ہونا بھی ہے۔

انسانی آبادی کا اولین سرچشمہ | قیاس کیا جاتا ہے کہ انسانی آبادی کا یہ اولین سرچشمہ چھیل کیسپین کے اطراف و جوانب

میں واقع تھا۔ اس قیاس کے ماتحت علم الاقوام والسنہ کے محققین نے اقوام عالم کو مختلف مماثلت و مشابہت کی بنا پر تین شاخوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) آریائی (ایرین) مثلاً ہندی اقوام، ایرانی اور فرنگستانی۔

(۲) تورانی (منگولین) مثلاً ترکستانی، چینی۔

(۳) سامی (سمینک) مثلاً عرب، آرامی، عبرانی، سریانی، کلدانی وغیرہ۔

بعض علمائے انساب، اقوام عالم کی تقسیم اختلاف رنگ کی بنا پر کرتے ہیں، یعنی سفید فام

(مثلاً اُمم سامیہ اور فرنگی) سیاہ فام یا سرخ فام (باشندگان، افریقہ، اور زرد فام (جاپانی اور چینی وغیرہ)۔

ان کے برعکس تورات کا بیان ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد جب انسانوں کی نئی زندگی شروع ہوئی تو نسل

انسانی حضرت نوح کے تین بیٹوں یافتہ: TAPHEETH، حام (HAM) اور سام (SHEM) سے

آگے بڑھی اور موجودہ اقوام عالم انہی کی یادگار ہیں۔ ان تینوں نسلوں میں سے تورات کو صرف سامی نسل

(SEMITIC RACE) سے تعلق ہے کیونکہ انبیائے کرام کا وہ سلسلہ جس کا ذکر تورات میں ہے اسی

خاندان سے متعلق تھا۔

بنی سام کا مولد و مسکن | بنی سام کی اس قوم کا مولد و مسکن کونسا علاقہ تھا، یہ مسئلہ علمائے تاریخ کے نزدیک اہم مباحث کا مرکز رہا ہے۔ اگرچہ تاریخ کی قدیم

ترین کتابوں میں اس موضوع پر بہت کچھ ملتا ہے لیکن اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اثری انکشافات

نے بحث و نظر کا رخ اس طرح بدل دیا ہے کہ اب بیسویں صدی میں یہ مسئلہ گویا متحقق ہو چکا ہے کہ

اُمم سامیہ کا اولین وطن ملک عرب تھا، جہاں سے نکل کر وہ بابل، سیریا، مصر اور فینیشیا تک پھیل گئے۔

اس تحقیقات سے یہ اہم حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آرہی ہے کہ اُمم سامیہ اور ملل قدیمہ کی تاریخ و

تمدن میں عرب کو کیا اہمیت حاصل رہی ہے، یعنی مصر و شام، فلسطین و عراق وغیرہ کی یہ تمام قومیں،

جنہیں الگ الگ سلسلہ کہا جاتا ہے، درحقیقت ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں جو سر زمین عرب

سے اُبھرا۔ اس اعتبار سے ان تمام اقوام کی زبانوں کی اصل بھی عربی زبان کی قدیم شکل قرار پائے گی۔ یہ امور

ہنوز ان انکشافات کا نتیجہ ہیں جو معرض شہود میں آچکے ہیں۔ کیا معلوم آگے چل کر ان میں کیا کیا امتنانے ہوتے چلے جائیں گے جن سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ قرآن کریم نے بالخصوص انہی اقوام اور انہی انبیائے کرام کا ذکر کیوں کیا ہے؟ ہو سکتا ہے اور قرآن اس پر شاہد ہیں کہ مزید انکشافات سے انسانی آبادی کی موجودہ تقسیم (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) سمٹ سٹا کر اس ایک نقطہ میں مرکوز ہو جائے کہ ان تمام اقوام عالم کی ابتدا ریگستان عرب ہی سے ہوئی، جہاں کہ شہر مکہ کو قرآن کریم اُمّ القریٰ (آبادیوں کی ماں) قرار دیتا ہے۔ بہر حال آج یہ قریب قریب متحقق ہو چکا ہے کہ سامی اقوام کا مولد اول عرب تھا جہاں سے وہ اطراف وحوالی میں پھیلیں۔ ان اقوام کے مورث اعلیٰ حضرت نوح کے بیٹے قوم نوح کا مولد تھے۔ اس لئے قوم نوح کا وطن بھی انہی علاقوں میں تھا۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ حضرت نوح کی کشتی جو دی پہاڑ پر جا کر ٹھہری۔ تورات نے اس کا نام "اراراط" بتایا ہے جس کے متعلق خیال ہے کہ وہ آرمینیا کے سلسلہ کوہ میں واقع ہے۔ اس سلسلہ کوہ سے دجلہ و فرات (TIGRIS AND EUPHRATES) بہتے ہوئے جنوب کی طرف آتے ہیں اور غلیج فارس کے کچھ اوپر آپس میں مل کر اس میں گر جاتے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ قوم نوح کا وطن دجلہ و فرات ہی کا درمیانی علاقہ تھا۔

اب رہا یہ کہ اس قوم کا زمانہ کونسا تھا؟ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ قوم عاد، قوم نوح کی نباشیں اور زمانہ (SUCCESSOR) تھی۔ (دیکھئے ۷۹/۷۹)

قوم عاد کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ اُمّ سامیہ اولیٰ کا سب سے وسیع قبیلہ تھا جس کی شوکت و عظمت کی داستانوں کا نشان قدیم تاریخوں سے ملتا ہے۔ اس قبیلہ نے عرب، بابل اور مصر میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔ عاد کا زمانہ تین ہزار سال ق.م سے پیشتر کا متعین کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یوں سمجھتے کہ قوم نوح کا زمانہ کوئی چار پانچ ہزار سال قبل مسیح (یا آج سے چھ سات ہزار سال پیشتر) کا تھا۔ اس لئے کہ ایک شخص (سام) کی اولاد کو قوم بننے اور پھر اتنی شوکت و عظمت حاصل کرنے کے لئے اُس زمانہ میں ہزار پندرہ سو سال کی مدت تو درکار ہوگی۔ بہر حال یہ قیاس و تخمین ہے جس کی بنیاد علمائے تاریخ

لے اس باب میں رینان کا بیان اہلیس و آدم کے آخری باب میں دیا جا چکا ہے۔

لے عرب سے مراد موجودہ حجاز ہی کا علاقہ نہیں۔

واثریات کی تحقیقات پر ہے۔ قرآن کریم تاریخ اور جغرافیہ کی کتاب نہیں۔ یہ نوع انسانی کے لئے ضابطہ ہدایت ہے اور قوموں کے عروج و زوال اور زندگی اور موت کے اصول پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس میں اقوام و ملین کا تذکرہ بھی اسی ضمن میں آیا ہے۔ بایں ہمہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تمام اقوام قدیمہ کے متعلق جن کی بابت اور تو اور خود عربوں کے پاس بھی عمومی اور سطحی تعارف کے سوا معلومات کا کچھ ذخیرہ نہ تھا (تاریخی و اثری انکشافات سے جو کچھ ابھر کر سامنے آرہا ہے وہ ان خطوط و نقوش کے خلاف نہیں جن کا اجمالی تذکرہ قرآن کریم میں ہے بلکہ ان کی تائید و تصدیق کرتا چلا جا رہا ہے۔

قرآنی حقائق اور تاریخی شواہد اور اصل یہ ہے کہ جہاں کہیں حقیقت کی نمود ہوگی، وہیں نہیں سکتا کہ وہ قرآن کے کسی اجمالی یا تفصیلی بیان سے مختلف ہو۔ اس لئے کہ قرآن یکسر حقیقت ثابتہ ہے۔ اس میں ظن و تخمین اور ریب و تشکیک کی کہیں گنجائش نہیں۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ علمی تحقیقات کی روشنی میں جہاں دیگر مذاہب کے عام "مسلمات" افسانوں میں تبدیل ہوتے چلے جا رہے ہیں، قرآنی اجمالات کی توثیق و تصدیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ دنیا کو ابھی اور علمی ترقی کرنے کے دیکھئے۔ وہ خود بخود دیکھ لے گی کہ قرآن کا یہ دعویٰ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے کہ

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَ فِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَّبِعِنَا
لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ (۴۱/۵۳)

وہ وقت دور نہیں کہ ہم انہیں خارجی کائنات اور خود ان کی نفسیاتی دنیا (یا عربوں کے اپنے اندر اور ان کے باہر کی اقوام میں) اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے تا آنکہ یہ بات نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقت ثابتہ ہے۔

حضرت نوح کی بعثت اپنی قوم کی طرف | یہ تھی وہ قوم جس کی طرف حضرت نوح مبعوث ہوئے۔ انسان کے عہد طفولیت میں سلسلہ

آمدورفت اور ذرائع رسل و رسائل ایسے محدود تھے کہ جو قبیلہ جہاں موجود تھا ایک مستغنی عن الغرودت (SELF-CONTAINED UNIT) تھا جسے باہر کی دنیا کے ساتھ بہت کم واسطہ پڑتا تھا۔ اس لئے حضرات انبیاء کرام کی تعلیم کا دائرہ بھی اس خاص قبیلہ یا قوم تک محدود ہوتا تھا، جس میں وہ تشریف لاتے تھے۔ چنانچہ حضرت نوح کے متعلق فرمایا۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ لِقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَهِ غَيْرُهُ ۖ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمِ عَظِيمٍ

(۵۹/۷ نیز ۲۵/۱۱ ؛ ۳۳/۲۳ ؛ ۱۴/۲۹ ؛ ۱۰/۷۱)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اس نے کہا، "اے میری قوم! صرف قانون خداوندی کی اطاعت کرو اس کے سوا کوئی الہ نہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ایک بڑے ہی (ہولناک) دن کا عذاب تمہیں پیش نہ آجائے۔"

حضرت نوح بھی اسی قوم کے ایک فرد تھے۔ اس لئے انہیں ان لوگوں کا بھائی کہا گیا ہے۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ (۱۶)

اور جب ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا، "کیا تم قوانین خداوندی کی نگہداشت نہ کرو گے؟"

ویسے بھی، قبائل کی تقسیم نسلی امتیاز پر ہوتی تھی اور ایک قبیلہ (یا تھوڑی سی وسعت کے بعد قوم) ایک ہی مورث اعلیٰ کی اولاد پر مشتمل ہوتا تھا اس لئے قبائل کے نام بھی یا ان کے جدِ اولیٰ کے نام پر ہوتے تھے یا اس قبیلہ کی کسی عظیم الشان شخصیت کی طرف منسوب۔ قرآن کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوح

نوح اپنی قوم میں پہلے رسول نہیں تھے اپنی قوم میں پہلے رسول نہیں تھے بلکہ آپ کی قوم

کر چکی تھی اور حضرت نوح کا زمانہ وہ تھا جس میں خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق اس قوم کے جرائم کے ظہورِ ناسخ کا وقت آچکا تھا۔ سورہ شعراء میں ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ (۲۶)

قوم نوح نے رسولوں کی تکذیب کی۔

اسی طرح سورہ فرقان میں ہے۔

وَقَوْمَ نُوحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ أَغْرَقْنَاهُمْ وَجَعَلْنَاهُمْ سِلًّا لِلنَّاسِ
آيَةً ۖ وَاعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ عَذَابًا أَلِيمًا (۲۵/۳۷)

اور جب قوم نوح نے رسولوں کی تکذیب کی تو ہم نے ان کو غرق کر دیا اور (انے والے) انسانوں کے لئے ایک مثال بنا دیا اور قانونِ مکافات کی رُو سے ظالموں کے لئے دردناک تباہی کا عذاب

تیار رہتا ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اس قوم کی طرف سے تکذیبِ رسل ان کی غرقابی سے پہلے ہو چکی تھی (یعنی یہ نہیں کہ قوم نوح کے بقیہ افراد کی آئندہ نسلوں نے تکذیبِ رسل کی تھی جس کی طرف مندرجہ صدر آیات میں اشارہ کیا گیا ہے)۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود حضرت نوح کے زمانہ میں اس قوم کے مختلف حصوں میں بیک وقت بہت سے حضرات مرسلین تشریف لائے ہوں (جیسے حضرت ابراہیم اور حضرت لوط ایک ہی وقت میں مبعوث ہوئے تھے) بہر حال یہ رسول حضرت نوح سے پیشتر مبعوث ہوئے ہوں یا آپ کے ہم عصر ہوں، قرآن سے یہ ظاہر ہے کہ غرقابی قوم نوح کے وقت ان کی قوم کی حالت یہ تھی کہ وہ اللہ کے قوانین کے خلاف زندگی بسر کرتی تھی۔

وَ قَوْمَ نُوحٍ مِّنْ قَبْلُ ۗ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِقِينَ ؕ (۵۱/۴۶)

اور اس سے قبل نوح کی قوم تھی۔ وہ لوگ قانونِ خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرتے تھے۔

اور جیسا کہ ظاہر ہے اس فسق و عصیان کا نتیجہ سرکشی اور ظلم تھا۔

وَ قَوْمَ نُوحٍ مِّنْ قَبْلُ ۗ إِنَّهُمْ كَانُوا ظَالِمًا

أَطغى ؕ (۵۳/۵۲)

اور اس سے قبل نوح کی قوم کے لوگ سرکش اور ظالم تھے۔

ان لوگوں نے خدائے واحد کی عبودیت کو چھوڑ کر کھلی ہوئی بت پرستی اختیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ جب حضرت نوح نے انہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی تو ان کی قوم کے سرغنوں نے قوم سے کہا کہ

وَ قَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِدُ بِذَا وَ أَسْوَاقِهَا ۖ ذَلِيقُنَا بِمَن لَّنَا بَدِئَةُ الْآخِرَةِ ۖ وَأَوَّلُهَا

ذَلِيقُنَا بِمَن لَّنَا بَدِئَةُ الْآخِرَةِ ۖ وَأَوَّلُهَا (۷۱/۲۳)

انہوں نے کہا کہ اپنے معبودوں کو مت چھوڑو اور وہ اور سواع اور یغوث اور نسر دیوانوں کو مت ترک کرو۔

یہ تھے وہ حالات جن کے اندر حضرت نوح تشریف لائے۔

دعوتِ حضرت نوح اور توحید | آپ نے ان لوگوں کو سب سے پہلے خدائے واحد کی عبودیت

اختیار کرنے کی دعوت دی کہ یہی پیغام حضراتِ انبیاء کرام کی دعوت کا سنگ بنیاد ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ لِقَوْمِي أُعْبِدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ

مِنَ إِلَهِ غَيْرُهُ ۖ (۷۵۹)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس قوم کی طرف (تبلیغِ حق کے لئے) بھیجا تھا۔ اس نے کہا اے میری قوم! اللہ ہی کی حکومت اختیار کرو۔ اس کے سوائے کوئی اللہ نہیں۔ سورہ ہود میں ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِذِ اتَّخَذُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَزَّلَكَ إِلَّا نَسْرًا مِثْلَنَا وَ مَا نَزَّلَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُوا بِآدَمِي الرَّأْيِ ۚ وَمَا نَزَّلْنَا لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَنْظُرُكُمْ كَذِبِينَ ۝ (۲۵-۲۷/۱۱) نیز (۲۳/۲۷)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اس نے کہا (لوگو!) میں تمہیں (انکار و بد عملی کے نتائج سے) کھلے کھلے الفاظ میں آگاہ کرتا ہوں۔ اللہ کے سوا اور کسی کی اطاعت و حکومت اختیار نہ کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایک دردناک دن نہ آجائے۔ اس پر قوم کے سرداروں نے جن کے ہاں مال و دولت کی افراط تھی اور اس وجہ سے انہوں نے قوانینِ خداوندی سے انکار کی راہ اختیار کی تھی کہا، ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں ان میں بھی ان کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا جو ہم میں پشت درجے کے ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہولتے ہیں ہم قوم لوگوں میں اپنے مقابلے میں کوئی برتری نہیں پاتے۔ ہمیں یقین ہے کہ تم اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہو۔

خدا کی حکومت | یہ دعوتِ نوحی کا ادلیں اور اساسی اصول تھا۔ یعنی خدا کے سوا اور کسی کی حکومت اختیار نہ کریں۔ حکومتِ الہیہ کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ اس کے سرکاری اطاعت کی جائے۔ اس لئے حضرت نوح نے فرمایا کہ

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَأَطِيعُوا أَمْرًا ۚ (۱۰۸-۱۰۹/۱۰۴) (۳/۱۰۴)

میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا (حکومتِ الہیہ کا) امانت دار ہوں۔ پس اللہ سے ڈرو اور میری

(بہ حیثیت مرکز اول) اطاعت کرو۔

انقلابی دعوت | دعوتِ نوحی کی تعلیم کے ان عناصر پر بھی غور فرمائیے۔ یہ تعلیم کیا تھی؟ اس مسلک کے خلاف ایک کھلا ہوا چیلنج جو اس قوم کے آبار و اجداد (اسلاف) سے متوارث

چلا آتا تھا اور ان کے سرداران یعنی اربابِ ثروت و حکومت کے تغلب و اقتدار کے خلاف بے غل و غش بغاوت، تاریخِ انسانیت کے ادراک کو اُلٹتے جاہیے، حق و باطل کی کشمکش میں یہی دو مقام ہیں جو ہمیشہ قبولیتِ حق و صداقت کی راہ میں سنگِ گراں بن کر محال ہوتے ہیں۔ معتقداتِ خواہ کس قدر غلط کیوں نہ ہوں، جب آبار و اجداد سے منتقل ہو کر آئیں تو انسان کے نزدیک ایسے گراں بہا ممتاع بن جاتے ہیں جنہیں وہ اپنے قلب کی انتہائی گہرائیوں میں چھپائے رکھتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ان کے چھپنے

سے اس کی ساری کائنات اُلٹ رہی ہے لیکن کسی عقیدہ کے صحیح ہونے کا یہ معیار کس قدر غلط ہے کہ وہ اسلاف سے درائشا منتقل ہو کر آیا ہے! اگر تپتی

کے جراثیم، جو انسان کو اپنے آبار سے درائشا ملے ہوں، یقیناً اس قابل ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے انہیں تلف کر دیا جائے، تو معتقدات کے جراثیم ایسے مقدس کیوں تصور کر لئے جائیں کہ ان کی پرورش خونِ قلب و جگر سے کی جائے، حق و باطل کے پرکھنے کا معیار وہ کسوٹی ہے جو اللہ کی طرف سے وحیِ مبین کی شکل میں انسانی رشد و ہدایت کے لئے ملتی ہے۔ اپنے ذاتی خیالات و تصورات کو بھی اسی کی روشنی میں پرکھتے اور ان معتقدات کو بھی چونکہ بعد نسل متوارث چلے آتے ہوں، لیکن انسان کی اس شوریدہ کنجی کو کیا کچھنے کہ وہ ہر

برائی (قدیم) چیز کو تقدس کا لبادہ اڑھا دیتا اور اسے تنقید کی حد سے بالاتر سمجھنے لگتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جب سب سے پہلی دعوتِ حق و صداقت کا ذکر کیا تو اس اہم حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ صداقت کے قبول کرنے میں سب سے پہلے کونسا جذبہ مانع ہوتا ہے، یعنی اسلاف پرستی کا جذبہ، کورانہ تقلید کا مسلک۔ آپ دیکھینگے کہ حضرت نوح سے لے کر حضور خاتم النبیین تک ہر داعیِ حق و صداقت کی آواز کے جواب میں یہی کچھ کہا جاتا رہا کہ چونکہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہمارے آبار و اجداد کی روش کے خلاف ہے، اس لئے ہم اسے قبول نہیں

ہر زمانہ میں یہی لغزش کی گھائی رہی ہے | کر سکتے (۱۴/۱۰)۔ اور اسے چودہ سو سال

پیشتر تک ہی محدود کیوں رکھنے! کیا آج بھی جب یہ کہا جاتا ہے کہ آؤ! اپنے معتقدات و تصورات کو قرآنِ کریم کی روشنی میں پرکھ کر دیکھیں تو اس

کے جواب میں کیا وہی پرانی آواز نہیں دہرائی جاتی کہ ہم اسی چیز کو حق سمجھتے ہیں جو سلاف سے منتقل ہو کر چلی آرہی ہے اور اس کے خلاف جانے کے لئے ہرگز تیار نہیں؛ زمانے کے تغیرات سے صرف پیکر بدل کر رہتے ہیں، روح تو وہی چلی آتی ہے۔ حق و صداقت کی روح بھی ایک ہی ہے اور اس کے مقابل میں باطل کی طاغوتی روح بھی ایک ہی۔

دوسری رکاوٹ | اعترافِ حق و صداقت کی راہ میں دوسرا سنگِ گراں نشہ حکومت و سطوت ہے۔ یوں تو انسان ہر شکار میں لذت محسوس کرتا ہے لیکن اس کی لذت

کی انتہا اس مقام پر پہنچ کر ہوتی ہے جہاں اس کا شکار خود دوسرا انسان ہو۔ تاریخِ عالم پر نگاہ ڈالنے یہ صیدِ صیاد کی ایک مسلسل داستان نظر آئے گی جس میں ہر زمانہ اور ہر مقام میں کمزور اور ناتواں انسان زبردست اور قوی انسانوں کے پیچھے تغلب و تسلط میں تڑپتے، پھڑکتے، سسکتے، بلبلا تے، سکرابتِ موت کی ہچکیاں لیتے دکھائی دیں گے۔ حضراتِ انبیائے کرام کی لعنت کی سب سے اہم غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ ان کمزور اور ناتواں انسانوں کو جابر و ظالم انسانوں کے پیچھے استبداد سے چھڑا کر آزادی کی فضا بنائے بیٹھیں جہاں وہ پوری سرفرازی و سربلندی سے "انسانوں" کی طرح چل پھر سکیں اور انسان اور خدا کے درمیان کوئی دوسری

صحیح آزادی کی دعوت | طاقتِ مائل نہ ہو اور اس طرح وہ اپنے آپ کو ایک اللہ کے قانون کے سوائے کسی اور کا محکوم نہ پائیں۔ ظاہر ہے کہ اربابِ حکومت و تسلط

اپنے شکار کو آسانی سے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ وہ پوری کوشش کریں گے کہ اس قسم کی انقلاباتِ آواز کا گلا اپنے آہنی ہاتھوں سے گھونٹ دیں۔ وہ اپنی اہلیسا نہ سیاست کا ہر حربہ استعمال کریں گے کہ ان کے وامِ تغلب کے حلقے کمزور نہ ہونے پائیں۔ داعیانِ حق و صداقت کی راہ میں یہ دوسرا مرحلہ ہے جس سے تصادم و نزاع ضروری ہے۔ قرآنِ کریم نے جس دعوت کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے اس کے ساتھ ہی اس تصادم کا ذکر بھی کیا ہے۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ
مِثْلُكُمْ يُرِيدُ أَنْ يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۗ وَ لَوْ شَاءَ اللَّهُ لَوَنَزَلَ
مَلَائِكَةٌ سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ۝ (۲۳/۲۴)
اس کی قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی وہ یہ سُن کر (لوگوں سے) کہنے لگے کہ

یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے؟ مگر چاہتا ہے، تم پر اپنی بڑائی جتلے۔ اگر اللہ کو کوئی ایسی ہی بات منظور ہوتی تو کیا وہ فرشتے نہ اتار دیتا؟ (وہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی کو اپنا پیا مبر کیوں بنانے لگا؟) ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے تو کوئی ایسی بات کبھی سنی نہیں۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ تصادم اس سلسلہ آسمانی کے ساتھ ہر مقام پر رہے گا، کہ جیسا کہ "ابلیس و آدم" میں بتایا جا چکا ہے، ابلیس نے قیامت تک کے لئے ہمت لے رکھی ہے، اس لئے خدائی نظام کے ساتھ طاغوتی نظام ہمیشہ برسرِ پیکار رہے گا۔ بقول اقبالؒ:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چرخِ مصطفویٰ سے شرارِ بولہبی

آگے بڑھنے سے پیشتر، ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ **سرمایہ دار گروہ کی طرف سے مخالفت** ہے۔ قرآن نے ان مخالفین کے لئے **الْمَدَّوۃُ** کا لفظ

استعمال کیا ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں وہ لوگ جن کے گھروں میں برتن بھرے ہوئے ہوں، یعنی وہ جنہیں سامانِ زیست کی فراوانیاں حاصل ہوں، جن کے پاس کثرت سے مال و دولت ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی دولت کے زور سے اقتدار کی کرسیاں حاصل کر لیتے ہیں اور پھر غریب انسانوں سے اپنا حکم منواتے ہیں۔ اسی کا نام (دورِ ماضیہ کی اصطلاح میں) نظامِ سرمایہ داری ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ آسمانی انقلاب جس کے داعی حضرات انبیائے کرامؑ تھے، اسی غیر خداوندی نظام کو مٹانے کے لئے آتا تھا جس میں رزق کے سرچشمے انسانوں کے قبضے میں رہتے ہیں۔ وہ ان ذرائع رزق کو انسانوں کے ہاتھوں سے چھین کر، قانونِ خداوندی کے سپرد کر دیتا ہے، تاکہ اس سے تمام نوعِ انسانی کی پرورش ہو سکے۔ اس انقلاب کی مخالفت سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے جو رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لئے ہوتے ہیں۔ یہی وہ تصادم ہے جس کا ذکر سب سے پہلی دعوتِ انقلاب کے سلسلہ میں سامنے آ رہا ہے (۵۹-۶۳/۴)۔ اس مخالفت کی وجہ بھی سن لیجئے۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا خَرَبَكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا

..... أَنْزَلْنَاكُمْ مِثْلَهُمْ لَهَا كَرِهُونَ ۝ (۲۶-۲۸/۱۱)

اس پر قوم کے سرداروں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی اور جنہوں نے کفر کی راہ

اختیار کی تھی، کہا کہ ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں وہ ہم میں نچلے درجے کے ہیں اور بے سوچے بچھے تمہارے پیچھے ہولتے ہیں، ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔

نوح نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل روشن لئے ہوں اور اس نے اپنے ہاں سے مجھے وحی کی رحمت بھی عطا کر دی ہو، مگر وہ تمہیں دکھائی نہ دے، تو میں اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں جو کر رہا ہوں؟ یہ تو ہم کر نہیں سکتے کہ اسے زبردستی تمہارے گلے منڈھ دیں۔

سورۂ شعرا میں ہے۔

قَالُوا أَأَلْؤُمُنُ لَكُمْ وَاتَّبَعَتْ الْأَوَّلُ ذُرِّيَّتَهُ (۲۴/۱۱۱) ۵

(قوم کے سرداروں نے کہا) کیا ہم تمہاری باتوں پر (اے نوح) یقین کر لیں۔ حالانکہ (ہم دیکھ رہے ہیں) کچھ صرف کینے (نچلے درجے کے لوگ) تمہارے پیچھے ہولتے ہیں؟

ان آیات پر غور فرمائیے۔ مخالفت اس طبقہ کی طرف سے ہوئی جو صاحبِ دولت و ثروت تھا اور وجوہات مخالفت میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کیا ہم اس جماعت کے ساتھ ہو جائیں جو ذلیل لوگوں پر مشتمل ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ حق و صداقت کی دعوت پر لیتیک، سب سے پہلے غریب طبقہ کی طرف **طبقاتی تقسیم** سے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ اربابِ ثروت و حکومت کے جور و استبداد سے تنگ آچکے ہوتے ہیں اور ہر اس آواز کا بطیبِ خاطر استقبال کرتے ہیں جو انہیں آزادی اور سچی آزادی کی طرف دعوت دے اور زندگی کی خوشگوار یوں سے ہمکنار کر دے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زمانہ حضرت نوح میں طبقات کی تقسیم وجود میں آچکی تھی، یعنی وہ قبائلی زندگی کا ایسا ابتدائی زمانہ نہیں تھا جس میں انسانی عزت و تکریم، دولت و ثروت کے معیار سے نہ پائی جاتے۔

قَالَ وَ مَا عَلَّمَنِ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۵ (۲۴/۱۱۲)

(حضرت نوح نے) کہا کہ ان کے (پیشہ اور) کام سے مجھ کو کیا بچا۔

اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اس وقت انسانوں کی تقسیم پیشوں کے اعتبار سے وجود میں آچکی تھی جو

ذات پات کی تقسیم کا بنیادی پتھر ہے اور جو انسانی مساوات کی جڑ پر ایسی کاری ضرب تھی کہ یہ لعنت انسانوں سے آج تک دور نہیں ہو سکی۔ حضرات انبیائے کرام کا منصب، مساوات انسانی کو قائم کر کے عزت و عظمت کا معیار تقویٰ قرار دینا تھا، یعنی یہ معیار کہ جو سب سے زیادہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے اور اس طرح نوع انسانی کی پرورش و منفعت کے لئے سب سے زیادہ مفید ثابت ہو، وہی معاشرہ میں سب سے زیادہ عزت و توقیر کا مستحق ہے۔ چنانچہ حضرت نوح کا جواب اس پر شاہد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہ لوگ کیا کیا کام کرتے ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان وجہ جامعیت ایمان ہے اور میں محض تمہاری خاطر مومنین کی جماعت کو دھتکار نہیں سکتا، یعنی اس جماعت کو جو اس کا اقرار اور تہیہ کر چکی ہے کہ وہ خود بھی قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گی اور انہی قوانین کو معاشرہ میں رائج کرے گی۔

قَالَ مَا عَلِمْتُ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۚ اِنْ حَسَابُكُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّي
لَوْ تَشْعُرُونَ ۝ وَمَا اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اِنْ اِلَّا
مَنْزِلٌ مُّبِيْنٌ ۝ (۱۱۳-۱۱۵/۲۶)

نوح نے کہا ان کے پیشہ اور کام سے مجھ کو کیا بحث؟ ان سے حساب کتاب لینا، خدا کا کام ہے، کیا خوب ہو، جو تم اس بات کو سمجھو اور میں تو یہ کہنے سے رہا کہ تمہاری خاطر اس جماعت کو دھتکار دوں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ تمہیں غلط زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرنا ہوں۔ (نیز ۱۱۶)

۱۱۰/۶۲؛ ۱۰۹/۲۶۔

اگر میں انہیں اس لئے دھتکار دوں کہ ان کے پاس دولت نہیں تو میں اپنے اللہ کے یہاں مجرم بٹھیرا جاؤں گا۔ کہتے! اس وقت مجھے اللہ کی گرفت سے کون بچا سکتا ہے؟ (۱۱/۳۰)۔
یہ لوگ جو بظاہر تمہیں بے کس و بے بس مفلس و نادار نظر آتے ہیں تمہیں کیا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کن نعمتوں اور عظمتوں سے نوازنے والا ہے؟ (۱۱/۳۱)۔

اس کے جواب میں قوم نے کیا کیا؟ وہی جو سرکش اور تکبر کیا کرتے ہیں!
ارباب استبداد کا جواب قَالُوا يَا نُوْحُ قَدْ جَاؤْنَا لَنَّا فَاكْثُرَتْ جِدَا لَنَا

فَاْتَيْنَا بِمَا تَعْبُدُ نَا اِنْ كُنْتُمْ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۱۱/۳۲)۔

اس پر ان لوگوں نے کہا، اے نوح! تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑ چکا۔ (اب ان باتوں

سے کچھ بننے والا نہیں) اگر تو سچا ہے تو جس بات کا وعدہ کیا ہے، وہ ہمیں لا دکھا۔
یعنی تو جو ہمیں بار بار کہتا ہے کہ ہماری غلط روشیں زندگی کا تہیجہ تباہی و بربادی ہوگا، دراصل ایک ہم نہایت
نوشمالی اور فارخ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، تو تو اس تباہی کو ہمارے سامنے لے آ۔ بات صاف
ہو جائے گی!

اس کے جواب میں حضرت نوح نے کہا۔

قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيكُمْ بِهِ اللَّهُ إِن شَاءَ وَإِن كُنْتُمْ بِسُجُوتِهِمْ
..... وَ أَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ ۝ (۱۱/۳۵-۳۳)

نوح نے کہا، تباہی اور بربادی خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق آیا کرتی ہے تم اسے روک
نہیں سکتے۔ اگر اس قانون کے مطابق تم اس مقام تک پہنچ چکے ہو جہاں تباہی آکر رہتی ہے تو
پھر میری نصیحت تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ تمہارے فیصلے تمہارے نشوونما دینے والے کے
قانون کے مطابق ہو کر رہیں گے۔ تمہیں کشاں کشاں اس کی طرف جانا ہے۔

(حکم الہی ہوا، اے نوح!) کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس آدمی نے (یعنی نوح نے) اپنے جی سے
یہ بات گھڑ لی ہے؟ تو کہہ دے، اگر میں نے یہ بات گھڑ لی ہے تو میرا جرم مجھ پر اور تم جو جرم کر رہے ہو
(اس کی پاداش تمہارے لئے) میں اس سے بری اللہ تر ہوں۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، حضرت نوح خود اسی قوم میں سے تھے۔ زندگی انہی میں گزاری تھی۔ قوم نے اس سے
بیشتر ان سے اس قسم کی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔ جب انہوں نے اپنی دعوت کی تبلیغ شروع کی تو قوم نے
سہما کہ یہ (معاذ اللہ) پاگل ہو گیا ہے جو اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گیا ہے جو نہ ہماری دید میں ہیں نہ
شنید میں۔ انہوں نے کہا۔

إِن هُوَ إِلَّا رَجُلٌ ۖ بِهِ جِنَّةٌ ۖ فَتَرَبَّصُوا بِهِ حَتَّىٰ حِلٌّ ۖ أَوْ يَخْرُجْ ۚ (۵۲/۹:۱۳۲/۱۵)
(اس کے سوا کچھ نہیں کہ) یہ پاگل ہو گیا ہے۔ بس (اس کی باتوں پر کلن نہ دھرو) کچھ دنوں تک
انتظار کر کے دیکھ لو اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

لیکن جب دیکھا کہ اسے جنون نہیں اپنے مشن سے عشق ہے اور وہ پاگلوں
کی طرف ترہیب

مقصود کی طرف منجبر ہوتی ہے تو وہ ان اوچھے ہتھیاروں پر اتر آتے جو قوت کے نشہ کا آخری حربہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔

قَالُوا لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ ۝ (۲۴/۱۱۴)

اے نوح! اگر تم (اپنے مشن سے) باز نہ آؤ گے تو ہمیں سنگسار کر دیا جائے گا۔
یہ دھمکی انفرادی طور نہیں تھی بلکہ قبیلہ کے سب سے بڑے سردار کی قیادت میں ایک بڑی سازش کے ماتحت اس کا اعلان ہوا تھا۔

قَالَ نُوحٌ رَبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاسْتَبَعُوا مِنِّي لَمْ يَزِدْكَ عَالَمًا

وَذَلِكَ إِلَّا خَسَارًا ۝ وَ مَكَرُوا مَكْرًا كُبَّارًا ۝ (۲۱-۲۲/۴۱)

نوح نے کہا کہ اے میرے پروردگار! ان لوگوں نے میرا کہنا نہیں مانا اور ایسے شخص کی پیروی کی جس کے مال اور اولاد نے اسے نقصان ہی زیادہ پہنچایا اور انہوں نے بڑی بھاری سازش کی تدبیر کر رکھی ہے۔

لیکن کیا ان دھمکیوں سے خائف ہو کر حضرت نوح نے اپنی دعوت
دھمکیوں کے جواب میں..... چھوڑ دی؟ ایسا کس طرح ہو سکتا تھا! خدا کے بندوں کو کسی طرح کی تحریف و ترمیم ان کے مقصد سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ان دھمکیوں کے جواب میں حضرت نوح نے فرمایا۔

إِنْ كَانَ كِبْرُ عَلَيْكُمْ تَمَقَّارًا وَ تَذَكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ

تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَ شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرَكُمْ

عَلَيْكُمْ غَمَةً ثُمَّ اقضُوا إِلَيَّ وَ لَا تُنظِرُون ۝ (۱۰/۶۱)

اگر تم پر بات شاق گزرتی ہے کہ میں تم میں (دعوت و ہدایت کے لئے) کھڑا ہوں اور قوانین خداوندی کے مطابق تمہیں پسند و نصیحت کرتا ہوں، تو میرا بھروسہ صرف اللہ پر ہے۔ تم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو، اسے ٹھان لو اور اپنے شریکوں کو بھی ساتھ لے لو۔ پھر جو کچھ تمہارا منصوبہ ہو اسے اچھی طرح سمجھ لو جو کہ کوئی پہلو نظر سے رہ نہ جائے۔ پھر جو کچھ میرے خلاف کرنا ہے کر گزرو اور مجھے ذرا بھی ہمت نہ دو۔ (اور دیکھو! خوکار کیا نتیجہ نکلتا ہے؟)

مخالفت کی انتہا چنانچہ ان کی مخالفت روز بروز بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ حضرت نوح ان کی طرف سے

بالکل مایوس ہو گئے اور انہوں نے اپنے رب کو پکارا۔

قَالَ رَبِّ النَّصْرُ لِي بِمَا كَذَّبْتُمْ عَلَيَّ ۝ (۲۳/۳۹) ذ (۵۴)

(اور کہا) خدایا انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے۔ پس تو میری مدد کر۔

حضرت نوح کی پکار انکار و مخالفت سے اس قدر مایوس ہو چکے تھے کہ انہوں نے اپنے اللہ سے

انتہائی کہ

وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيّٰرًا ۝ (۴۱/۲۶)

اے پروردگار! تو نافرمان لوگوں (کا نام و نشان) صفحہ زمین پر باقی نہ چھوڑو۔

اس لئے کہ

اِنَّكَ اِنْ تَذَرَهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ ۭ لَا يَلِدُوْنَ ذٰرًا اِلَّا فٰجِرًا كَفّٰرًا

(۴۱/۲۷)

اگر تو نے ان نافرمان و سرکش لوگوں کو (سلامت) چھوڑ دیا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی

(نسل سے پیدا ہونے والی اولاد بھی) سوردنی اور تربیتی اثرات کی وجہ سے) بد کردار و سرکش ہوگی۔

کشتی کی تیاری ابتدا میں اس دعوت کا جمالی پہلو نمایاں تھا۔ آخر میں اللہ کے قانونِ مکافات

کے ماتحت اس کا جلالی پہلو سامنے آ گیا۔ ادھر سرکشی و تمرد انتہا کو پہنچ گئی۔

اُدھر قانونِ مکافات عمل کے مطابق مہلت کا زمانہ گزر کر نتیجہ مرتب ہونے کا وقت آ گیا۔ حضرت نوح سے

ارشاد ہوا کہ ایک کشتی تیار کرو۔

وَ اَوْحٰى اِلٰى نُوْحٍ اَنْهٗ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ

فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۗ وَ اصْنَعِ الْفُلَكَ بِاَعْيُنِنَا ۭ وَ وَهَبْنَا

وَ لَا تُخٰطِبُنِيْ فِى الدِّيْنِ ظٰلِمُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝ (۲۶-۳۶) ذ (۳۳)

اور نوح پر وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا اب کوئی ایمان

لانے والا نہیں۔ پس جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس پر (بیکار کو) غم نہ کھا۔

اور (کہا گیا کہ) ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم کے مطابق ایک کشتی بنانا شروع کر دے اور ان ظالموں کے بارے میں اب ہم سے کچھ عرض معروض نہ کر۔ یقیناً یہ لوگ غرق ہو جانے والے ہیں۔

قوم کا تسخیر | یہ کشتی بنا رہے تھے اور قوم کے سرکش سرداران کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ حالانکہ ان کا یہ مضحکہ خود ان کی اپنی حالت پر تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ کی گرفت انہیں کس سختی سے پکڑنے والی ہے۔

وَيَضَعُ الْمَلَائِكَةُ ثِقَلًا مَرَّةً عَلَيْهَا مَلَأْنَا مِنْ قَوْمِهِ سِجْنًا مِمَّنْ
..... وَيَعْلَىٰ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ۝ (۳۸-۳۹/۱۱)

اور جب کبھی ایسا ہوتا کہ ان کی قوم کا کوئی (سردار) گروہ ان پر سے گذرتا، تو ان کو کشتی بنانے میں مشغول دیکھ کر تسخیر کرنے لگتا۔ نوح کی طرف سے انہیں جواب ملتا کہ اگر تم ہماری ہنسی اڑاتے ہو تو (اڑالو) اسی طرح ہم بھی (تمہاری بیوقوفیوں پر ایک دن) ہنسیں گے۔ وہ وقت دور نہیں جب تمہیں معلوم ہو جائے گا کون ہے جس پر ایسا عذاب آتا ہے کہ اسے رسوا کرے، پھر دائمی عذاب بھی اس پر نازل ہو۔

ظہور نتائج کا وقت | کشتی تیار ہو گئی اور عذاب کا وقت معین آپہنچا۔ حکم ہوا۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا فَأَرَانَا نَارَ الْآخِرَةِ..... وَفَا
أَمِنَ مَعَهُ إِذْ قُلَيْلٌ ۝ (۴۰-۴۱/۱۱)

(یہ سب کچھ ہوتا رہا) یہاں تک کہ جب وہ وقت آ گیا کہ ہماری ٹھہرائی ہوئی بات ظہور میں آئے اور زمین کے چشموں نے جوش مارا تو ہم نے (نوح کو) حکم دیا کہ ہر قسم کے (جانوروں کے) دودھ جوڑ کشتی میں لے لو اور اپنے اہل کو بھی ساتھ لو، مگر اہل میں وہ لوگ داخل نہیں جن کی روش ثابت کہ چکی ہے کہ وہ اہل ایمان میں سے نہیں۔ نیز ان لوگوں کو بھی لے لو جو ایمان لاپچکے ہیں۔ اور نوح کیساتھ ایمان نہیں لائے تھے، مگر بہت تھوڑے آدمی۔

اور اس کے بعد۔

فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّنْهَبٍ ۝..... جَزَاءً لِّمَن كَانَ
كُفِرَ ۝ (۱۱-۱۲/۵۴)

پس ہم نے آسمان (بادلوں) کے دروازے برسنے والے پانی سے کھول دیئے اور زمین سے چشمے کھول دیئے، تو اس طرح زمین و آسمان کا پانی اس معاملہ کے لئے جس کا قانون مکافات کی رُو سے اندازہ معین ہو چکا تھا ایک جگہ جمع ہو گیا اور ہم نے اُسے (نوح کو) میخوں اور تختوں سے بنی ہوئی کشتی پر سوار کرا دیا۔ وہ ہماری نگرانی میں چل رہی تھی اور غرق ہونے کی سزا ان کے لئے تھی جنہوں نے اس سے انکار کیا تھا۔

زمین سے پانی، آسمان سے پانی، پوری کی پوری وادی لبریز۔ اس کے بعد۔
 وَ قِيلَ يَا رِضْ اٰبِلْعٰی مَآءِ لِكَ وَ يَسْمَآءُ اٰقِلْعٰی وَ غِيْضُ الْمَآءِ وَ قُضِيَ
 الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلٰی الْجُوْدِي وَ قِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ ۝ (۱۱/۴۳)
 اور (پھر اللہ کا) حکم ہوا کہ اے زمین! اپنا پانی پی لے! اور اے آسمان! تم جا! اور پانی کا چڑھاؤ اتر گیا اور عداوت انجام پا گیا اور کشتی، جو دی، پر ٹھہر گئی اور کہا گیا کہ ہلاکت اس گروہ کے لئے ہو گئی جس نے سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔

اس طوفانِ بلا کے سامنے سرکش و مغرور قوم اور اس کے وہ تمام ساز و سامان جن کے بل بوتے پر وہ ظلم و استبداد کی زندگی بسر کر رہے تھے، خس و خاشاک کی طرح بہ گئے اور اس تباہی سے وہی محفوظ رہے جو کل تک بے یار و مددگار اور بے ساز و سامان سمجھے جاتے تھے اور جن کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا۔ طوفان تھا۔ کشتی جو دی پر جہاڑ کی اور ارشاد ہوا۔

قِيلَ يٰ نُوْحُ اٰهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكَاتٍ عَلَيْنَا وَ عَلٰی اٰمْرِ قَوْمِنَا
 مَعْلَقٌ ۙ وَ اُمَّةٌ سَنُنْتَعِبُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ
 اَلِيْمٌ ۝ (۱۱/۴۸)

حکم ہوا۔ اے نوح! اب کشتی سے اتر۔ ہماری جانب سے تجھ پر سلامتی اور برکتیں ہوں، نیز ان جماعتوں پر جو تیرے ساتھ ہیں۔ اور دوسری کشتی ہی جماعتیں ہیں (بعد کو آنے والی) جنہیں ہم (زندگی کی خوشگوار یوں سے) بہرہ مند کریں گے۔ لیکن وہ صحیح راہ اختیار نہ کریں گے۔ اس لئے انہیں (پاداشِ عمل میں) ہماری طرف سے عذابِ دردناک پہنچے گا۔

یوں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح اور ان کے "اہل" کو عذابِ الیم سے محفوظ رکھا اور مخالفین کو نیست و نابود

کردیا۔ (۴۶ - ۲۱/۷۷) ذ (۴۲ - ۳۷/۷۵)۔

اہل کا مفہوم | ان آیات میں "اہل" کے لفظ پر غور کرو۔ یہ اپنے اندر ایک عظیم الشان حقیقت پوشدہ رکھتا ہے جو تاریخ انسانیت میں مہمات اصول میں سے ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ حضرت نوح اور ان کے اہل کو اس عذاب سے محفوظ رکھا گیا۔ عام اصطلاح میں "اہل" سے مراد کنبہ اور خاندان کے افراد ہوتے ہیں۔ لیکن آسمانی لغت میں اس سے مفہوم کچھ اور ہے سورۃ المؤمنون میں اہل میں ایک استثناء (EXCEPTION) ہے۔

فَاذْحَبْنَا إِلَيْهِ أَيْنَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا..... إِنَّهُمْ مُعْرِضُونَ ۝ (۲۴/۲۳)

پس ہم نے نوح کی طرف وحی بھیجی کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنا۔ جب ایسا ہو کہ ہمارے حکم کا وقت آجائے اور زمین کے چشمے پھوٹ نکلیں تو کشتی میں (ہر جاؤر کے) دو دو جوڑے ساتھ لے لے اور اپنے اہل کو بھی۔ مگر اہل کے ایسے لوگوں کو نہیں جن کے لئے پہلے فیصلہ ہو چکا۔ اور دیکھ جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے بارے میں کچھ ہم سے عرض نہ کیجو۔ وہ ڈوب کر رہیں گے!

اس کی تفسیر سورۃ نوح میں ان الفاظ سے کر دی گئی ہے۔

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَوَالِدَيَّ وَوَالِدَاتِي وَرَبِّمَن دَخَلَ بَيْتِي مُؤْمِنًا وَ لِلْمُؤْمِنِينَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ ۚ وَ لَا تَجْرِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَارًا ۝ (۲۸/۴۱)

(نوح نے کہا) اے میرے رب میری اور میرے ماں باپ کی حفاظت فرما اور اس کی جو ایمان لانا ہو میرے گھر میں داخل ہو اور (ایسے اہل خانہ کے علاوہ عام) مومن مردوں اور مومن عورتوں کی اور ظالموں کو جو ایمان نہیں لاتے، تباہی اور بربادی میں بڑھاتے جائیو۔

اس سے واضح ہو گیا کہ نظام خداوندی میں اہل سے مراد کیا اپنوں اور غیروں کا قرآنی معیار ہے۔ یہاں اپنوں اور غیروں کی تقسیم، نسب اور قرابتداری

کی رُو سے نہیں ہوتی بلکہ کفر اور ایمان کی رُو سے ہوتی ہے۔ دعوتِ نوحی میں یہ مقام ایسا بلند ہے جسے قرآن کریم نے کھلے کھلے الفاظ میں بیان فرمایا ہے تاکہ یہ اصولی اور اساسی معیار تقسیم واضح طور پر سامنے آجائے کیونکہ انسانی تمدن اور عمرانیت کی صحیح اور غلط تعمیر اسی معیار کے صحت اور سقم پر مبنی ہے ذرا غور کیجئے،

پاروں طرف طوفانِ بلا انگیز موجزن ہے۔

وَهُی تَجْرِیْ رِبْهْمُ فِیْ مَوْجِ کَالْحَبَالِ قَف (۱۱/۴۲)

اور (دیکھو) ایسی موجوں میں کہ پہاڑوں کی طرح اٹھتی ہیں، کشتی انہیں لئے جا رہی ہے بیٹا سامنے آجاتا ہے۔ محبتِ پدری جوش میں آتی ہے۔ آواز دیتے ہیں۔

وَقَادَى نُوحٌ وَابْنَهُ دَكَانَ فِیْ مَعْرِیْ یَبْنِیْ الْكَبِّ مَعَنَا وَ لَا تَكُنْ مَعَ الْكٰفِرِیْنَ ۝ (۱۱/۴۲)

اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ وہ کنارہ پر (کھڑا) تھا۔ اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا کافروں کے ساتھ نہ رہ۔

بیٹا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے۔

قَالَ سَاوِیْ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصُمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ ط قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ
مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِذْ مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَیْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ
مِنَ الْمُعْرِقِیْنَ ۝ (۱۱/۴۳)

اُس نے کہا، "میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا۔ وہ مجھے پانی کی زد سے بچالے گا۔" نوح نے کہا (تو کس خیالِ غلم میں پڑا ہے) آج اللہ کی ٹھہرائی ہوئی بات سے بچانے والا کوئی نہیں، مگر ہاں وہی جسے اس کی رحمت اپنے آغوش میں لے لے اور (دیکھو) دونوں کے درمیان ایک موجِ حامل ہو گئی۔ پس وہ انہی میں ہوا جو ڈوبنے والے تھے۔

حضرت نوح بیٹے کی ضد اور حماقت کے انجام سے واقف ہیں۔ وہ اس کے انجام (تباہی و غرقابی) کے تصور سے گھبرا اٹھتے ہیں۔ عرض کرتے ہیں۔

وَقَادَى نُوحٌ وَابْنَهُ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَ اِنَّ
وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ۝ (۱۱/۴۵)

اور نوح نے اپنے پروردگار کو پکارا اور کہا، خدایا میرا بیٹا تو میرے اہل میں ہے اور یقیناً تیرا وعدہ

لے سورۃ نوح کی آیت (۴۱/۲۸) جو پہلے درج کی جا چکی ہے اور جس میں حضرت نوح نے صرف انہی "اہلِ خانہ" کی مغفرت کی دعا کی ہے جو صاحبِ ایمان ہوں، زیرِ نظر واقعہ کے بعد کی معلوم ہوتی ہے۔

سچا ہے تجھ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں۔

اس درخواست کے جواب پر غور فرمائیے کہ یہی جواب تاریخ انسانیت میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کرنے والا تھا۔ ارشاد ہوا۔

قَالَ يٰٓاٰمَمُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۗ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا
تَسْئَلُنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۗ اِنِّىۡ اَعْطٰكَ اَنْ تَكُوْنَتَ
مِنَ الْجٰہِلِيْنَ ۝ (۱۱/۴۶)

(خدا نے) کہا: اے نوح! وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ وہ تو (سرتاپا) عمل بد ہے (یعنی جب وہ تیری راہ پر نہ چلا اور بد عملوں کا ساتھی ہوا، تو فی الحقیقت تیرے حلقہ قرابت سے باہر ہو گیا۔ اب اسے اپنا نہ سمجھ) پس جس حقیقت کا تجھے علم نہیں اس بارے میں سوال نہ کریں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ نادانوں میں سے نہ ہو جانا۔

نسلی امتیاز اور قوموں کی تقسیم | واقعہ تو اتنا سادہ ہے لیکن اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ آپ

اندکس قدر عظیم النظر حقیقت مضمحل ہے۔ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔ جب انسانوں نے غاروں اور درختوں کی ابتدائی انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر قبائل کی اجتماعی زندگی شروع کی تو ان میں وجہ جامعیت اشتراک نسل تھی، یعنی ایک مورث اعلیٰ کی اولاد مل جل کر اکٹھی رہتی تھی۔ اس کا نام قبیلہ تھا۔ یہاں ایک قبیلہ وہاں دوسرا قبیلہ۔ باہمی مفاد کے تصادم پر ان قبائل میں جنگ و پیکار کے مظاہرے بھی رونما ہوتے رہتے تھے۔ اس جنگ میں حریف و عریف ہونے کا معیار حق و باطل کا معیار نہ تھا، بلکہ اپنے قبیلہ اور غیر قبیلہ کا معیار تھا، یعنی قبیلہ کا ہر فرد اپنے قبیلہ کے ساتھ ہوتا تھا اور دوسرے قبیلہ کا مخالف۔ یہ تھی انسان کی ابتدائی زندگی۔ اب ہزاروں سال کی تاریخ کے اوراق کو الٹ کر اپنے زمانہ میں پہنچ جائیے جو علم و تمدن کے اعتبار سے اپنے آپ کو ابتدائی دور جہالت سے اتنا مختلف سمجھتا ہے۔ جتنا انسان اپنے آپ کو حیوان سے مختلف قرار دیتا ہے۔ لیکن ذرا غور کیجئے کہ جہاں تک تقسیم انسانی کا تعلق ہے اس دور تہذیب و تمدن کا انسان اُس دور جہالت و ظلمت کے انسان سے کچھ بھی مختلف ہے۔ وہاں انسانوں کی تقسیم قبائل کی رو سے ہوتی تھی، یہاں وہ تقسیم اقوام کی رو سے ہوتی ہے۔ اور قوم کیلئے؟ قبیلہ

کی پھیلی ہوئی شکل۔ یعنی جب ایک قبیلہ بڑا ہو جاتے تو اسے قوم کہا جاتا ہے۔ قوموں کی ابتدائی تقسیم اختلافِ نسب کی رُو سے ہوئی، مثلاً ایرانی، تورانی، سامی، یا اختلافِ رنگ کی بنا پر مثلاً سفید، سیاہ اور زرد اقوام۔ اس بنیادی تقسیم سے آگے بڑھتے تو چھوٹی چھوٹی تقسیمیں جغرافیائی حدود کی رُو سے طے پاتی ہیں، یعنی کسی دریا یا پہاڑ کی حدود کے اندر بسنے والے لوگ دوسری قوم۔ غور فرمائیے! بایں ہمہ ادعائے تہذیب و تمدن انسان ابھی تک اسی پکڑ میں گرفتار ہے جہاں سے اس نے اپنی تمدنی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ ذرا یورپ کی تقسیمِ اقوام پر نگاہ ڈالئے اور پھر ان کی سببیت و بہیمیت اور وحشت و درندگی پر غور کیجئے۔

کیا آپ کو آلاتِ حرب و ضرب کی نوعیت اور سامان و ذرائعِ تباہی و بربادی کی ساخت و پرداخت کے علاوہ اُس دورِ جہالت اور اس دورِ تمدن میں کچھ بھی فرق نظر آتا ہے؟ کچھ بھی نہیں! اس لئے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ سے متعلق مسائل کا صحیح حل صرف وحی کی روشنی میں مل سکتا ہے اور یورپ اس روشنی سے محروم ہے۔

فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ۔ (۲/۱۵)

آج یورپ جس جہنم کے عذاب میں گرفتار ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے

نیشنلزم کی لعنت کہ اس نے احترامِ آدمیت کے بجائے قومیت پرستی (NATIONALISM) کو اپنا شعارِ زندگی بنا رکھا ہے، جس کی وجہ سے یہ دنیا انسانوں کی بستی کے بجائے درندوں کا بھڑٹ بن کر رہ گئی ہے۔ یورپ اس قومیت پرستی کے ہاتھوں کس قدر تنگ آچکا ہے، یہ ہم سے نہیں بلکہ خود یورپ والوں کی زبان سے سنتے۔ الفرڈ کوبن اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILISATION) میں لکھتا ہے۔

قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبہ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جوں ہی کوئی قوم اپنے حقِ استقلال و خود مختاری کو مستط کر لیتی ہے تو پھر ان اقوام کو دبا نا شرح کر دیتی ہے جو اپنے لئے خود مختاری کی مدھی ہوں..... ان تمام وجوہات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ کسی نظامِ حکومت کے لئے قومیت پرستی کی بنیاد بڑی ہی خطرناک ہے۔ (ص ۳۶)

اس سے پیشتر یہی پروفیسر صاحب لکھ چکے ہیں کہ موجودہ دور کی لڑائیوں کی بنا وہ کشمکش اور جذبہ رقابت

و منافست ہے جو مختلف اقوام کے دلوں میں مختلف اقوام کو کچلنے کے لئے پیدا ہوتا ہے (ص ۲)۔ ان مباحث کا اصلی مقام تو حکومت خداوندی کا عنوان ہے۔ لیکن ان اشارات سے یہ حقیقت سامنے آتی ہوگی کہ انسان باہر ہمد و مولائے تمدن و تہذیب ہنوز اسی لعنت میں گرفتار ہے جس میں وہ قبائلی زندگی کے دور میں تھا۔ یہ ہے وہ روش جس پر انسان نے اپنی تمدنی زندگی کی بنیاد، تنہا اپنے ذہن کی روشنی میں رکھی۔ اس کے برعکس، اس مسلک حیات کو دیکھتے ہوو جی کی روشنی میں متعین کیا گیا۔ حضرت نوح اپنی قوم کے ایک فرد ہیں لیکن جو نبی ان کی دعوت کی ابتدا ہوتی ہے قوم دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک وہ جو اس دعوت آسمانی پر ایمان لاتا ہے۔ دوسرا وہ جو اس کی تکذیب و مخالفت کرتا ہے۔ اس دوسرے طبقے میں صاحبان دولت و ثروت ہیں، اونچے گھرانے کے افراد ہیں۔ دوسری طرف مفلس و نادار انسانوں کی جماعت ہے جنہیں اول الذکر طبقہ "اراذل" شمار کرتا ہے لیکن یہ جماعت مومنین (حزب اللہ) اللہ کے کسانوں کی حفاظت اور رسول کی رحمت و شفقت کے سائے میں بڑھتی ہے۔ جماعت مخالفین خود انہی کی قوم کے افراد ہیں۔ یقیناً ان کے رشتہ دار بھی ہوں گے۔ لیکن ان کے ساتھ اب ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ان کے تعلقات کی بنیاد اب ایک اور ہی جذبہ ہے اور وہ جذبہ ایمان کا ہے۔ حقی کہ حضرت نوح کا بیٹا بھی چونکہ مکہ میں کی جماعت میں ہے، اس لئے اس قدر قریبی رشتے کے باوجود ان کے "اہل" میں سے قرار نہیں پاتا۔ اب "اہل" اور "غیر" کی تقسیم کا معیار کچھ اور قرار پا چکا ہے۔ اب ان کے "اہل" وہ "غیر" ہیں جن سے اس سے پیشتر قرابت واری کا کوئی تعلق نہ تھا۔ دعوت نوحی سے اس حقیقت عظمیٰ کی ابتدا ہوئی۔ اس سے آگے آپ دیکھیں گے کہ ہر رسول کے زمانہ میں اس تقسیم کے مظاہرے سامنے آتے جاتے گے۔ حضرت لوط کی بیوی اس تقسیم کی رُو سے کفار کی جماعت میں شامل تھی، نبی کے اہل میں سے نہیں تھی۔ حضرت ابراہیم کے باپ اس تقسیم کی رُو سے "غیروں" میں شامل تھے، انہوں میں سے نہیں تھے۔ حضرت موسیٰ کی قوم باوجود اشترک وطن، قوم فرعون سے الگ تھی، لیکن قوم فرعون میں سے جو لوگ اشترک ایمانی میں حضرت

لے نیش نازم کے متعلق "ابلیس و آدم" میں وحی کے عنوان میں بھی لکھا جا چکا ہے اور اس کے بعد حضرت ابراہیم کے تذکارِ جلیلہ میں بھی اس کا ذکر آئے گا۔ ویسے اگر آپ تفصیلی بحث دیکھنا چاہتے ہیں تو میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" ملاحظہ کیجئے۔

نوسٹے کے ساتھ تھے وہ قوم موسیٰ میں سے قرار دیئے گئے۔ یہ سلسلہ اسی طرح وسیع ہوتا چلا گیا تا آنکہ رسول کافرتہ للتاس کے عہد مبارک میں تمام نوز انسان کی تقسیم اسی اصول کے تحت قرار پا گئی۔ قرآن کریم نے جہاں "قوم الکافرین" کہا ہے تو اس میں دنیا میں ہر گوشے میں بسنے والے کفار آگئے۔ جب "قوم الظالمین" اور "قوم الفاسقین" اور "قوم المدجرین" کہا گیا تو تمام صفحہ ارض کے ظالمین و فاسقین و مجرمین اس جدید "قومیت" کے حلقے میں آگئے۔ اس کے برعکس جب ارشاد ہوا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ (۱۱۰) تو اس قومیت کی عالمگیریت و آفاقیت بھی حد و دنا آشنا اور قیود فراموش قرار پائی۔ لہذا اس اصول کی رُو سے ساری دنیا کے مومن، باوجود اختلاف رنگ و زبان، وطن، نسب ایک قوم کے فرد اور اس کے برعکس دنیا بھر کے منکرین، جماعت مخالف کے افراد۔ ان دونوں جماعتوں میں دنیا بھر کے اشتراک و وجوہات کے باوجود کوئی اشتراک نہیں تا آنکہ وہ آسمانی وجہ اشتراک یعنی ایمان کے رشتہ سے اس قومیتِ حقہ کے رکن نہ بن جاتیں کہ

اندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

یہ ہے وحی کی روشنی میں معیار قومیت۔ یورپ تو اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا کہ اس کے پاس وحی کی قندیل آسمانی نہ تھی، لیکن اس شوریدہ بختی کا کیا علاج کہ خود مسلمانوں کا بھی آج یہ عالم ہے کہ یورپ کی تقلید میں اشتراکِ وطن یا نسل کو وجہ جامعیت قرار دے کر قومیت پرستی کو شعارِ ملی بتایا جا رہا ہے، حالانکہ اب یورپ اس غلط معیارِ تقسیم انسانی کے ہاتھوں خود تنگ آچکا ہے اور اس کے اربابِ فکر و نظر قرآنی تعلیم سے غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر یا خود زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر (کہ فطرت کے مطالبات اور زمانہ کے تقاضے بھی انسان کو آہستہ آہستہ قرآن کی طرف آنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں) اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں کہ قومیت کی بنیاد وحدتِ افکار (ایمان و مذہب) پر ہی رکھی جانی چاہیے نہ کہ جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل پر۔ مشہور فرانسیسی مورخ رینان "ESSAY ON NATIONALITY" میں لکھتا ہے کہ

انسان کی روح دریاؤں کے رُخ اور پہاڑوں کی سمتوں میں مقید نہیں ہو سکتی۔ وطن کی سرزمین انسان کے لئے قائم اور کشمکش کا روبرو کے لئے ایک میدان ہتیا کر دیتی ہے۔ لیکن انسان (اس کے لئے) روح ہتیا کرتا ہے۔ اس مقدس تشکیل کے لئے جسے قوم (یا ملت) کہا جاتا ہے، آدمی ہی سب کچھ ہے۔ مادی اسباب میں سے کچھ بھی اس کے لئے کافی

نہیں ہو سکتا۔

اور (LORD BRYCE) اپنی کتاب (INTERNATIONAL RELATIONS) میں لکھتا ہے کہ

جس چیز پر کسی قوم کی اندرونی اور سب سے گہری زندگی کا انحصار ہے وہ مذہب ہی ہے۔
یورپ کا ایک اور مدبر (HENRY SIDGWICK) اگرچہ مذہب کو قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیتا (اس لئے کہ اس کے سامنے یورپ کی مختلف اقوام موجود ہیں جو ایک مذہب (عیسائیت) کے باوجود الگ الگ قومیت کی مدعی ہیں) لیکن جس شے کو وہ قومیت کی بنیاد قرار دیتا ہے وہ اسلام میں مذہب کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے نزدیک مختلف افراد کے ایک قوم بننے کے لئے ضروری ہے کہ ان میں "من تو شدم تو من شدی" کا شعور پیدا ہو جائے۔ یہ شعور کہ وہ ایک "جسد واحد" کے مختلف اعضاء ہیں..... اگر ان میں یہ شعور موجود ہو تو ہم انہیں ایک قوم کے افراد قرار دیں گے خواہ ان میں کوئی اور وجہ جامعیت ہو یا نہ ہو۔ (ELEMENTS OF POLITICS)۔ اسلام میں یہ شعور یگانگت اس وحدت فکر و نظر سے پیدا ہوتا ہے جس کا نام ایمان ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم مختلف شعوب و قبائل (اقوام و ملل) کا اعتراف (RECOGNISE) کرتا ہے لیکن صرف تعارفی غرض کے لئے، اس سے زیادہ اور کسی مقصد کے لئے نہیں۔ جیسے کسی شخص کے پانچ سات بیٹے ہوں تو وہ تعارف (پہچان) کی خاطر ان کے الگ الگ نام رکھ لیتا ہے یا جس طرح، محض انتظامی غرض کے لئے کسی مملکت کے مختلف خطے (صوبے) بنا دیئے جاتے ہیں اور ان کا کچھ تعارفی نام رکھ لیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے، دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے ممالک میں تعارفی نشانات کو رواد رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر یہ تفریق ایک دوسرے پر فضیلت کا باعث یا قومی عصبیت یا غیرت کا موجب بننے لگے تو یکسر غیر اسلامی ہے اور اس کا مٹانا نہایت ضروری۔ قرآن کریم کی رو سے معیار فضیلت فقط تقویٰ ہے اور بس! تمام انسان ایک اصل کی مختلف شاخیں ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں۔ اس لئے یہ چیز کہ کوئی شخص کسی آدمی کے گھر میں پیدا ہو گیا ہے یا اس کا وطن کونسا ہے، نہ وجہ امتیاز بن سکتا ہے نہ باعث تفریق۔

قرآن کریم نے نہایت واضح الفاظ میں اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ

لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَعْرَضَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقْسَمُوا إِنَّ اللَّهَ
عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝ (۲۹/۱۳)

اے نوح انسانی! ہم نے تمہیں (سب کو ایک ہی طرح) مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری
شائیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ (لیکن یاد رکھو کہ) تم میں سے اللہ کے
نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہے۔ یقیناً اللہ (سب کو کچھ)

جاننے والا خبردار ہے۔

چونکہ نسل کی بنیاد پر قبائل کی تقسیم میں ایک دوسرے پر برتری اور فضیلت کا امکان زیادہ تھا کہ اونچی
اور نیچی ذاتیں اسی طرح وجود میں آتی ہیں) اس لئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلی دعوت کے ذکر میں اس
حقیقت کی وضاحت کر دی کہ اگر کسی کا اپنا بیٹا بھی، کسی دوسری آیتذیالوجی (ایمان) کو ماننا ہے تو وہ اور اس کا
باپ دونوں ایک جماعت کے رکن، ایک برادری کے فرد اور ایک قوم کے آدمی نہیں بن سکتے۔

عمل غیر صالح کی ایک اور توجیہ اِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (۱۱/۴۶) سے بعض حضرات
کا ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ حضرت نوح کا یہ بیٹا ان

کی بیوی کے عمل بد کا نتیجہ تھا۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے:-

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَاَتٍ زُوِّجَتْ
كَانَتْ تَحْتَهُ عِبَادِيْنَ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحِيْنَ فَخَانَ تَهُمَا فَلَمَّ يُفْتِيَا
عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ذَّ قِيلَ اُدْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّٰخِلِيْنَ ۝ (۶۶/۱۰)
ان لوگوں کے لئے جو (حق و صداقت کی دعوت کا) انکار کرتے ہیں، اللہ نوح اور لوط کی بیویوں
کی مثال بیان کرتا ہے۔ وہ ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے زیرِ تحقیر تھیں لیکن انہوں نے
ان کی خیانت کی تو وہ اللہ کے (فیصلہ گئے) مقابلہ میں دونوں ان کے کسی کام نہ آسکے (وہ تباہ
ہو کر رہیں اور رسول کی بیوی ہونے کی حیثیت ان کے کسی کام نہ آسکی) اور (ان سے) کہا گیا کہ
تم دونوں جہنم میں داخل ہونے والوں کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔

لیکن حضرت نوح اور حضرت لوط کی بیویوں کی اس "خیانت" سے خیانتِ عصمت مراد لینا دور افتادہ سی
بات ہے۔ چنانچہ خود اس آیت سے متصل آیت۔

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَاتٍ فَرِعُونَ مِ اِذْ قَالَتْ
رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَيْتًا لِّیْ فِی الْجَنَّةِ نَحْبِیْ مِنْ فَرِعُونَ وَ عَلَیْهِ
وَ نَحْبِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِیْنَ ؕ (۱۱/۷۶)

اور ایمان والوں کے لئے اللہ فرعون کی بیوی کی مثال بیان کرتا ہے۔ جب اس نے عرض کیا
اے میرے رب! میرے لئے اپنے پاس جنت میں گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے اعمال سے
نجات دے اور مجھے ظالمین کی قوم سے بچائے رکھ۔

ان آیات میں حضرت نوح اور حضرت لوط کی بیویوں کا تقابل، فرعون کی بیوی سے کیا گیا ہے جس سے ظاہر
ہے کہ یہ تقابل یہاں کفر و ایمان کا تقابل ہے، عصمت و بے عصمتی کا نہیں۔ پھر حضرت نوح اور ان کے
بیٹے کا معاملہ کفر و ایمان سے متعلق تھا۔ اگر ان لوگوں کا خیال صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے
کہ اگر حضرت نوح کا بیٹا "ابنی کا بیٹا ہوتا" تو اسے عذابِ خداوندی سے نجات مل جاتی، خواہ وہ دعوتِ نوحی
کا منکر ہی کیوں نہ ہوتا۔ یہ قرآنی تعلیم کے صریحاً خلاف ہے۔ یہاں تو بتانا ہی یہ مقصود تھا کہ خواہ بیٹا ہی کیوں نہ ہو
اگر جماعتِ مخالف (منکرین) میں شامل ہے تو نسبی تعلق سے کچھ فائدہ نہیں دے سکتا، جس طرح حضرت ابراہیم
کے باپ کو نسبی رشتہ کچھ فائدہ نہ دے سکا۔ اور حضور خاتم النبیین کے عہدِ ہمایوں میں بدر و حنین کے میدانوں نے
دیکھ لیا کہ کس طرح نسبی تعلقات ایمانی رشتہ پر قربان کئے جاتے ہیں۔

ان تصریحات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت نوح (کے بیٹے کی طرح ان) کی بیوی بھی ایمان نہیں لائی
تھی اور اس کا شہر بھی وہی ہوا تھا جو دوسرے کفار کا ہوا۔ نہ حضرت نوح کا باپ ہونا ان کے بیٹے
کے کام آیا، نہ ان کا خاوند ہونا ان کی بیوی کے کسی کام۔ دین میں باہمی تعلق کی بنیاد ایمان ہے نہ
کہ رشتہ داریاں۔

عذابِ الہی اور مادی اسباب | انکارِ رشد و ہدایت کے سلسلہ میں دوسرا اہم گوشہ عذابِ

الہی کا فلسفہ ہے اس کی تفصیلی بحث کا تو یہ مقام نہیں لیکن
یہاں اجمالی اشارات ضروری سمجھے گئے ہیں کیونکہ دعوتِ آسمانی کے سلسلے میں شرح سے اخیر تک
یہ ٹکڑا مشترک ہے۔ قومِ نوح کی غرقابی کے واقعہ پر سب سے موزّانہ نگاہ صرف اتنا بتا سکے گی کہ پانی کا بلا لگ

طوفان آیا اور (سوائے ان لوگوں کے جو ایک کشتی میں سوار تھے) سب غرق ہو گئے۔ ان کی بستیاں نذرِ سیلاب ہو گئیں۔ سارے علاقہ میں کوئی متنفس باقی نہ رہا۔ جہاں اس شدت کا سیلاب آتا ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض محققین نے اس امر کی تحقیق کی بھی کوشش کی ہے کہ اس طوفان (DELUGE) کا طبعی سبب کیا تھا۔ مثلاً 'Suss' کا خیال ہے کہ "خلج فارس کا ساحل کسی عظیم الشان آتش فشاں لہر سے ٹکرایا اور اس کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا طوفانِ باد تندہ (CYCLONE) شامل ہو گیا۔"

(ENCYCLOPAEDIA OF RELIGIONS AND ETHICS)

لیکن ہم نے دیکھا یہ ہے کہ قرآنِ کریم ان واقعات کا ذکر کس انداز سے اور کس مقصد کے لئے کرتا ہے قومِ نوح کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کی تباہی سیلاب سے ہوئی۔ اس کے بعد قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط وغیرہ کے ضمن میں ہم دیکھیں گے کہ ان کی تباہی زلزلہ کے جھٹکوں، کوہِ آتش فشاں کی شہِ باریوں اور آندھی کے جھکڑوں وغیرہ سے ہوئی یعنی خارجی کائنات کے طبعی حوادث ان کی تباہی کا موجب بنے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حوادث ان کی بد اعمالیوں کا نتیجہ تھے یا انہیں ان کی تباہی کا موجب بنا دیا گیا تھا؟ اس کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ آج بھی زلزلے آتے ہیں، آتش فشاں پہاڑ پھٹتے ہیں۔ سیلاب بڑے بڑے ملکوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ آندھیوں کے طوفان چلتی ہوئی ریل گاڑیوں کو الٹا کر دیاؤں میں پھینک دیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ حوادث کسی قوم کی بد عملیوں کا نتیجہ نہیں ہوتے اس لئے کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کسی خاص عطرہ زمین کے انسانوں نے اخلاقی بد عملیاں شروع کیں اور ان پر اس قسم کا طبعی حادثہ وارد ہو گیا۔ یا یہ کہ اس قسم کے حوادث میں صرف بد عمل لوگ ہی تباہ ہوتے ہوں، نیک اعمال والے اس سے محفوظ رہتے ہوں۔ یہ طبعی حوادث دنیا کے ہر خطے میں آتے رہتے ہیں اور ان میں اچھے اور بُرے ہر قسم کے انسان تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہذا یہ ظاہر ہے کہ یہ حوادث نہ تو کسی قوم کے غلط اخلاقی اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ان سے صرف بد اعمال لوگ تباہ ہوتے ہیں۔

ابتداءً میرا بھی یہ خیال تھا کہ ان حوادث اور ان اقوام کے اعمال میں ایک بنیادی ربط تھا۔ لیکن قرآن پر مزید غور و تدبیر نے میری راہ نمائی اس طرف کی ہے کہ یہ حوادث ان کے اخلاقی اعمال کا نتیجہ نہیں ہوتے تھے۔ البتہ یہ ان کی تباہی کا ذریعہ بنا دینے جاتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے طبعی حادثہ کا علم، اس رسول کو قبل از وقت مل جاتا تھا اور اس سے کہہ دیا جاتا تھا کہ وہ یا تو اس سے

محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر کرے یا اُس سے پہلے اس جگہ سے نکل کر اپنے ساتھیوں سمیت دوسری جگہ چلا جائے۔ چنانچہ ہم نے حضرت نوح کے تذکرہ میں دیکھا ہے کہ انہیں اس آنے والے طوفان کا علم قبل از وقت دے دیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ وہ اس سے بچنے کے لئے کشتی بنالیں۔ وہ اپنے مخالفین کے سامنے کشتی بنانے میں مصروف تھے۔ لیکن چونکہ ان مخالفین کا انداز ہی یہ ہو گیا تھا کہ وہ ان کی ہر بات کو غلط بات سمجھتے اور اس کی تکذیب کرتے تھے، اس لئے وہ بجائے اس کے کہ حضرت نوح کی بات کو سچا سمجھ لیتے، اُلٹا ان کا مذاق اڑانے لگے۔ چنانچہ سیلاب اپنے وقت پر آیا۔ حضرت نوح اور ان کی جماعت اس کشتی کے ذریعہ اس تباہی سے محفوظ رہ گئے اور باقی قوم غرق ہو گئی۔ لہذا ان حوادث کے ذریعے ان اقوام کی تباہی میں اگر کوئی "ما فوق الفطرت" عنصر تھا تو اتنا کہ اس رسول کو آنے والے حادثہ کا علم قبل از وقت دے دیا جاتا تھا اور وہ اپنی اور اپنی جماعت کی حفاظت کا مناسب انتظام کر لیتا تھا۔ لیکن نبی اکرم کے زمانہ میں مخالفین کی تباہی کے لئے یہ ذریعہ اختیار نہیں کیا گیا۔ اور چونکہ نبی اکرم کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا اس لئے اب اس قسم کے حوادث کے قبل از وقت علم مل جانے کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ لہذا اب قوموں کی تباہی کی یہ صورت اس شکل میں باقی نہیں رہی جس شکل میں یہ اقوام سابقہ کے سامنے آیا کرتی تھی۔ قرآن نے قوموں کی موت اور زندگی کے ابدی قوانین دے دیئے ہیں اور یہ بتا دیا ہے کہ جو قوم ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گی اسے زندگی کی خوشگواریاں نصیب ہو جائیں گی، جو ان کے خلاف جائے گی وہ تباہ اور برباد ہو جائے گی۔ جو قوم اپنے معاشرہ کی عمارت غلط بنیادوں پر استوار کرتی ہے وہ اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ ہو جاتی ہے۔ اس کی تباہی خود اس غلط معاشرہ کی بنیادوں کے اندر مضمر ہوتی ہے اس کا نام قانونِ مکافاتِ عمل ہے، یعنی قوموں کے اجتماعی اعمال ان کی زندگی اور موت کا باعث بنتے ہیں اور یہ نتائجِ خدا کے اس قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہیں جن میں کوئی رقوم بدل نہیں کر سکتا نہ ہی کسی میں یہ وقت ہے کہ وہ ان قوانین کے نتائج کو بدل دے۔ قوموں کے عروج و زوال کے فیصلے اسی غیر متبدل قانون کے مطابق ہوتے ہیں اور اسی کو ان کی "تقدیر" کہا جاتا ہے۔

لہذا اقوام سابقہ کی تباہی اور اقوام حاضرہ کی ہلاکت کے سلسلہ میں اس اہم حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ قرآن اقوام سابقہ کا تذکرہ اس لئے کرتا ہے کہ بتایا جائے کہ انہوں نے صحیح نظامِ زندگی کی دعوت کو نہ مانا اور اس دعوت دینے والوں کی مخالفت کی اور وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ اصل مقصد ان کی غلط

روش زندگی کی طرف توجہ منعطف کرانا ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اسے ذرا واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ:

(۱) دنیا میں طبعی واقعات (PHYSICAL EVENTS) قوانینِ فطرت کے مطابق واقع ہوتے

رہتے ہیں۔ کسی قوم کی بد اخلاقی یا حسنِ اخلاق کا ان پر اثر نہیں پڑتا۔

(۲) طبعی حوادث (سیلاب، زلزلہ، آندھیاں، جھکڑ، خشک سالی وغیرہ) سے حفاظت (یا ان کی وجہ سے پہنچے ہوئے نقصان کا ازالہ) طبعی اسباب و ذرائع سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس میں کبھی (مذہب کی زبان میں) نیک عمل یا بد عملی کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ایسا البتہ ضرور ہوتا ہے کہ جس قوم میں اجتماعی بد کرداری (CORRUPTION) آجاتے یا جو قوم (مثلاً) عیش و عشرت میں غرق ہو کر اپنے ملک کے نظم و نسق کی طرف سے غافل ہو جائے تو ان کی اس بد نظمی کی وجہ سے اس قسم کے طبعی حوادث ان کی تباہی کا موجب بن جاتے ہیں، یعنی یہ حوادث رونما تو ان کی اس طبعی بد نظمی کی وجہ سے نہیں ہوتے لیکن ان کی بد نظمی کی وجہ سے ان کا نقصان سخت ہوتا ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ جو قوم اپنے نظم و نسق کو درست رکھے وہ اس قسم کے نقصانات سے یا بالکل محفوظ رہ سکتی ہے یا ان کا ازالہ بوجھل کر لیتی ہے۔

یہی پہلے ہوتا تھا، یہی اب ہوتا ہے۔ اس "سنت اللہ" میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ (۳۵/۴۳)۔

(۳) اقوامِ سابقہ جب آرام طلبی، سہل انگاری اور عیش سامانی کی زندگی میں جذب ہو جاتی تھیں تو وہ اپنے اجتماعی نظم و نسق کی طرف سے غافل ہو جاتی تھیں۔ خدا کے رسول، محض واعظ نہیں ہوتے تھے۔ وہ قوموں کو ان کی اس قسم کی بد عملیوں سے بھی آگاہ کرتے تھے لیکن قوم ان کی ایک نہیں سنتی تھی اور رفتہ رفتہ حالت یہ ہو جاتی تھی کہ وہ ان کی ہر بات کا مذاق اڑاتی تھی۔

(۴) حضراتِ انبیاء کرامؑ یا تو اپنی نگہ دور رس سے یا خدا کی طرف سے وحی کی بنا پر، کسی آنے والے طبعی حادثہ کو ذرا پہلے بھانپ کر لیتے تھے۔ وہ قوم کو اس سے آگاہ کرتے اور کہتے کہ وہ اپنی حفاظت کا سامان کر لیں۔ لیکن وہ اپنی غوغائے سرکشی اور ہٹ کی بنا پر کان نہ دھرتے۔ نتیجہ یہ کہ حضراتِ انبیاء کرامؑ اپنے اور اپنی جماعت کے بچاؤ کا انتظام کر لیتے اور باقی ماندہ (سرکش) قوم اس حادثہ کی وجہ سے تباہ ہو جاتی۔

یہی کچھ اُس زمانے میں ہوتا تھا، یہی کچھ آج ہوگا۔ آج ان اقوام کو متنبہ کرنے والے "رسول" نہیں ہوں گے، انہی کے دیدہ در ہوں گے۔ بحران کی مان لے گا، تباہی سے بچ جائے گا۔ جو نہ مانے گا تباہ ہو جائے گا اور یہی

اجتماعی ہوگی۔ جس قوم کے انجنیز بند کی تعمیر کے وقت سیمنٹ کی جگہ ریت استعمال کریں گے وہ قوم سیلاب کی نذر ہو جائے گی۔ قوم کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایسا انتظام کیوں نہ کیا کہ سیمنٹ کی جگہ ریت کا استعمال نہ ہو۔

حضرت نوح نے دعا کی تھی کہ

وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْأَرْضِ مِنْ الْكَافِرِينَ دَيَّانًا ۝۱ (۴/۲۶)

اور نوح نے دعا کی، اے اللہ ان نہ ماننے والوں میں سے ایک کو بھی زمین پر باقی نہ چھوڑو۔

بعض لوگ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ طوفان عالمگیر
کیا طوفانِ نوح عالمگیر تھا؟

تھا اور تمام صفحہ ارض اس کی پلیٹ میں آگیا تھا اور روئے زمین پر کوئی ذی روح باقی نہیں رہا تھا سوائے حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں کے جو کشتی میں سوار تھے۔ یہ خیال صحیح نہیں اور دانتہ یا غیر شعوری طور پر تورات سے مستعار لیا گیا ہے۔ تورات (کتابِ پیدائش) میں لکھا ہے کہ خداوند خدا نے کہا کہ میں چالیس دن اور رات متواتر زمینہ برساؤں گا اور ہر اس ذی روح کو جسے میں نے پیدا کیا ہے روئے زمین سے فنا کر دوں گا۔ (پیدائش ۷/۴) چنانچہ چالیس شب و روز کی بارش کے بعد ایک سو پچاس دن تک طوفان کا پانی موجیں مارتا رہا اور ساتویں مہینے سفینہ نوح اراط کی پہاڑیوں پر جا کر رُکا اور دسویں مہینے میں جا کر پہاڑ کی چوٹیاں دکھائی دیں۔ (پیدائش ۸/۵-۷) اور جب زمین نئے سرے سے خشک ہوئی تو جو جاندار کشتی نوح میں تھے ان کے علاوہ اور کہیں کوئی متنفس باقی نہ تھا (پیدائش ۲۱-۲۲)۔ لیکن قرآن کریم نے کہیں ایسا نہیں کہا۔ برعکس اس کے یہ ظاہر ہے کہ حضرت نوح کا مخاطب اپنی قوم سے تھا۔ ان کی دعوت انہی کے لئے تھی اور اس دعوت کی تکذیب بھی انہی کی طرف سے ہوئی۔ لہذا یہ تباہی بھی انہی پر وارد ہوئی۔ باقی دنیا کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ طوفانِ نوح کی آماجگاہ وہی وادی تھی جہاں یہ قوم آباد تھی۔ باقی رہا یہ کہ حضرت نوح نے اپنی دعا میں یہ کہا تھا کہ

رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْأَرْضِ مِنْ الْكَافِرِينَ دَيَّانًا ۝۱ (۴/۲۶)

اے میرے رب ان نہ ماننے والوں میں سے کسی کو بھی ارض پر باقی نہ چھوڑو۔

تو اس میں (الْأَرْضِ) سے مراد تمام صفحہ ارض نہیں بلکہ وہ ملک ہے جس میں وہ قوم بستی تھی۔ قرآن کریم میں متعدد شواہد موجود ہیں جن میں: الْأَرْضِ سے مراد ایک خاص علاقہ ہے۔ مثلاً قصہ حضرت موسیٰ

میں فرمایا ہے کہ۔

وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالِي فِي الْاَرْضِ ﴿١٠٨٣﴾

اور اس میں شک نہیں کہ فرعون ملک (مصر) میں بڑا ہی سرکش بادشاہ تھا۔ یہاں الارض ملک مصر کے لئے آیا ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ فرعون کی سرکشی اور تمرو اور غلبہ و تسلط تمام روئے زمین پر نہیں تھا، بلکہ ایک خاص ملک کے اندر محدود تھا۔ اسی طرح حضرت داؤد کے متعلق فرمایا،

يٰۤاٰدُۡدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاخْذُكُمۡ بَيْنَ النَّاسِ

پالْحَقِّ (۳۸/۲۶)

اے داؤد! ہم نے تجھے ملک (ارض) میں حاکم بنایا ہے۔ سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔

یہاں بھی ظاہر ہے کہ حضرت داؤد کی سلطنت تمام صفحہ ارض پر نہیں تھی، بلکہ ایک خاص خطہ ملک میں تھی۔ لہذا ان مقامات میں الارض سے مراد تمام روئے زمین نہیں، بلکہ وہ خاص علاقہ ہے جس سے واقعہ زیر نظر کا تعلق ہے۔ یہی مفہوم قصہ حضرت نوح میں "الارض" سے ہے۔

حضرت نوح کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَمَّثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ

اِلَّا خَمْسِيْنَ عَاقًا ط (۲۹/۱۴)

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان میں پچاس برس کم ہزار سال رہا۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت نوح کی عمر ساڑھے نو سو سال کی تھی؟ اگر تورات کی جاتیے تو حضرت نوح آدم سے دسویں پشت میں آتے ہیں اور ان تمام کی عمریں آٹھ آٹھ نو سو

سئال کی لکھی ہیں۔ چین کے مذہب **TAOISM** کا ایک بہت بڑا مبلغ **KWANG** چوتھی صدی

قبل مسیح میں گذرا ہے۔ یہ وہ بتانے کے بعد کہ عمر بڑھانے کا کیا طریقہ ہے، لکھتا ہے کہ

میں بارہ سو سال سے اسی طریق کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس پر بھی میرا جسم

رُو بہ انحطاط نہیں ہوا۔

لیکن قدیم زمانہ کی تاریخ میں بادشاہوں کی عمریں عام طور پر بہت لمبی لمبی لکھی گئی ہیں۔ اب ان روایات سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں کسی مورثِ اعلیٰ کی عمر سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ اس کے خاندان میں حکومت کتنے عرصہ تک رہی۔ یہ عرصہ حکومت اس مورثِ اعلیٰ کی عمر لکھا جاتا تھا، یعنی خاندان کے بجائے خاندان کے مورثِ اعلیٰ کا نام ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے قیاس یہی ہے کہ حضرت نوح کی عمر سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں ان کی تعلیم جاری رہی۔ زیرِ نظر آیت میں ہے۔

فَلَيْتَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا (۱۴۷/۳۹)

اس میں ایک ہزار کے ساتھ سَنَةٍ کا لفظ آیا ہے اور خَمْسِينَ کے ساتھ عَامًا کا۔ سَنَةٍ اور عَامًا دونوں کے معنی سال ہیں اس فرق کے ساتھ کہ سَنَةٍ بالعموم اس سال کو کہتے ہیں جس میں سختیاں آئیں اور عَامًا خوشحالی کے سال کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی تعلیم پہلے پچاس سال تو نہایت عمدگی سے جاری رہی لیکن اس کے بعد ان کے مقبوعین پر سختیوں کا دور شروع ہو گیا۔

اس ساڑھے نو سو برس کی مدت کو حضرت نوح کے زمانہ شریعت پر اس لئے بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مندرجہ صدر آیت کے بعد ہی حضرت ابراہیمؑ کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور تورات کی رُو سے حضرت نوح اور حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں نو سو باون سال کا فرق ہے۔ اگرچہ خود تورات اور تاریخ کے دیگر شواہد کی روشنی میں دیکھا جائے، تو حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ قریب اڑھائی ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ متعین ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور چیز بھی غور طلب ہے۔ عربی لغت میں سَنَةٍ کا اطلاق فصل پر بھی ہوتا ہے جو سال میں چار ہوتی ہیں، یعنی چار فصلوں کا ایک سال ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے أَلْفَ سَنَةٍ کے معنی ہوں گے اڑھائی سو سال۔ اور عَامٌ پورے سال کو کہتے ہیں، اس لئے اگر خَمْسِينَ عَامًا (پچاس سال) کو اس میں سے منہا کر دیا جائے تو باقی دو سو سال رہ جاتے ہیں اور اتنی عمر کچھ ایسی مستبعد نہیں۔

بہر حال یہ ہنوز تاریخ کے قیاسات ہیں اور چونکہ قرآن نے ان حضرات کے زمانہ کے متعلق بحث نہیں کی، اس لئے ان قیاسات میں سے جو کچھ حقیقت کے قریب ہوں (یا بعد کے انکشافات نہیں ایسا

ثابت کر دیں) انہیں درست سمجھا جائے گا۔

یہ ہے قوم نوح کی داستانِ عبرت انگیز جسے اللہ تعالیٰ نے حضور پر وحی فرمایا:۔
 تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ
 وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا ۗ فَاصْبِرْ ۗ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ۝ (۳۹) (اسے پیغمبر! یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم وحی کے ذریعے تجھے بتلا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں تو جانتا تھا اور نہ تیری قوم۔ پس تو ان تاریخی شواہد کی روشنی میں اپنے منصب پر استقامت سے ہمارا انجام کار متقیوں ہی کے لئے ہے۔

عیسائی معترضین اکثر کہا کرتے ہیں کہ حضرت نوح اور ان کی قوم کے قصے نبی اکرم کے زمانہ میں عام طور پر مشہور تھے اور یہود اور عیسائی علماء اکثر ان کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ اس لئے حضور اور اہل عرب ان سے واقف تھے۔ پھر یہ کہنا کس طرح درست ہے کہ یہ وہ امورِ غیب ہیں جن سے نہ نبی اکرم آگاہ تھے نہ ان کی قوم۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانے کے لوگ ان قصص کی عمومی حیثیت سے متعارف تھے لیکن جو تفصیل قرآن کریم نے بیان فرمائی ہیں، نہ صرف یہ کہ وہ زبانِ زدِ خلاق ہی نہ تھیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کے لٹریچر میں بھی موجود نہ تھیں۔ قصہ قوم نوح کا ماخذ تورات ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن ذرا تورات کے بیان کردہ قصے اور قرآن کریم

تورات کی تفصیل کا مقابلہ کر کے دیکھئے، حقیقت واضح طور پر سامنے آجائے گی کہ (اس) تورات میں ذہن انسانی کی فسانہ طرازی کا کس قدر دخل ہے اور قرآن کریم کے بیان میں کس قدر صداقت و پاکیزگی ہے۔ قصص قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ ان سے مؤرخانہ وقائع نگاری مقصود نہیں ہوتی، بلکہ قصہ کی صرف وہی کڑیاں بیان کی جاتی ہیں جن سے کوئی نہ کوئی اہم نتیجہ اخذ کیا جانا مطلوب ہو۔ قصہ قوم نوح میں اہم نکات یہ ہیں کہ حضرت نوح نے اپنی قوم کو خدا کے واحد کی اطاعت کی دعوت دی۔ قوم کے سرکش اور متمرّد طبقہ نے اس دعوت کی تکذیب و مخالفت کی اور جب پانی سر سے گذر گیا تو وہ قوم طوفان کے ذریعے ہلاک ہو گئی۔ اب دیکھئے کہ بائبل طوفان کی وجہ کیا بیان کرتی ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش میں ہے۔

اور خداوند خدا نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے دل کے تصور اور خیال

روز بروز صرف بد ہی ہوتے ہیں ۵ تب خداوند زمین پر انسان پیدا کرنے سے پچھتا تا اور نہایت دل گیر ہوا ۵ اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا زمین پر سے مٹا ڈالوں گا۔ انسان کو اور حیوان کو بھی اور کیڑے مکوڑے اور آسمان کے پرندوں تک کیونکہ میں ان کے بنانے سے پچھتا تا ہوں ۵ مگر نوح پر خداوند نے مہربانی سے نظر کی: (پیدائش ۵-۸/۶)

ذرا غور فرمائیے۔ تورات کا بیان یہ ہے کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خالق ارض و سموات نے بنانے کو تو یہ مخلوق بنا دی لیکن بنانے کے بعد اس پر سخت پشیمان اور متاسف ہوا اس لئے اس نے فیصلہ کر دیا کہ میں اپنی مخلوق کو صفحہ ارض سے نابود کر دوں گا۔ یہ کتاوہ "مقصودِ عظیم" جس کے لئے طوفانِ نوح برپا کیا گیا۔

(۲) کتابِ پیدائش کے مذکورہ صدر بیان، نیز اس کے دیگر بیانات سے ظاہر ہے کہ تورات کی رو سے طوفانِ نوح عالمگیر حیثیت رکھتا تھا کیونکہ خدا نے یہ کہا تھا کہ صفحہ ارض پر جس قدر ذی روح موجود ہیں وہ ان سب کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اس طوفان کی عالمگیریت کا نظریہ تاریخی تحقیقات کے سامنے نہیں ٹھہر سکا۔ چنانچہ اناسیکلو پیڈیا آف ریجنز اینڈ ایٹھکس کا مضمون نگار عنوان "طوفان" DELUGE کے تحت لکھتا ہے کہ ایک عالمگیر طوفان کا عقیدہ اربابِ تحقیق و خبر کے نزدیک بالکل مرفوع اقلیم ہے۔

اس کے برعکس (جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں) قرآن کریم کی رو سے یہ طوفان صرف قومِ نوح کے علاقے میں آیا تھا نہ کہ ساری دنیا پر اور یہ وہ حقیقت ہے جس کی تائید تاریخی شواہد اور اثری انکشافات سے ہوتی جا رہی ہے۔

(۳) تیسرا اہم نکتہ پسر حضرت نوح کا واقعہ ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں بتایا گیا ہے کہ اُس کے غیر صالح اعمال اُسے کس طرح لے ڈوبے اور نبی کا نسبی تعلق بھی اسے مکافاتِ عمل سے نہ بچا سکا اور وہ اپنا ہوتے ہوئے کیسے غیر بن گیا۔ لیکن اب دیکھئے کہ بائبل میں پسر نوح کا واقعہ کن الفاظ میں مذکور ہے۔ کتابِ پیدائش کے نوں باب میں ہے:-

اور نوح کھیتی باڑی کرنے لگا اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا ۵ اور اس کی مے پنی کر نشے میں آیا اور اپنے ڈیرے کے اندر آپ کو ننگا کیا۔ اور کنعان کے باپ عام نے اپنے باپ کو ننگا دیکھا اور اپنے دو بھائیوں کو جو باہر تھے خبر دی ۵ تب تم اور یافت نے ایک کپڑا لیا اور اپنے دونوں گانڈھوں پر دھرا اور کچھلے پاؤں جا کے اپنے باپ کی برہنگی کو چھپایا۔ پر ان کی پیٹھ اس کی طرف تھی کہ انہوں نے اپنے باپ کی برہنگی کو نہ دیکھا ۵ جب نوح اپنے نشے سے ہوش میں آیا تو جو اس کے چھوٹے

بیٹے نے اس کے ساتھ کیا تھا معلوم کیا ہے تب وہ بولا کہ کنعان ملعون ہو۔ وہ اپنے بھائیوں کے غلاموں کا غلام ہوگا۔ پھر بولا خداوندِ تم کا خدا مبارک اور کنعان اس کا غلام ہو ۵۔ خدا یافت کو پھیلانے اور وہ سم کے ڈیروں میں رہے اور کنعان اس کا غلام ہو۔ (کتاب پیدائش ۲۰-۲۴/۹)

یہاں تین چیزیں قابلِ غور ہیں۔ اول عام کا تصور یہ بتایا گیا ہے کہ اس نے اپنے باپ کا شر دیکھ لیا، لیکن اس کی سزا کا کچھ ذکر نہیں۔ دوسرے یہ کہ تصور عام کا ہے لیکن لعنت اور پھٹکار کا سزا اور اس کا بیٹا قرار دیا جاتا ہے اور تیسری (اور سب سے اہم) شق یہ کہ (معاذ اللہ - معاذ اللہ) خدا کے ایک برگزیدہ رسول کو ایک ایسی ہیبت میں پیش کیا گیا ہے جس سے سعید فطرت کا تصور بھی کانپ اٹھے۔ اس کے برعکس قرآن کریم نے حضرت نوح کی جس مقدس سیرت کو پیش کیا ہے اس سے ان کی رفعتِ مرتبت اور علو مدارج درخشندہ و تابناک صورت میں آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت نوح خدا کے برگزیدہ بندے تھے۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَ نُوحًا وَ آلَ إِبْرَاهِيمَ وَ آلَ عِمْرَانَ
عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ (۳/۳۲)

بلاشبہ یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے آدم اور نوح کو اور ابراہیم اور عمران کے گھرانوں کو تمام دنیا میں برگزیدگی عطا فرمائی۔

وہ عبدِ شاکر تھے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۗ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا ۝ (۱۱۴/۳)

تم ان لوگوں کی نسل ہو جنہیں ہم نے (طوفان کی ہلاکت سے نجات دی تھی اور) نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کرایا تھا! اور وہ ہمارا ایسا بندہ تھا جس کی سعی و عمل حسنِ نتائج سے بھلے ہوئے تھے۔

خدا کے مومنین کی جماعت میں سے تھے۔

وَ لَقَدْ نَادَيْنَا نُوْحًا ۖ فَلَمَّعَمَ الْجِبُّونَ نَاصِبًا..... إِنَّهُ مِنْ
عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۳۷/۸۱-۸۵)

اور یقیناً نوح نے ہمیں پکارا۔ سو ہم کیسے اچھے پکار کا جواب دینے والے ہیں اور ہم نے اسے اور اس کے پیروؤں کو کربِ عظیم سے نجات دی۔

اور اس کی نسل کو ہی باقی رہنے والوں میں رکھا اور آنے والوں میں اس کا (نیک) نام باقی رکھا۔ نوح پر اقوامِ عالم میں سلام ہو۔ اس طرح ہم مخلص بندوں کو جزا دیا کرتے ہیں۔ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

وہ حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کے رسول تھے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ
وَالْكِتَابَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَبِينَ ۚ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝ (۵۷/۲۶)

اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو رسول بنا کر بھیجا اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب کو جاری رکھا۔ سو ان (کی ذریت) میں سے ہدایت پر بھیجے ہیں اور اکثر ان میں سے فاسق ہیں۔

خدا نے ان کی پکار کو مانا اور اسے شرفِ قبولیت سے نوازا۔

وَلَوْحًا إِذْ نَادَىٰ مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ
مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ۚ (۲۱/۷۶) ذ (۳۷/۷۶)

اور (اسی طرح) نوح کا معاملہ (بھی یاد کرو) جو ان (نبیوں) سے پیشتر کا ہے، جب اس نے یہیں پکارا تھا (تو دیکھو) ہم نے اس کی پکار سُن لی اور اسے اور اس کے گھرانے کو ایک بڑی ہی سختی سے نجات دیدی۔

اور یہ اس لئے کہ آپ احکاماتِ الہیہ کے سچے فرمانبردار پیکرِ تسلیم و رضا اور مظہرِ اطاعت و انقیاد تھے۔ (۷۱-۷۳، ۷۴)

آیت (۱۰/۷۲) میں مِنَ الْمُسْلِمِينَ کے ٹکڑے پر غور کیجئے۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے کے اندر **م** بڑے بڑے حقائق جھلکتے نظر آئیں گے۔ سب سے پہلے یہ کہ مقامِ نبوت وہ مقام ہوتا ہے جہاں خدا کے قوانین و احکام کی کامل اطاعت ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس میں صحیح اختیار کی پوری شان جلوہ ریز ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ قرآن کریم نے جس سب سے پہلے رسول کا ذکر کیا ہے اس کا نام بھی مسلم قرار دیا ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس سلسلہِ ذریعہ میں ہر مقام پر اللہ کے برگزیدہ انسان اسی گرامی مرتبتِ خطا سے پکارے جائیں گے کہ اسی میں تکمیلِ شرفِ انسانیت کا راز ہے اور اس کے بعد یہ کہ جو پیغام حضرت نوح سے شروع ہوا وہ بھی اسلام ہی تھا اور جس کی تکمیل حضورِ نبویؐ مرتبت کے عہدِ ہایوں میں ہوئی وہ بھی اسلام ہی تھا۔ گویا سلسلہٴ رسالت و نبوت کی داستانِ قدسی اسلام اور امتِ مسلمہ ہی کی داستان ہے۔

لہذا، تورات کے بیان اور قرآن کے بیان میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ بنا بریں یہ کہنا کہ قرآن میں مذکور واقعہ تورات سے اخذ کیا گیا ہے، جہالت پر مبنی ہے۔

یہ ہے تذکرہ حضرت نوح کا جن کی ذریت میں تمام انبیائے امم سامیہ آئے جن کا ذکر جلیل آئینہ اوراق کے لئے وجہ زینت و مایہ افتخار ہوگا۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّةِ
آدَمَ قَدْ مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ (۱۹/۵۸)

یہ انبیاء میں سے وہ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا آدم کی نسل سے اور ان سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا۔

یہی بنی اسرائیل کے مورثِ اعلیٰ تھے۔

ذُرِّيَّةً مِّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا (۱۷/۳)

تم (اے بنی اسرائیل) ان لوگوں کی نسل ہو جنہیں ہم نے (طوفان کی ہلاکت سے نجات دی تھی اور) نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کرایا تھا۔ وہ ایک عبدِ شکور تھا۔

انہی کی نسل آگے بڑھ کر مختلف ندیوں اور دریاؤں کی صورت میں صفحہ ارض پر پھیلی۔

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ ۝ (۳۲/۴۴)

اور ہم نے اسی نسل کو باقی رہنے والوں میں سے بنایا۔

تاریخ کے پارینہ اور منتشر اوراق اور اثری انکشافات کے منقوش خط و خال آہستہ آہستہ اسی موسمِ اولیٰ کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ معلوم نہیں جب یہ تحقیقات اپنی تکمیل تک پہنچیں گی تو اس عہدِ کهن کے متعلق کیا کیا امور منصفہ شہود پر آئیں گے۔ سرِ دست، اربابِ نظر کے لئے یہ حقیقت بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کہ طوفان (FLOOD) کی داستانیں دنیا کے قریب قریب تمام اقوام کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ بابل کے کھنڈرات میں آج سے قریب چار ہزار سال پیشتر کی ایک نظم ملی ہے جو ایک عظیم الشان طوفان کا ذکر کرتی ہے۔ یونان، ایران، ہندوستان، چین، حتیٰ کہ امریکہ کے باشندوں کے ہاں، اساطیرِ الاولین میں طوفان کا تذکرہ موجود ہے۔ ہندوؤں کی پرانی کتابوں میں یہ قصہ بڑے دل چسپ انداز میں مذکور ہے۔ ست پت برہمن میں ہے کہ ایک دن منو جی

کے لئے غسل کا پانی لایا گیا، تو اس میں سے ایک مچھلی ان کے ہاتھ میں آگئی۔ مچھلی نے کہا کہ اگر آپ آزادانہ طور پر میری پرورش کریں تو میں آپ کو ایک طوفانِ عظیم سے نجات دلا دوں گی۔ منوجی نے اس کی خواہش کے مطابق اسے آزاد کر کے سمندر تک پہنچا دیا اور اس کی ہدایت کے بموجب ایک کشتی بنائی۔ جب طوفان آیا تو سمندر سے وہی مچھلی برآمد ہوئی اور منوجی نے اپنا جہاز اس کے سینگوں سے باندھ دیا جو اسے شمالی پہاڑوں کی چوٹی پر لے گئی۔ بھگوت پران میں ہے کہ ایک دفعہ جب برہما (یعنی خدا) سو رہے تھے تو ایک دیو ویدوں کو چڑھا کر لے گیا۔ ہری جی نے مچھلی کا بھیس بدل کر یہ راز ستیہ ورت کو بتا دیا جو پانیوں کا بادشاہ تھا۔ ہری جی اور اس دیو کی لڑائی ہوئی۔ اس میں ہری جی نے ایک عظیم الشان طوفان بلائی۔ گیزر برہما کے اس دیو کو شکست دی۔

اسی طرح باقی اقوام و ملل میں بھی طوفان کے قصے افسانوں کے رنگ میں باقی رہ گئے ہیں۔ کیا معلوم آنے والے انکشافات، ان مختلف ممالک و متنوع مقامات کے اندر پھیلے ہوئے قصوں کی قدر مشترک کے متعلق کیا کچھ ظاہر کریں۔ بہر حال قرآن کریم میں جس طوفان کا قصہ مذکور ہے اُسے ہم اوپر دیکھ چکے ہیں وہ آپ "پرانا قصہ" نہیں، اقوام و ملل کی حیات و موت کی زندہ کہانی ہے جس کے آئینے میں تقدیرِ اِمام کے خطوط اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ قرآن میں سلسلہٴ انبیاءِ کرام کے تذکرہ کا آغاز حضرت نوح کے قصہ سے ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر حضرت آدم کو سب سے پہلے نبی تصور کیا جاتا ہے اور اس سے مراد لے جاتے ہیں وہ "آدم" جو جنت سے نکلے تھے۔ "جنت سے نکلنے والے آدم" کے متعلق ہم "ابلیس و آدم" میں تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ وہ کسی خاص فرد کا ذکر نہیں بلکہ خود نوح انسانی کا ذکر ہے۔ وہ کسی خاص فرد "آدم" کی کہانی نہیں، خود "آدمی" کی سرگذشت ہے۔ قرآن میں آدمی کے بجائے آدم کا لفظ آیا ہے۔ اس لئے "جنت سے نکلنے والے آدم" سب سے پہلے نبی نہیں ہیں۔ البتہ سورۃ آل عمران میں ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَ نُوحًا..... (۳/۳۲)

اس میں آدم کا لفظ نوح کے ساتھ آیا ہے اور ان کے لئے لفظ اصْطَفَىٰ آیا ہے۔ اگرچہ اس لفظ سے بالضرور نبوت ہی مراد نہیں۔ قرآن میں یہ لفظ غیر انبی کے لئے بھی آیا ہے۔ لیکن اگر اس سے نبوت ہی مراد لے لی جائے، تو اس آیت (۳/۳۲) سے زیادہ سے زیادہ یہ مترشح ہوگا کہ حضرت نوح سے پہلے جو انبیاء گزرے تھے یا جو ان کے ہم عصر تھے، ان میں سے کسی کا نام آدم بھی ہوگا۔ (انگریزی زبان میں اب بھی لوگوں کے نام ADAM

ہوتے ہیں۔ یہ آدم بہر حال، جنت سے نکلنے والے آدم نہیں تھے۔ (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) وہ آدم کوئی ایک فرد نہیں تھا۔ ویسے بھی قصہ آدم میں جس معصیت کا ذکر ہے (یعنی خدا کے حکم سے دیدہ دالتہ سرکشی) وہ کسی نبی کے شایانِ شان نہیں ہو سکتی۔ اس کے مرتکب عام آدمی ہی ہو سکتے ہیں۔

خلاصہ مبحث | انسانی آبادی کی ابتداء کس خطہ زمین اور کونسی نسل سے ہوئی، یہ مسئلہ ایک مدت سے ارباب علم و تحقیق کے پیش نظر ہے۔ لیکن اب فیصلہ کارخ اسی طرف ہے کہ اس کی ابتداء عرب کے علاقہ سے ہوئی جہاں کی سامی نسل آنے والی تہذیب و تمدن کی موتس تھی۔ اسی قوم میں دجلہ و فرات کی وادیوں میں آج سے قریب چھ سات ہزار سال پیشتر حضرت نوح مبعوث ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس قوم میں طبقات کی تقسیم اور پیشوں کے اعتبار سے تفریق و تمیز شروع ہو چکی تھی۔ ارباب اقتدار و ثروت نے اس دعوت انقلاب کی مخالفت کی جو حکومت و اختیار اور رزق کے مشیروں کو ان سے چھین کر خدا کے قانون کے سپرد کر دینے کا مدعی تھا۔ نچلے طبقہ کے لوگوں نے اس دعوت پر لبیک کہا اور یوں دو محاذ بالمقابل قائم ہو گئے۔ جب اربابِ سطوت و اقتدار کا جور و استبداد حد سے بڑھ گیا اور اس امر کا یقین ہو گیا کہ ان کا ناسور لا علاج ہے تو مکافاتِ عمل کے اٹل قانون کے ماتحت حضرت نوح اؤ ان کے ساتھیوں کو کشتی میں سوار کر کے بچالیا گیا اور باقی سب نذر طوفان ہو گئے۔ مخالفین میں حضرت نوح کا اپنا بیٹا بھی تھا اور آپ کی بیوی بھی۔ لیکن انہیں نبی کی قرابت واری اس ہلاکت و تباہی سے نہ بچا سکی جو ان کی سرکشی کا نتیجہ تھا۔ قرآن کریم نے یہ کہہ کر کہ وہ درحقیقت حضرت نوح کے "اہل" میں سے نہ تھے، دنیا میں انسانوں کی تقسیم کا ایک ایسا بنیادی اصول سامنے کر دیا ہے جس نے نسلی، جغرافیائی، لسانی، وطنی حدود و قیود کو مٹا کر ساری تقسیم و تفریق سزب اللہ اور حزب الشیطان کے اصول پر رکھ دی ہے۔

قصہ حضرت نوح کی تفصیل تو رات میں بھی ہیں۔ لیکن ان تفصیل کو دیکھنے سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ان میں ذہن انسانی کی افسانہ طرازیوں نے کس درجہ دخل اندازی کی ہے اور یوں آسمانی تعلیم کو کس طرح مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔

"طوفان" کا تذکرہ قریب قریب دنیا کی ہر قوم کے اساطیر الاولین میں پایا جاتا ہے۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ مزید تاریخی تحقیقات اور اثری انکشافات تمام روئے زمین کی آبادی کی اصل کو شاید

اس خطہ کی طرف مرکوز کریں جس میں طوفانِ نوح برپا ہوا تھا۔

اس مقام پر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ حضرت نوح نے جس تعلیم کی دعوت دی اس کی مخالفت قوم کے اربابِ دولت و اقتدار کی طرف سے ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ تعلیم محض "خدا کی پرستش" کے متعلق ہوتی تو اس کی نفی خصوصیت سے اربابِ دولت و اقتدار کی طرف سے کیوں ہوتی۔ پرستش کے معاملہ میں تو عوام سب سے زیادہ متشدد ہوتے ہیں یہ مخالفت ان کی طرف سے ہونی چاہیے تھی۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ عوام تو اس دعوت کے ساتھ تھے اور اوپر کا طبقہ اس کا مخالف تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ دعوت ایسی تھی جس سے اربابِ دولت و اقتدار کے مفاد پر زبرد پڑتی تھی۔ اس لئے وہ اس کی مخالفت میں ایڑھی چوٹی کا زور لگاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضراتِ انبیائے کرام جس انقلاب کی طرف دعوت دیتے تھے اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ رزق کے سرچشموں کو افراد کے پنجے سے چھڑا کر قانونِ خداوندی کے تابع کر دیا جائے تاکہ وہ تمام نوعِ انسانی کی پرورش کا ذریعہ بن سکیں۔ یہی وہ دعوت ہے جس کی مخالفت ہمیشہ اربابِ حکومت اور سرکاری ادارہ طبقہ کی طرف سے ہوتی رہی اور ہوتی رہے گی۔ قرآن نے سب سے پہلی دعوت میں اس کشمکش کا ذکر کیا ہے اور یہی کشمکش اس کے بعد دعوت میں نظر آئے گی۔



فَوَيْلٌ لِلْعِبَادِ إِذْ يَأْتِي السَّمَاءَ دُخَانٌ مُّسْتَمِرٌّ
يَوَسِّعُ الرِّجَّازَ وَيَصْمُتُ السَّمْعَانَ وَيُغْشِي السَّيِّئِينَ
يَسْمُكُ السَّمْعَانَ وَيُغْشِي السَّيِّئِينَ

قوم عاد

آہ قومے دل زرتقی پرداخت
مرد و مرگ خویش را شناخته

حضرت ہود علیہ السلام

(قوم عاد)

جیسا کہ سابقہ عنوان میں لکھا جا چکا ہے، تورات کی رو سے اقوامِ عالم کی تقسیم حضرت نوح کے تین بیٹوں (یافت، حام اور سام) کی نسل کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ تورات کی اس تقسیم کی تاریخی حیثیت کچھ ہی ہو، لیکن تحقیقاتِ جدیدہ اس نتیجہ تک ضرور پہنچ چکی ہیں کہ عرب اور اس کے گرد و پیش (شام عراق وغیرہ میں) اُمّ سامیہ پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں سب سے اہم اور مقتدر قبیلہ عاد کا تھا۔ قبیلہ کیا! یہ تو ایک عظیم الشان قوم تھی جو ایک طرف حضرت نوح اور یمن کے علاقہ سے شروع ہو کر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جا پہنچی تھی اور دوسری طرف عرب سے نکل کر مصر اور شام پر حکمران تھی۔ قریب دو اڑھائی ہزار سال (ق.م)، ان تمام علاقوں پر اسی قوم کا تسلط و اقتدار نظر آتا ہے۔ سام کے بیٹے ارم کی نسبت سے انہیں عاد ارم بھی کہا جاتا ہے۔ جب دو اڑھائی ہزار سال (ق.م)، اس قوم کا ستارہ اقبال اوج پر تھا، تو اس زمانہ میں قوموں کے عروج و زوال، کی رفتار کے اعتبار سے سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی ابتداء کب سے ہوئی ہوگی؟ یوں سمجھئے کہ قوم نوح کی بربادی کے بعد جب یہ علاقے دوبارہ آباد ہوئے تو بنی سام کی پہلی ترقی اسی قوم عاد سے ہوئی ہے۔ یہی قوم عاد ہے جس کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے۔ ان کا مقام بخت و تبلیغ احقاف کا علاقہ تھا۔ احقاف صحرا کو کہتے ہیں۔ جزیرہ نملے عرب کا وہ طویل و عریض ریگستان جسے اب ریح خالی کہا جاتا ہے، احقاف کا علاقہ تھا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں کوہ تمشال

ریت کے ٹیلے، خوف و دہشت کے بھیانک عفاریت کی طرح سراٹھائے کھڑے رہتے ہیں۔ لیکن جب وہاں آندھی کا طوفان آتا ہے تو یہ ٹیلے ایک مقام سے اڑ کر دوسرے مقام پر جا مسلط ہوتے ہیں اور جو کچھ وہاں موجود ہو اُسے اس طرح نیچے دبا لیتے ہیں کہ پھر حکمہ آنا پر قدمیہ دلے ہی ان کا سراغ لگائیں تو کچھ پتہ چلے۔ کیا معلوم ان ٹیلوں کے نیچے کتنی آبادیاں، قبرستانوں میں منتقل ہو چکی ہیں۔ کم از کم ایک کا ذکر تو سن لیجئے۔ یہ شوریدہ بخت قوم وہ ہے جس نے حضرت ہودؑ کی دعوت کی تکذیب کی اور پھر جس کے فقط افسانے دنیا میں باقی رہ گئے، الا ان کے جو حضرت ہودؑ کے ساتھ بچا لئے گئے اور جو پھر عادِ ثانیہ کہلائے کیونکہ عادِ اولیٰ وہ تھے جنہیں ان کی اپنی غلط روش زندگی کی وجہ سے تباہ و برباد کر دیا گیا۔

قوم نوح کی جانشین | قرآن کریم میں ہے کہ حضرت نوحؑ کی قوم کے بعد قوم عاد کو ان کا جانشین بنایا گیا اور انہیں دنیا میں بڑا اقتدار تسلط اور وسعت و قوت عطا

فرمائی۔

وَإِذْ كَرُّوْنَا إِذْ جَعَلْنَاكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ أُمَّةٍ قَوْمٍ نُّوحٍ ذَاذِكُمْ
فِي الْخَلْقِ بَصُطَةً ۚ فَاذْ كَرُّوْنَا الْآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تَفْهَمُونَ ۝ (۷۹/۴)

تم اس حقیقت کو سامنے لاؤ کہ اس نے کس طرح قوم نوح کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت و توانائی بخشی۔ پس چاہیئے کہ اللہ کی قدرتوں کی یاد سے غافل نہ ہو، تاکہ ہر طرح کامیاب ہو۔

فارغ البال و مرفہ الحال | آبپاشی و سیرابی کے لئے قدم قدم پر چشمے اور پھلوں سے لدے ہوئے باغات، افراد اور مواشی کی کثرت، یہی کچھ اُس زمانہ میں قوت و سطوت کے استحکام و حصول کے ذرائع تھے۔ غرضیکہ ہر شے کی فراوانی۔ حضرت ہودؑ نے انہیں قوانین الہیہ کی طرف دعوت دیتے ہوئے انہی انعاماتِ خداوندی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اَیُّ اَمَدٍ كُمْ بِمَا تَعْلَمُونَ ۚ اَمَدًا كُمْ بِانْعَامِ رَدِّ
بَنِیْنٍ ۚ وَ جَنَّتِ ذَّ عِیُونٍ ۚ (۱۳۲-۱۳۴/۲۶)

اور اُس خدا کے قوانین کی نگہداشت رکھو جس نے تمہیں وہ چیزیں بکثرت دیں جو تمہیں معلوم ہیں۔

اُس نے تمہیں مواشی اور اولاد بکثرت دی (نہ صرف یہی بلکہ) باغات اور چشمے بکثرت دیئے! وہ ایسے ایسے محکم قلعے اور سنگین حصار بناتے تھے گویا انہیں اس سرزمین پر ہمیشہ کے لئے حکومت کرنی ہے۔

وَتَجْنِزُونَ مَصَارِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ۝ (۲۴/۱۳۹)

اور (اے قوم عاد!) کیا تم مضبوط مضبوط قلعے بناتے ہو شاید تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہو گے؟

ستونوں والے | اسی بنا پر قرآن کریم نے انہیں "ستونوں والے" کہا ہے۔

الَّتِي لَمْ يَخْلُقْ مِثْلَهَا فِي الْبِلَادِ ۝ (۲۴/۸-۷)

تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ کیا کیا؟ (کون سی قوم عاد! وہی) بڑے بڑے ستونوں والی قوم ارم! جس کے مثل شہروں میں کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی۔

جیسا کہ دنیا کی بڑی بڑی صاحبِ قوت و سطوت اقوام کا شیوہ ہوتا ہے، وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر اپنی بڑی بڑی یادگاریں قائم کرتے تھے جن کی افادیت کی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔ وہ محض اس قوم کے جذبہ تکبر و تعلیٰ کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ قرآن کریم کے الفاظ میں، حضرت ہودؑ نے ان سے کہا کہ

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ۝ (۲۴/۸۶) "تم پہاڑوں کی چوٹیوں پر ایسی عمارات بطور یادگار بناتے ہو جن کا کوئی مصرف نہیں!"

علم و بصیرت بھی | غرضیکہ انہیں ایسا تمکن فی الارض عطا ہوا تھا کہ شاید ہی کسی دوسرے کے حصے میں آیا ہو اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ تمام قوت و حشمت، جہالت کو لئے ہوتے

نہ تھی، بلکہ انہیں ذرائع علم (سماعت و بصرات و قلب) بھی عطا ہوئے تھے۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّهُمْ فِيمَا آتَيْنَاهُمْ لَعَلَّكُمْ تَهْتَكُونَ ۝ (۲۴/۲۴)

اور ہم نے انہیں وہ قوت و سطوت بخشی تھی جو ہم نے زمین میں تمہیں بھی نہیں بخشی اور انہیں

(سننے کے لئے) کان، (دیکھنے کے لئے) آنکھیں اور (سمجھنے کے لئے) دل (عقل و شعور)

عطا کئے تھے۔

قرآن نے سماع و بصر کے الفاظ اس علم کے لئے استعمال کئے ہیں جو مظاہرِ فطرت پر غور و خوض کے بعد حاصل ہوتا ہے، یعنی (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) جو اس کے ذریعے مشاہدہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سماع و بصر، جو اس کے ترجمان ہیں اور ان کے ساتھ تیسرا لفظ افشاء ہے۔ اس کے معنی 'MIND' کے ہیں، یعنی مشاہداتِ فطرت سے معلومات حاصل کر لینے کے بعد، قلب اور دماغ کے ذریعے استنباطِ نتائج کرنا۔ اس قسم کا علم تھا جو قوم عاد کو حاصل تھا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن اس علم کے ماہصل (دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ سائنس کی ایجادات وغیرہ کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف نہیں کیا جاتا تھا۔ قوانینِ خداوندی کا تقاضا ہے کہ علم کے ماہصل نوحِ انسانی کی منفعت کے لئے صرف کیا جائے۔ لیکن جو قومیں غلط روشِ زندگی پر چلتی ہیں وہ ان قوتوں کو باقی انسانوں کی غلامی کا ذریعہ بنا لیتی ہیں اور ان کی محنت کی گمانی کے سلب و ذہب (EXPLOITATION) کو اپنی کاریگری قرار دے لیتی ہیں۔ یہی کچھ قوم عاد کرتی تھی۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ ہر مستبد قوم کی طرح ان کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ جن قوموں پر ہاتھ ڈالا، آہنی شکنجے میں جکڑ لیا کہ ان کی غلامی کے جال کا کوئی حلقہ ڈھیلا نہ ہونے پائے۔

وَ إِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ۝ (۲۶/۱۳۶)

اور جب تم لوگوں پر گرفت کرتے ہو تو بڑے اجبروت بن کر گرفت کرتے ہو کہ
کوئی تمہارے جنگل سے نکلنے ہی نہ پائے۔

تکذیبِ رسول | اللہ تعالیٰ نے اپنے قانونِ ہدایت کے مطابق رسول بھیجے۔ لیکن نہ حکومت و قوت کی اور اپنے ظلم و استبداد میں بڑھتے ہی چلے گئے۔

كَذَّبَتْ عَادٌ بِالْمُرْسَلِينَ ۝ (۲۶/۱۳۳)

قوم عاد نے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا۔

قوانینِ خداوندی سے بغاوت اور اپنے سرکش و جاہلِ اربابِ حکومت کا اتباع، یہ تھا شیوہ اس قوم کا۔

وَ تِلْكَ عَادٌ تَبَّحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهُ وَ اتَّبَعُوا أَمْرَ

كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ۝ (۱۱/۵۹)

یہ ہے سرگذشت عادی۔ انہوں نے اپنے پروردگار کے قوانین سے انکار کیا، ان کے رسولوں کی نافرمانی کی اور اپنے متکبر سرداروں کی اطاعت، اختیار کی۔

حضرت ہوڈ | بالآخر جب جور و استبداد اور سرکشی و عصیان کی انتہا ہو گئی اور سنت اللہ (قانونِ مکافات) کے مطابق ان کی غلط روشِ زندگی کے ظہور نتائج کا وقت قریب آپہنچا تو آخری کوشش کے طور پر ان کی طرف انہی میں سے ایک رسول حضرت ہوڈ کو بھیجا گیا۔

وَ اِلٰى عَادٍ اٰخَاهُمْ هُوْدًا ۙ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ

اِلٰهِ غَيْرُكَآ ۙ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (۴۵/۷۰، ۱۱/۵۰، ۲۶/۲۱، ۳۶/۲۱)

اور (اسی طرح) ہم نے قوم عاد کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے ہوڈ کو بھیجا۔ اس نے کہا

”اے قوم! اللہ کی اطاعت و فرماں پذیری اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ کیا تم (انکار)

بد عملی کے بڑے نتائج سے) نہیں ڈرتے؟

خدا کی حکومت کی طرف دعوت | آپ آئے اور اس سرکش و متمرد قوم کو اسی پیغامِ ازلی کی دعوت دی جو ہدایتِ آسمانی کی اصل واسطہ

ہے، یعنی کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت کی سزا اور فقط ایک

ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ (۴۵/۷۰، ۱۱/۵۰، ۲۶/۲۱، ۳۶/۲۱)۔

قوانین الہیہ اور دنیاوی برکات | قوم قوت و سلطوت کی مالک تھی۔ انہوں نے سمجھا کہ ہدایتِ آسمانی کے اتباع سے مفہوم یہ ہو گا کہ ہم حکومت د

دولت کو چھوڑ کر دنیا تیاگ دیں اور زاریوں اور خانقاہوں یا پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر رہبانیت کی زندگی

سہ کرنے لگ جائیں۔ لیکن حضرت ہوڈ نے اس باب میں ایک ایسی حقیقت کو واضح کر دیا جو اتباعِ قوانین

الہیہ کا فطری نتیجہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔

وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُكُمْ رَبُّكُمْ لَمَّا تُوْبُوْا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ

مِدْرَارًا ۙ وَيَنْزِلُكُمْ تَوْبًا اِلٰى قُوْبِكُمْ ۙ وَ كَذٰلِكَ نَتَوَلّٰوُا الْمُجْرِمِيْنَ (۱۱/۵۲)

اور اے میری قوم کے لوگو! تم قوانینِ الہیہ کی حفاظت میں آ جاؤ، یعنی غلط روش چھوڑ کر صحیح راہ اختیار

کرو۔ وہ تم سب پر برستے ہوئے بادل بھجھے گا جس سے تمہارے کھیت اور باغ شاداب ہو

جائیں گے اور تمہاری قوتوں پر نئی نئی قوتیں بڑھادے گا (کہ روز بروز گھٹنے اور کمزور ہونے کی جگہ اور زیادہ بڑھتے اور قوی ہوتے جاؤ گے) اور (دیکھو) جرم کرتے ہوئے اس سے منہ نہ موڑو۔

یہ ہے عظیم فرق آسمانی ہدایت اور ذہن انسانی کے پیدا کردہ تصویف مذہبیت میں۔ ذہن انسانی نے سمجھ یہ رکھا ہے کہ دین اور دنیا دو الگ الگ شعبے ہیں اور دونوں یکجا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ دنیا سے مراد ہے قوت و سطوت، دولت و حشمت، حکومت و سلطنت کی زندگی اور دین داری سے مفہوم ہے بے کسی و بیچارگی، عاجزی و ناتوانی، مفلسی و ناداری کی زندگی یعنی وہ زندگی جس میں دنیا اور اس کی خوشگوار یوں سے نفرت کی جائے اور ترک لڈا نڈے سے ”پرہیزگاری“ کو مقصد حیات قرار دیا جائے۔ لیکن یہ تصویف یکسر غیر اسلامی ہے۔ اسلام میں دین کا تصویف یہ ہے کہ دنیا بھر کے سرکش و متمرد انسانوں سے قوت و حکومت اور رزق کے سرچشمے چھین کر جماعت مومنین (حزب اللہ) کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں جو اپنی مرضی کے مطابق اس کا استعمال نہ کرے بلکہ قوانین خداوندی کے ماتحت نظم و ضبط عالم کو ترتیب دے اور تمام نعمتے دنیا کو نوع انسانی کی پرورش اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے عام کر دے (تفصیل ان اشارات

نظام حکومت خداوندی کی عملی تشکیل

کی اپنے مقام پر آئے گی) حضرت ہوڈ نے ہی فرمایا کہ میں جس تعلیم کی طرف دعوت دیتا ہوں اس کا نتیجہ کمزوری اور ناداری نہیں، بلکہ اس سے تمہاری قوتیں اور بڑھ جائیں گی۔ فقط نظام معاشرہ میں ایسی تبدیلی ہو جائے گی جس سے ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا اور اس نظام کی عملی تشکیل یوں ہوگی کہ

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ ۝ وَأَطِيعُوا أَمْرًا ۝ (۱۲۵-۱۲۶/۱۳۱، ۲۶/۱۳۱)

میں تو تمہارے لئے ایک امانت دار (خدا کا) پیغامبر ہوں۔ تو تم اللہ کے قوانین کی نگہداشت

کرو اور اس کے لئے میری (یعنی ان احکام کی جو میں خدا کی طرف سے تمہیں پہنچا رہا ہوں)

اطاعت کرو۔

غور کیجئے، منصب رسالت کی صحیح حقیقت کس طرح واضح طور پر سامنے آگئی ہے۔ اللہ کی حفاظت میں آجاؤ۔ اس کے قوانین کا اتباع کرو۔ اپنی اپنی جگہ، الگ الگ نہیں، بلکہ اس حکومت خداوندی کے مرکز اولیں (یعنی رسول) کی اطاعت کرو۔ اس اطاعت میں، میں تم سے اپنے لئے کچھ نہیں چاہتا۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ
الْعَالَمِينَ ۝ (۱۱/۱۲۷-۱۲۸)

میں اس بات کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا معاوضہ تو صرف پروردگارِ عالم پر ہے (اور بس!!)

تکذیب، اربابِ اقتدار کی طرف سے | یہ تھا وہ معاشرہ جس کی طرف حضرت ہودؑ نے قوم کو دعوت دی۔ لیکن جابر و مستبد انسان جن کے منہ کو انسانوں کا خون لگ گیا ہو، بھلا کس طرح اس نظام کو قبول کر لیں! سب سے پہلی تکذیب حسبِ معمول، قوم کے سرداروں کی طرف سے ہوئی، انہی سرداروں کی طرف سے جن کے گھروں میں "برتن بھرے ہوئے تھے۔"

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرِيكَ فِي سَفَاهَةٍ ۚ
إِنَّا لَنَنظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ۝ (۷/۶۶)

اس پر قوم کے مرقہ الحال لوگوں نے جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا تھا، کہا کہ ہمیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تم حماقت میں پڑ گئے ہو اور ہمارا خیال یہ ہے کہ تم جھوٹ بولنے والوں میں سے ہو۔ اس کے جواب میں حضرت ہودؑ نے فرمایا۔

قَالَ يَقَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ ۚ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝.....
..... فَأَذْكَرُكُمُوهَا ۖ وَاللَّهُ لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ ۝ (۷/۶۹-۷۰)

ہود نے کہا "بھائیو! میں احمق نہیں ہوں۔ میں تو اس کی طرف سے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، فرستادہ ہوں۔ میں اس کا پیام تمہیں پہنچاتا ہوں۔ اور یقین کرو کہ تمہیں دیانتداری کے ساتھ نصیحت کرنے والا ہوں۔ کیا تمہیں اس بات پر اچھنچا ہو رہا ہے کہ ایک ایسے آدمی کے ذریعہ تمہارے پروردگار کی نصیحت تم تک پہنچی جو خود تم ہی میں سے ہے؟ خدا کا یہ احسان کرو کہ اس نے قوم نوح کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت و توانائی بخشی پس چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کی یاد سے غافل نہ ہو، تاکہ ہر طرح کامیاب ہو۔

ان آیاتِ جلیلہ میں دو تین باتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ پہلے تو یہ کہ نشہ حکومت و دولت میں سرمست

انسان، دعوت الی الحق کو کس طرح نفرت و استہزاء سے ٹھکراتا ہے۔ اِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ اور لَنَنظُرُكَ مِنْ الْكُذِبِ بِئِنَّ پر غور کیجئے۔ تہر دو سرکشی کی بدستیاں کس طرح چھلکتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ پھر مقابلہ میں جواب دیکھئے! کس قدر متانت و سنجیدگی کا مظہر ہے۔ شکن بجیس نہیں، کف بدہاں نہیں، نعل برآتش نہیں، گالی کا جواب (معاذ اللہ) گالی نہیں، کوئی ادچاپن **محکم چوں کو ہسار** نہیں، سفاہت نہیں۔ اپنے مقام بزرگ و بلند پر پہاڑ کی طرح محکم کھڑے ہیں۔ اس لئے کہ اپنی دعوت کی صداقت پر غیر متزلزل یقین ہے۔ قرآن کریم نے حضرات انبیاء کرام کی مخالفت کا اکثر و بیشتر ذکر کیا ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ قوم مخالف کے جدال و قتال کی بہ نسبت ان کی طرف سے تکذیب و استہزاء کا ذکر بڑا نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔ جدال و قتال بھی اپنے مقام پر آزمائش کی گھاٹیاں ہیں۔ لیکن ایک داعی و مصلح کی راہ میں تکذیب و تحقیر کی منزل بڑی سخت ہوتی ہے۔ عام انسانوں پر نگاہ ڈالنے وہ بالعموم بڑی بڑی کٹھن مشکلات کا سامنا کریں گے، لیکن جو نبی ان پر کسی نے تنقید (CRITICISM) کی یا ان کا استہزاء (RIDICULE) کیا، ان کی بات کو جھوٹا بتایا، ان کی دعوت کا مذاق اڑایا تو وہ فوراً آپے سے باہر ہو گئے اور پھر اس کے بعد ایسی چو کڑی بھولنے کے حصول مقصد و نصب العین کے لئے تگ و تاز کے بجائے اسی تنقید و تنقیص کی غار دار جھاڑیوں میں الجھ کر رہ گئے۔ استہزاء و تنقیص کے مرحلہ میں دامن ضبط و استقامت کو ہاتھ سے نہ جانے دینا، فی الواقعہ من عزم الامور ہے اور آسمانی انقلاب رلوبیت کی طرف دعوت دینے والوں کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے۔ سرداران قوم کی اشتعال انگیز تنقیص پر نگاہ ڈالئے اور اس کے بعد حضرت ہود کے متین و سدید جواب پر۔ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

دوسری چیز وہی ذہن انسانی کی عجوبہ پسندی! یعنی قوم کو حیرت و استعجاب اس امر پر ہے کہ انہی جیسا ایک انسان (رَجُلٌ مِّمَّنْكُمْ) اور دعوائے رسالت! قَالُوا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (۱۲/۱۰)۔ انہوں نے کہا کہ تم تو محض ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو (اور کوئی مافوق الفطرت چیز بھی تمہارے پاس نہیں) مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ (۱۱/۵۳)۔ اس لئے

مَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِ الْهَيْتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ۝ (۱۱/۵۳)

تمہارے کہنے سے تو ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ نہیں سکتے اور نہ ہی تمہاری بات مان سکتے ہیں۔ پھر وہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھے اور کہا کہ تم جو (معاذ اللہ) اس قسم کی ہلکی ہلکی باتیں کرتے ہو تو اس کا

سبب ہماری سمجھ میں سولے اس کے اور کچھ نہیں آتا کہ تم نے جو ہمارے دیوی دیوتاؤں کی تکذیب کی ہے تو تم پر ان میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے۔

إِنْ نَقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوْعَةٍ (۱۱/۵۷)

ہم جو کچھ کہہ سکتے ہیں، وہ تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے

کسی معبود کی تجھ پر مار پڑ گئی ہے۔ (اسی لئے تو اس طرح کی باتیں

کرنے لگا ہے)۔

یہ جگر سوز طعن و تشنیع دیکھئے اور پیغمبرانہ جواب ملاحظہ فرمائیے کہ

قَالَ إِنِّي أَشْهَدُ بِاللَّهِ وَ أَشْهَدُ ذَا آتِي بَرِيءٌ مِّمَّا لَشْرِكُونَ ۝ (۱۱/۵۷)

ہوڈ نے کہا، میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ جن ہستیوں کو تم نے اس کا شریک

بنارکھا ہے، مجھے ان سے کچھ سروکار نہیں۔ میں ان سے سراسر بیزار ہوں۔

اسلاف پرستی | یہاں تک تو نشہ قوت و دولت کی سرستیوں کے مظاہرے تھے۔ اب

دنیاۓ معتقدات اور اس کی جذبات پرستی کی طرف آئیے، یعنی وہی سازگرن

کہ چونکہ تمہاری دعوت اس مسلک کے خلاف ہے جو ہم میں آبار و اجداد سے متوارث چلا آ رہا ہے، اس لئے ہم

اس دعوت کی تکذیب کرتے ہیں! وہی اسلاف پرستی اور وہی قدامت پسندی!

قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللَّهَ وَ حُودًا وَ ذَا سَ مَا كَانَ يَعْبُدُ

أَبَاؤُنَا ۚ (۱۱/۶۰)

انہوں نے کہا، کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم صرف ایک ہی خدا کی عبودیت

(محکومیت و اطاعت) اختیار کر لیں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے آبار و

اجداد کرتے آتے ہیں!

اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کے اس ادعا کے جواب میں حضرت ہوڈ نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اس میں ارباب

فکر و نظر کے لئے حکم و بصائر اور معارف و حقائق کی ہزار داستانیں مستور ہیں۔ فرمایا۔

أَتُجَادِلُونَنِي فِي أَسْمَاءِ سَيِّئَاتٍ مِّمَّا أَنْتُمْ وَ آبَاءُكُمْ مَا

نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۙ (۱۱/۶۱)

جس چیز کی بنا پر تم مجھ سے جھگڑ رہے ہو اس کی حقیقت کیا ہے؟ فقط اتنی کہ وہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے بزرگوں نے اپنے جی سے گھڑ لئے ہیں اور جن کے لئے خدا نے کوئی سند نہیں اتاری۔

تبلیان حقیقت | اس چھوٹے سے ٹکڑے پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ کتنی عظیم حقیقت اس کے اندر منعکس ہے۔ یہ روایتی عظمت اور موروثی تقدیس کیا ہے؟ فقط اس قدر کہ ابتدا میں جہالت اور توہم پرستی سے کوئی عقیدہ قائم ہو گیا جس کا کچھ نام رکھ لیا گیا۔ جب وہ دو چار نسلیں متواتر چلا آیا، تو اس کی کہنگی، وجہ تقدس ہو گئی اور وہ نام دل کی انتہائی گہرائیوں میں اس طرح جاگزیں ہو گیا کہ عقل و بصیرت کی کوئی دلیل اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ ایک پتھر پہاڑ کے کسی گوشے میں پڑا ہے، تو فقط پتھر ہے۔ لیکن اُسے کسی چبوترہ پر الگ نصب کر کے اس کا کچھ نام رکھ دیجئے۔ اس نام کی ترویج دو تین نسلوں تک مسلسل ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ یہ پتھر کیا سے کیا بن جاتا ہے اس کی روایتی عظمت دلوں میں اس طرح نقش ہو جاتی ہے کہ اس کے تحفظ کے لئے انسانی خون کی بھی کوئی قیمت نہیں سمجھی جاتی اور اس طرح وہی پتھر جو ”گمنامی“ کے ایک گوشے میں پڑا تھا، قلوب و نگاہ کامرکز بن جاتا ہے۔ حالانکہ چشم حقیقت میں کے نزدیک محض نام رکھ دینے سے اس کی ماہیت اور حقیقی قدر و قیمت (INTRINSIC VALUE) میں کچھ فرق نہیں آگیا۔ اب اس خارجی دنیا سے ہٹ کر ذرا اپنے دماغ کے بُت کہہ کو ٹٹولئے اور دیکھئے کہ اس میں کتنے ”پتھر“ ایسے رکھے ہیں جن کی قدر و قیمت کے متعلق آپ کے پاس سولتے اس کے کوئی دلیل و شہادت نہیں کہ ان کے نام کی عظمت نسل بعد نسل متواتر چلی آتی ہے اور محض قدامت کی بنا پر ان ناموں میں شانِ تقدس پیدا ہو چکی ہے۔ دیکھئے کہ یہ نام آپ کے نزدیک اس قدر مقدس بن چکے ہیں کہ اُن کے خلاف آپ ایک لفظ تک سنا نہیں چاہتے! پھر یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قدر و قیمت کے پرکھنے کے لئے کیا معیار مقرر فرمایا ہے۔ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ مَا نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ یعنی ان چیزوں کی عظمت و تقدس کے لئے اللہ کی طرف سے کوئی سند تمہارے پاس نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ قدر و منزلت کے پرکھنے کا صحیح معیار وہ سند ہے جو مُنَزَّلَ مِنْ اِلٰہِ ہو۔ ہر شے کو میزانِ خداوندی میں رکھ کر دیکھ لیجئے۔ یہ ”دھرم کانٹا“ جو وزن بتاتے وہی درست اور صحیح ہے، خواہ آپ کا ذہن یا اسلاف پرستی کے معتقدات کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔ محض اسمار کو دلیل اور حجت سمجھ لینا، حقیقت

فراموشی اور خود فریبی ہے۔ دلیل اور حجت اس آسمان کے نیچے فقط ایک ہے مَا أَنْزَلَ اللَّهُ جِوَانِدًا نَزَلَ كَيْفَ هُوَ۔

تکذیب میں شدت | حضرت ہوڈ کی دعوت اور قوم کی طرف سے تکذیب برابر آگے بڑھتی گئی۔ طبیب کی شفقت اور مریض کی ضد متوازی چلتی گئی۔ حضرت ہوڈ ان سے بار بار کہتے تھے کہ دیکھو! قوانین الہیہ سے سرکشی کا مسلک چھوڑ دو، ورنہ اس کا نتیجہ ہلاکت اور تباہی ہوگا۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ آسمان کی فضا میں کس طرح اس وبا کے جراثیم پھیلتے جا رہے ہیں جو قانونِ مکافاتِ عمل کے ماتحت تم پر عذاب بن کر مستط ہو جائیں گے اور پھر کوئی راہ فرار باقی نہیں رہے گی۔ لیکن قوت اور دولت کا نشہ ان باتوں کی طرف کب کان دھرنے دیتا ہے؟ سرکش و مترو انسان دیکھتے تھے کہ جس طرف ان کا قدم اٹھتا ہے عروج اور ترقی آگے بڑھ کر رکاب تھامتے ہے۔ ان بڑھتی ہوئی کامیابیوں اور چڑھتی ہوئی کامیابیوں میں ہلاکت و بربادی کا تصور بھی کیسے آسکتا تھا؟ لیکن وہ نہیں سمجھتے تھے کہ بادہ رنگیں کے اثرات سے جو سُرخ چہرے پر دوڑتی ہے، وہ خون کی تازگی اور صحت کی شکفتگی کی سُرخ نہیں ہوتی بلکہ شفق کی سُرخ ہوتی ہے جو غروبِ آفتاب کا نقاب رنگیں بن کر نگاہوں کو فریب دیتی ہے۔

وَزَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّ هُمْ عَنِ السَّبِيلِ
وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ۝ (۲۹/۳۸)

اور (دیکھو!) شیطان نے ان کی بد اعمالیوں کو ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا رکھا تھا۔ چنانچہ (اس کے نتیجے میں) شیطان نے انہیں (صحیح راستہ کی طرف آنے) سے روک رکھا۔ (انہوں نے شیطان کی تعلیمات کی اندھا دند تقلید کی اور اپنی عقل و بصیرت سے مطلق کام نہ لیا، حالانکہ وہ لوگ سمجھ بوجھ رکھنے والے اور حقائق کو دیکھنے والے تھے۔

وہ مستبصرین تھے | غور فرمائیے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کس قدر جامع ہیں۔ شیطان حتیٰ حد صد اذیت کی راہ روکے کھڑا تھا اور جس راستہ پر وہ چل رہے تھے اُسے

اُس نے جذبات کی گلکاریوں سے ایسا فریب نظر بنا دیا تھا کہ وہ دیکھ ہی نہیں۔ کہتے تھے کہ ان حسین و دل فریب پھول کی کاریوں کے نیچے ہلاکت و بربادی کے کتنے بڑے ہولناک غار ہیں، حالانکہ وہ مستبصرین تھے،

آنکھیں رکھتے تھے، صاحب دانش و بینش تھے۔ قرآن نے اس مقام پر عقل و بصیرت اور ”شیطنیت“ کے تقابل سے نگاہ کا رخ ایک عظیم حقیقت کی طرف پھیر دیا ہے۔ ”شیطنیت“ کے معنی ہیں ان جذبات کی غلامی جو وحی کے تابع نہ چلیں۔ اگر انسان پر یہ جذبات غالب آجائیں تو اس کی عقل اسے کبھی صحیح راستہ پر نہیں لاسکتی، بلکہ (جیسا کہ کتاب ”ابلیس و آدم“ باب وحی میں یہ تفصیل بتایا جا چکا ہے) عقل تو ان جذبات کی لونڈی بن جاتی ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں اس کے لئے اسباب و ذرائع بھی بہم پہنچاتی ہے اور اس کے جواز میں دلائل بھی تراشتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ قومیں جو وحی کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں زندگی کا سفر طے نہیں کرتیں ”متبصرین“ ہونے کے باوجود، بربادی کے جہنم میں جا گرتی ہیں۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی طرف قرآن نے قوم ہود کے ”متبصرین“ کے تبصرہ سے نگاہ کا رخ پھیرا ہے۔ سورۃ احقاف میں انہی ”متبصرین“ کے متعلق ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّهُمْ فِيمَا إِنْ مَكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَ أَبْصَارًا
وَأَفْئِدَةً نَّصَهُ فَمَا أَغْنَى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا
أَفْئِدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ كَالْبَالِيتِ الَّذِينَ وَحَاقَ بِهِمْ
فَا كَاذِبًا يَسْتَهْزِءُونَ ۝ (۲۶/۲۶)

اور ہم نے انہیں وہ قوت و سطوت بخشی تھی جو ہم نے زمین میں تمہیں بھی نہیں بخشی اور انہیں (سننے کے لئے) کان، (دیکھنے کے لئے) آنکھیں اور (سمجھنے کے لئے) دل (عقل و شعور) عطا کئے تھے مگر جب انہوں نے قوانین خداوندی سے منہ اور سرکشی کی روش اختیار کی تو ان کے کان آنکھیں اور دل کچھ بھی کام نہ آسکے اور (بالآخر) جس عذاب کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے ان پر نازل ہو کر رہا۔ غور کیجئے۔ سمع و بصر و قلب، علم و عقل کے ذرائع سب موجود ہیں لیکن وحی کی روشنی سے منہ موڑنے کی وجہ سے وہی کیفیت ہو چکی ہے جو آج متبصرین مغرب کی ہے جن کی دُور بینیں مرتخ تک کے احوال و کیفیات کا پتہ تو لے آتی ہیں لیکن تباہی و بربادی کا جو سلاب ان کے دروازوں سے ٹکرا رہا ہوتا ہے وہ کسی کو نظر نہیں آتا اور جب کوئی ”دیدہ ور“ ان سے کہتا ہے کہ

خبر ملی ہے فدا یاں بجز ویر سے مجھے
فرنگ رہگذر سیل بے پناہ میں ہے
(اقبال)

تو یہ لوگ اُس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ اس روشنی کے زمانہ میں یہ ”دقیانوسی خیالات“ کا مبلغ کہاں سے آگیا؟ جب حضرت ہود نے ان مکذبین سے کہا کہ:-

إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۱۳۵)

میں تم پر بڑے دن کے عذاب سے ڈراتا ہوں۔

تو اس کا جواب کیا ملا؟

قَالُوا سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَوَعَظْتَ أَمْ لَمْ تَكُنْ مِنَ الْوَاعِظِينَ ۗ إِنَّ هَذَا إِلَّا رَجُلٌ أَخْلَقَ الْأَوَّلِينَ ۗ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ۗ (۱۳۶-۱۳۸/۲۶)

انہوں نے جواب دیا، اتنے ہود! خواہ تو ہمیں نصیحت کرے یا نصیحت کرنے والوں میں سے نہ بنے ہم پر سب برابر ہے (ہم تیری نصیحتوں سے کوئی اثر لینے والے نہیں) یہ تو ہمیشہ سے قیام کی (خیالات کے) لوگوں کی عادت رہی ہے (کہ خواہ مخواہ لوگوں کو ڈراتے رہا کرتے ہیں) ہمیں کوئی عذاب نہیں دیا جائے گا۔

تذیر | وہ بار بار ایک ناصح امین کی طرح انہیں ان کے اعمال کے عواقب و انجام سے آگاہ کرتے تھے لیکن وہ ہر بار یہی کہتے تھے کہ

قَاتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ (۱۴۰/۲۲ نیز ۱۴۱/۲۶)

اس کے جواب میں حضرت ہود فرماتے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں

حقیقت ہے! نہیں میرے تخیل کی یہ خلاق

قَالَ قَدْ وَتَعَمَّ عَلَيْكُمْ ۗ وَمَنْ ذَرَبُكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ ۗ (۱۴۱/۲۶)

ہوونے کہا، یقین کرو، تمہارے پورے دگار کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب نازل ہو چکا ہے (تمہاری آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں کہ تمہیں اس کے آثار دکھائی نہیں دیتے)۔

وہ پوچھتے ہیں کہ یہ عذاب کب آئے گا؟ ارشاد ہوتا کہ

قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ يُرْسِلُ مَا يُرْسِلُ بِهِ وَلَكِنِّي

أَرْسَلْتُكُمْ قَوْمًا يَجْهَلُونَ ۝ (۱۴۲/۲۳)

اس کا علم تو صرف خدا ہی کے پاس ہے کہ یہ کب دارو ہوگا۔ (میرا کام صرف یہ ہے کہ) جو ہدایت

دے کر مجھے بھیجا گیا ہے وہ تم تک پہنچا دیتا ہوں۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک ایسی قوم ہو جو جہالت کی باتیں کرتی رہتی ہے۔

اوپر چھے، ہتھیار | جب مجادلہ و مباحثہ سے کام نہ چلا تو قوم ان حربوں کو لے کر مقابلہ میں آگئی جو ارباب مبصر ہو، وہ بھلا اس تخویف و ترہیب سے کس طرح گھبراتے؟ حضرت ہود نے فرمایا۔

..... فَاَلَيْسَ لِي بِهٰذَا قَوْمٌ فَاجٍ ۝ فَكَيْفَ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا وَمَنْ لَمْ يَحْمِلِ الْعَذَابَ لَمْ يُؤْمِنْ ۝ اِنَّ رَبِّي عَلٰی

كُلِّ شَيْءٍ حٰفِظٌ ۝ (۵۵-۵۷/۱۱)

تم سب میرے خلاف مل کر جو کچھ تدبیریں کر سکتے ہو ضرور کرو اور مجھے (ذرا بھی) ہمت نہ دو۔ (پھر دیکھ لو، نتیجہ کیا نکلتا ہے؟) میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ کوئی حرکت کرنے والی شے نہیں کہ اس کے قبضہ سے باہر ہو۔ میرا پروردگار (حق و عدل کی) سیدھی راہ پر ہے (یعنی اس کی راہ ظلم کی راہ نہیں ہو سکتی) پھر اگر (اس پر بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لئے میں بھیجا گیا تھا وہ میں نے پہنچا دی (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے) اور (مجھے تو نظر آ رہا ہے کہ) میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دیدے گا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہ سکو گے۔ یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگرانِ حال ہے۔

ظہورِ نتائج کا وقت | حجت کا اتمام ہو گیا۔ قانونِ مکافات کے مطابق وہ وقت آپہنچا جب اعمال کی کھیتی پک جاتی اور اس کے نتائج نمودار ہو جاتے ہیں۔

فَلَمَّا رَاۤهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلًا اُوۡدِيۡتِهِمْ كَذٰلِكَ نَجْزِي

الْقَوْمَ الْاَلۡفُرۡعِيۡنَ ۝ (۲۴-۲۵/۴۶) ذ (۱۵-۱۶/۴۱)۔

پھر جب انہوں نے (آئے والی تباہی کو) ایک بادل کی شکل میں اپنی وادیوں کا رخ کرتے ہوئے دیکھا تو (خوش ہو کر) کہنے لگے یہ تو ہم پر برسنے والا بادل ہے (ان کے اعمال کے نتائج نے جواب میں کہا) "نہیں۔ یہ برسے والا بادل نہیں!" بلکہ یہ وہی عذابِ الہی ہے جس کی تم جلدی کیا کرتے تھے۔ یہ تو آندھی ہے جس میں ایک بہت دردناک عذاب ہے جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر

چیز کو تباہ کر ڈالے گی۔ چنانچہ اسی ہوا کہ وہ ایسے (برباد ہو کر) رہ گئے کہ ان کے مکانات کے کھنڈروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ (دیکھو) مجرم قوموں کو ہم ان کے اعمال کا بدلہ اس طرح دیا کرتے ہیں۔

وہی باد تند و تیز (آندھی اور جھکڑ) جس سے ریت کے تودے بستیاں اور آبادیوں کو قبرستانوں میں منتقل کر دیتے ہیں! اسی کو دوسری جگہ الرّیّم العقیّم کہا گیا ہے۔ (۵۱/۴۱)

آندھی کا یہ طوفان مسلسل آٹھ دن اور سات راتوں تک جاری رہا (۶۱-۴۹/۷) اور اس طرح وہ قوم جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر نشانات نصب کرتی، بڑے بڑے ستونوں پر عمارت اور اپنے سے بڑھ کر کسی کو طاقت ورنہ سمجھتی تھی، ایک آندھی (CYCLONE) کا مقابلہ نہ کر سکی اور ہلاک ہو گئی (۱۳۹-۲۴/۱۳۰) اس طرح ہلاک کہ ان کی جڑ تک کٹ گئی۔

وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَ مَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ ۝ (۷۱/۷۲)

اور جنہوں نے ہمارے قانون کو جھٹلایا تھا، ہم نے ان کی بیخ و بنیاد تک اکھاڑ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی ایمان لانے والے نہیں تھے۔

وہ حال اور مستقبل دونوں میں زندگی کی خوشگواہیوں سے محروم ہو گئے۔

وَ تِلْكَ عَادٌ تَفَكَّهُ بِحَيٍّ ذَا بَايَاتٍ رَبِّهِمْ.... أَلَوْ بَعْدًا لَعَادِ قَوْمٍ هُوَ ۝ (۵۹-۱۱/۴۰)

یہ ہے سرگذشت عاد کی۔ انہوں نے اپنے پروردگار کے قوانین (ہٹ دھرمی اور سرکشی کرتے ہوئے) جھٹلائے اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر متکبر و سرکش کے حکم کی پیروی کی اور ایسا ہوا کہ دنیا میں بھی زندگی کی خوشگواہیوں سے محروم ہو گئے اور قیامت کے دن بھی۔ تو سن رکھو کہ قوم عاد نے اپنے پروردگار کے قوانین سے انکار کیا اور سن رکھو کہ عاد کے لئے اپنی محرومی کا اعلان ہوا جو ہود کی قوم تھی!

یہ قوم دنیا سے نیست و نابود ہو گئی اور جس طرح حضرت ہود نے انہیں پہلے سے آگاہ کر رکھا تھا ان کی جگہ دوسری قوم نے لے لی کہ مکانات عمل کی رُو سے استبدال و استخلاف قومی (ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کا آجانا) خدا کا اٹل قانون ہے۔ (۱۱/۵۷)

حضرت ہود کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس کا علم دے دیا تھا (جس طرح حضرت نوح کو طوفان کا پیشتر علم دے دیا گیا تھا) اور وہ اس سے بار بار قوم کو آگاہ کرتے تھے لیکن جماعتِ مومنین بچالی گئی انہوں نے تو فیصلہ ہی یہ کر رکھا تھا کہ جو کچھ حضرت ہود کہیں اُسے جھوٹا سمجھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس کا یقین نہ کیا اور تباہ و برباد ہو گئے اور حضرت ہود اور ان کے متبعین اس تباہی سے محفوظ رہے (۱۱/۵۸ نیز ۶/۶۲)۔ ان باقیاتِ صالحات سے جو قوم آگے بڑھی اسے عادِ ثانیہ کہا گیا اور جو تباہ کر دی گئی اسے عادِ اولیٰ۔

وَأَمَّا أَهْلُكَ عَادَ بِنِ الْاُولٰٓئِ ۝ (۵۳/۵۱)

اور (دیکھو) بلاشبہ (تمہارا پروردگار) وہی تو ہے جس نے عادِ اولیٰ کو ہلاک و برباد کر دیا۔

نگہ بازگشت قومِ عاد کے اس سانحہٴ عبرت آموز پر نگہ بازگشت ڈالنے اور دیکھنے کہ اس میں بعض خصوصیتیں کس قدر نمایاں طور پر ابھر کر سطح پر نظر آرہی ہیں۔ قوم، قوت و دولت اور حکومت و سلطنت کی مالک ہے اور اسے اللہ کا فضل و احسان قرار دیا گیا ہے۔ وہ عدل و انصاف کو چھوڑ کر سرکشی و تمرد پر اتر آتی ہے تو ان سے کہا جاتا ہے کہ یاد رکھو! اس روش کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے اور کچھ نہیں لیکن اگر تم اپنی روش کی اصلاح کرو اور اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کے تابع لے آؤ تو وہ تمہاری قوتوں کو اور بڑھاتا جائے گا (رَبِّدْكُمْ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِكُمْ) وہ نہیں مانتی تو اس پر ایک رسوا کن عذاب نازل کیا جاتا ہے لَنْذِقْنَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى) اس سے صاف ظاہر ہے **محکومی و رسوائی خدا کا عذاب ہے** کہ قوانینِ خداوندی کے ماتحت عزت و شوکت، حکومت و سطوت، قوت و ثروت اللہ کے انعامات ہیں اور ذلت و

رسوائی کی زندگی عذابِ خداوندی ہے۔

پھر اس قوم کو یہ احسان بھی یاد دلایا گیا کہ اسے قومِ نوح کا جانشین بنایا گیا تھا (۴/۶۹) اور جب اُس نے پیغاماتِ خداوندی سے سرکشی اختیار کی تو اس سے کہہ دیا گیا کہ یاد رکھو! اللہ تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئیگا (۱۱/۵۷)۔ لہذا ظاہر ہے کہ یہ اللہ کا عذاب ہے کہ کسی قوم کی شوکت و حشمت کی وارث کوئی دوسری قوم بنا دی جائے۔

سخس | قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ دن بڑا "مخوس" تھا جب اُن پر اللہ کا عذاب طاری ہوا۔
 فَارْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَوَّارًا فِي أَيَّامِ نَحْسَاتٍ
 وَهُمْ لَا يُنصِرُونَ ۝ (۴۱/۱۶)؛ (۵۴/۱۹)۔

پھر ہم نے دیوبی زندگی میں ذلت و رسوائی کا عذاب چکھانے کے لئے چند مخوس دنوں میں اُن پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور (یہ تو کچھ بھی نہیں ہے) بلاشبہ آخرت کا عذاب زیادہ رسوا کن ہوگا اور وہ (وہاں کسی قسم کی امداد نہیں کئے جائیں گے۔

اس کو قرآن کریم نے ایک بڑا دن (عَذَابٌ عَظِيمٌ) بھی کہا ہے (۴۶/۲۱؛ ۲۶/۱۳۵)۔ اس سے معلوم ہوا کہ سعد و سخس کا تعلق آسمان کے ستاروں سے نہیں بلکہ جب کسی کے بُرے اعمال کے نتائج مرتب ہونے کا وقت آجائے تو وہ گھڑی اس کے لئے سخس ہے۔ لہذا سعادت و خوشی خود انسان کے اپنے اعمال کے نتائج کا نام ہے ستاروں کی گردش کا نام نہیں۔ ستارے تو انسان کے لئے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔ سو جو خود محکوم و مسخر ہو وہ دوسرے کے مقدرات کی تبدیلیوں پر کیا اختیار رکھ سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے

کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

یہ ہے اس قومِ عاد کی عبرت انگیز داستان جس کے متعلق کہا کہ جاؤ دیکھو، ان کے اُجڑے ہوئے ماسکن ہیں تمہارے لئے کون کون سے سامانِ بصیرت مدفون ہیں۔

وَ عَادًا وَ ثَمُودًا وَ قَدْ تَبَيَّنَ لَكُمْ مِنْ مَسَاكِينِهِمْ قَفْ (۲۹/۲۸)

اور دیکھو، پھر ایسا ہوا کہ تمہارے پروردگار نے (عاد اور ثمود کو ہلاک کیا اور یہ بات) یعنی ان کی

تباہی) تمہارے لئے ان کی آبادیوں سے ظاہر ہو گئی ہے۔

جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے، اثری انکشافات ان زمین دوز بستیوں سے نقاب اٹھاتے چلے جا رہے ہیں جن کے نیچے سے مٹی ہوئی عظمتوں اور لٹی ہوئی سلطنتوں کے نقوش یوں نمودار ہو رہے ہیں جیسے کوئی آنکھیں ملتا ہوا نیند سے اُٹھ بیٹھے جس قوم کے سینے میں دل اور نگاہوں میں بصیرت ہے اس کے لئے ان دیرانوں کی ٹھیکریاں، عروج و زوالِ اُمم کی ہزاروں خاموش داستاںیں اپنے اندر رکھتی ہیں۔ فَهَلْ مِنْكُمْ كَاتِبٌ (۵۴/۳۲) کیا کوئی ہے جو ان سے عبرت حاصل کرے!

لقمان (حکیم)

حضرت ہوڈ کے بعد ترتیب کے لحاظ سے حضرت صالح (قوم ثمود) کا تذکرہ آنا چاہیے لیکن قرآن کریم نے ان دونوں کے درمیان ایک ایسی ہستی کا ذکر کیا ہے جو اگرچہ بالتصریح حضرات انبیائے کرام کے زمرہ میں شامل نہیں لیکن اس کی تعلیم کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ہوڈ مع اپنے متبعین کے اپنی برباد ہونے والی قوم کے دیار و مسکن سے نکل کر حجاز کی جانب آگئے تھے اور اسی علاقہ میں ان کی نسل (عادِ ثانیہ) بڑھی اور پھیلی۔ ان میں ایک نیک سیرت حکمران گذرا ہے جسے لقمان کہا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمران حضرت ہوڈ کی شریعت کا متبع تھا اور اپنی حکمت و دانائی کے لحاظ سے حکیم لقمان کے نام سے مشہور تھا۔ ایک قدیمی کتبہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔ یہی لقمان ہیں جن کا ذکر قرآن کریم نے خصوصیت سے کیا ہے۔ اس ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جب انسانی عقل و بصیرت، وحی کی روشنی میں، فیصلے کرتی ہے تو وہ فیصلے کس قدر صاف، واضح اور انسان کو سلامتی کے راستوں پر لے جانے والے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا نظام ہی یہ ہے کہ وحی کے غیر تبدیل اصولوں کی روشنی میں، اپنے معاملات کے فیصلے عقل و فکر کی رو سے کئے جائیں۔ اقبال کے الفاظ میں عقل و وحی، علم و عشق، ذکر و فکر، خیر و نظر، خرد و جنوں کا یہی وہ حسین امتزاج ہے، جو اسلام کا طرہ امتیاز ہے۔ قرآن نے اسی مقصد کے پیش نظر لقمان کی حکمت آموز باتوں کا ذکر کیا ہے۔ سورۃ لقمان میں ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنْ اشْكُرْ لِلَّهِ ۖ وَ مَنْ يَشْكُرْ
فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۗ وَ مَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ
حَمِيدٌ ۝ (۳۱/۱۲)

ادہم نے لقمان کو حکمت و دانائی عطا فرمائی تھی اور کہا تھا کہ وہ اس حکمت کی روشنی میں مصروف

عمل رہے تاکہ اس کی مساعی بھر پور نتائیج کی حامل ہوں۔ یاد رکھو! جو اس طرح کوشش کرتا ہے اس کی کوشش کے نتائج خود اس کی اپنی ذات کے لئے ہوتے ہیں اور نہ اللہ ان باتوں سے بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے حضرات انبیائے کرام کے ضمن میں بھی فرمایا ہے کہ انھیں "کتاب و حکمت" عطا کی گئی تھی اور حکمت بھی اسی طرح منزل من اللہ تھی جس طرح کتاب وہاں کتاب سے ضابطہ خداوندی مرتب ہوتا ہے اور حکمت سے ان قوانین کی غایت و مقصود۔ یہاں کہا گیا ہے کہ لقمان کو حکمت دی گئی تھی۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ اس حکمت سے مراد انسانی فراست نہیں، بلکہ وحی الہی ہے۔ لیکن چونکہ قرآن میں کسی جگہ لقمان کا نام انبیاء کے زمرہ میں نہیں آیا اس لئے خیال اس طرف جاتا ہے کہ اس سے مراد انسانی فراست ہی ہے، وہ وحی نہیں جو انبیاء سے مخصوص ہوتی تھی۔

اس سے آگے ہے:

وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ ۗ
إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۝ (۳۱/۱۳)

اور (یاد کرو) جب لقمان نے اپنے بیٹے سے اُسے نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ بر خود اراد خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ بلاشبہ شرک کرنا بڑا ہی ظلم ہے۔

ظلم عظیم ہے | شرک کو ظلم عظیم کہہ کر ایک عظیم حقیقت کو دو لفظوں میں سمو دیا گیا ہے۔ ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس جگہ رکھنا جہاں اسے بیجا نہیں چاہیے۔ کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ اب اس سے بڑھ کر بے عمل بات اور کونسی ہو سکتی ہے کہ انسان مخلوق کو خود خالق کا مقام دے دے (تشریح اپنے مقام پر آئے گی)۔ اس کے بعد اُس علام الغیوب کے متعلق فرمایا۔

يُبَيِّنُ لَهَا إِنْ تَكُ مِنْ ثِقَالِ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ
أَوْ فِي سَمَوَاتٍ أَوْ فِي أَرْضٍ يَأْتِي بِهَا اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ ۝ (۳۱/۱۶)

اور دیکھو، لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا (یاد رکھو) بلاشبہ اعمال (کسی کے بھی ہوں) اگر ایک رات کے دلنے کے برابر بھی ہوں۔ پھر وہ کسی پتھر کی چٹان میں (رکھ دیتے گئے) ہوں یا آسمانوں کے اندر یا زمین کے اندر ہوں، خدا ان کے نتائج کو ضرور مرتب کر دے گا۔ بلاشبہ خدا بڑا باریک بین اور خبردار ہے۔

دیکھتے! اس مخلوق اور خالق کا فرق کیسا نمایاں طور پر سامنے آ گیا؟ اس قسم کا علم سوائے لطیف و خبیر کے اور کسے ہو سکتا ہے؟ پھر احکامات کی طرف توجہ دلائی کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاَصِلُوْا
عَلٰى مَا اَصَابَكُمْ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (۳۱/۱۷)

پھر کہا، اے میرے بیٹے! صلوٰۃ کو قائم رکھنا اور معروف کا (لوگوں کو) حکم دینا اور منکر سے روکنا اور جو کچھ (مشکل یا مصیبت) تمہیں پیش آئے اس پر ثابت قدم رہنا۔ بلاشبہ یہ باتیں بہت ہی اہم باتیں ہیں۔

نظام صلوٰۃ کی پابندی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی میں انفرادی اور اجتماعی نشوونما کی دونوں صورتیں سامنے آگئیں۔ ایک خدا شناس کے لئے اس سے بڑا جوہر اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ خود اللہ کے قوانین کے سامنے جھکے اور ملک میں قوانین الہیہ کی ترویج کرے؟ اسی کا نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور جب کوئی مصیبت آجاتے تو اس وقت پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پاتے بلکہ قانون خداوندی کی تائید و نصرت کے محور سے پروردانہ وار اس کا مقابلہ کرے کہ یہ فی الواقع بڑی بات ہے۔ اس کے بعد معاشرتی اصلاح کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا کہ

وَاَوْ تَصْعَقُ حَدٰٓكَ لِلنَّاسِ وَاَوْ تَمْسُقَ فِي الْاَرْضِ مَرْحٰٓا ۙ اِنَّ
اٰتِیَةَ لَا یَحِیْبُ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ وَاَقْصِدْ فِی مَشِیْكَ وَاغْضُضْ
مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْتُمْ اِلَّا صَوٰتٌ لِّصَوْتِ الْحَبِیْرِ ۝

(۱۸-۳۱/۱۹)

اور کہا لوگوں سے (مغزورانہ طریقہ پر) مُنہ نہ موڑنا اور نہ ہی زمین پر اکڑ کر چلنا۔ بلاشبہ خدا کسی مغزور اور متعجب کو پسند نہیں فرماتا اور اپنی رفتار میں میانہ روی (اعتدال قائم) رکھنا اور آواز کو (بھی

نرم اور پست رکھنا۔ بلاشبہ آوازوں میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت آواز گدھے کی آواز ہے

(جو بہت اونچی اور بہت سخت ہوتی ہے۔ آواز کی اس بلندی اور سختی سے بچنا چاہیے۔)

خود فرمائیے، ایک شاہنشاہ کا کو کس طرح حسنِ اخلاق اور فروتنی کی نصیحت کی جا رہی ہے؟

متذکرہ صدرِ نصاب پر ایک مرتبہ پھر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان چند ٹکڑوں میں تطہیرِ فکر و نظر، منصبِ حکومت اور اصلاحِ معاشرہ کے مختلف گوشوں کو کس طرح جامع طور پر یکجا کر دیا گیا ہے؟ جنابِ لقمان کا ذکر چونکہ سلسلہٴ انبیائے عظام میں نہیں کیا گیا اس لئے ہم انہیں رسول قرار نہیں دے سکتے۔ لیکن اس تعلیم کے متعلق واضح ہے کہ شمعِ نبوت سے اکتسابِ ضیا کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہوش کی تعلیم اُس وقت تک ہنوز اپنی اصلی شکل میں موجود تھی اور جب اس تعلیم کو قرآنِ کریم کی بھی سند مل جائے تو اس کی صحت و عظمت میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔

یہ ہیں وہ لقمان جو آج حکمت و دانائی اور دانش و بینش میں زبانِ زدِ خلائق ہیں۔ جب کسی کے

پاس آسانیِ قنیل ہو تو اس کے ذریعہ بصیرت کی کرنیں کیوں نہ دنیا بھر میں پھیل جائیں؟

گرچہ خوردیم نسبت ایست بزرگ

ذرة آفتاب سامانیم

خلاصہٴ بحث قومِ نوح کی بربادی کے بعد، بنیِ سام کی پہلی ترقی، قومِ عاد سے ہوئی جن کا مکنِ احتاف کا علاقہ تھا۔ اس قوم کو قوت و حمت اور دولت و ثروت کی فراوانی

عطا ہوئی تھی۔ انہی کو عادِ آرم یا ذاتِ العمد بھی کہتے ہیں۔ یہ پہاڑوں کے اوپر بڑے مشید قلعے اور اونچے اونچے نشانات تعمیر کرتے تھے۔ دولت و حمت کے ساتھ انہیں دانش و بینش بھی عطا ہوئی تھی لیکن چونکہ یہ چیزیں ضابطہٴ خداوندی کے تابع نہ تھیں اس لئے ان کے نتائج امن و اصلاح کے بجائے ظلم و فساد کی صورت میں سامنے آتے تھے۔ ان کے نظامِ زندگی کو صحیح خطوط پر متشکل کرنے کے لئے ان کی طرف حضرت ہوشی مبعوث ہوئے، انہوں نے آکر وہی انقلابِ انگیز دعوت پیش کی جو وحیِ آسمانی کا مقصدِ اولیٰ ہے، یعنی سرکش و متکبر طاغوتی نمائندوں کے ہاتھوں سے قوت و اقتدار اور زرق کے سرچشمے چھین کر خدا کے نظامِ ربوبیت کے تابع لے آنا۔ ظاہر ہے کہ اس سے ایک طرف سردارانِ قوم کے

غلبہ و استیلا پر زد پڑتی تھی اور دوسری طرف دنیائے مذہب کے ازکیاب قن دُونِ اِله کی تقدس و عقیدت کی مندریں چھنتی تھیں۔ اس لئے ان دونوں کی طرف سے مخالفت یقینی تھی، ارباب حکومت نے تمسخر و استہزار اور ترہیب و تحریف سے کام لیا اور مذہب کے خود ساختہ علمبرداروں نے یہ کہہ کر عوام کو مشتعل کیا کہ دیکھو! یہ نئی تعلیم تمہارے آباء و اجداد کے مسلک کے خلاف ہے اور اس داعی انقلاب کا مسلک یہ ہے کہ تمہیں تمہارے اسلاف کی روش سے بیگانہ بنا دے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ لوگ علم و عقل بھی رکھتے تھے لیکن جب علم و عقل جذبات کے تابع آجائیں تو نہ وہ علم، علم رہتا ہے اور نہ وہ عقل، عقل بلکہ اس وقت ان دونوں کا فریضہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ جذباتی مقاصد کے بروئے کار لانے کے ذرائع بن جائیں چنانچہ یہی اس قوم کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے عقل و ہوش سے سوچا ہی نہیں کہ ہمیں ہلاکت و بربادی کے کیسے عمیق و ہیبت جہنم سے بچا کر امن و عافیت کی جنت کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔ انہوں نے مخالفت کی اور جی بھر کر مخالفت کی۔ حضرت ہوؤ نے امکان بھر کوشش کی کہ وہ اپنے نظام حیات کو نظام خداوندی کے صحیح خطوط پر لے آئیں۔ لیکن چونکہ اس سے ان کی ہوسِ نخونِ آشامی کی تسکین نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے انہوں نے اس دعوت کی طرف کان ہی نہ دھرا۔ چنانچہ ان کے جرائم سنگین سے سنگین تر ہوتے گئے اور جب قانونِ مکافات نے اندازہ کر لیا کہ انکا سؤلا علاج ہو چکا ہے اور اس کا زہر جسدِ انسانی کے صالح حصہ کے لئے بھی ہلاکت آفریں بنتا جا رہا ہے تو اس اہل قانون کے مطابق یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ اس زہر آلود حصہ کو کاٹ کر الگ پھینک دینا ہی ضروری ہے۔ چنانچہ ان پر تباہی کا عذاب آیا اور آمدھی کے ایک قیامت خیز طوفان نے ان بستیوں کو دفن بنا دیا اور اس کے بعد دنیا میں صرف ان کے افسانے باقی رہ گئے۔

طبعی حوادث کا اقوام کی تباہی سے کیا تعلق ہے، اس کے متعلق حضرت نوح کے تذکرہ میں لکھا جا چکا ہے۔

قوم عاد کے سلسلہ میں قرآن کریم نے ایک مرد دانشمند و نیک سیرت (لقمان) کا بھی ذکر کیا ہے جو غالباً حضرت ہود کی شریعت کے مشیع تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے جو نصیحتیں کی ہیں، چونکہ وہ ابدی حقائق پر مبنی ہیں، اس لئے قرآن کریم نے انہیں اپنے دامنِ حفاظت میں جگہ دے کر بقائے دوام عطا کر دی ہے۔ لقمان (حکیم) کی تاریخی حیثیت ابھی تک متیقن کے ساتھ متعین نہیں ہو سکی۔ آنے والے زمانہ کے انکشافات اس فریضہ کو بھی ادا کر دیں گے، ہم لے ان کا جو زمانہ متعین کیا ہے وہ قیاسی ہے اور بعض ایسی روایات پر مبنی جو دوسری

روایات سے زیادہ قابل اعتماد معلوم ہوتی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ حضرت ایوبؑ کے بھانجے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور ایک ہزار سال تک زندہ رہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ ایک حبشی غلام تھے۔ مستشرقین بھی اس باب میں کوئی یقینی رائے نہیں رکھتے۔ سیل کا خیال ہے کہ یہ ایونانی ایساپ (AESOP) سے الگ کوئی اور شخصیت نہیں۔ DR. SPRANGER کا خیال ہے کہ یہ ایونانی افسانوی ALKAI ہی کا دوسرا نام ہے۔ HITTI اپنی تاریخ عرب میں اسی خیال کا حامل نظر آتا ہے۔ تورات کی کتاب الامثال میں یاقہ کے بیٹے اجور (امثال ۳۰/۱) اور لوایل بادشاہ (امثال ۳۱/۱) کی حکمت کی باتیں، عرب کے لقمان کی نصاب سے ملتی جلتی ہیں۔ اس قیاس کے مطابق جناب لقمان کو بنی اسمعیل میں سے ہونا چاہیے۔ غرضیکہ کثرتِ تعبیر سے یہ خواب ابھی تک پریشان ہے۔ اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اس کا حل آنے والے زمانہ کے انکشافات کا منتظر۔ قرآن کریم، تاریخ کی کتاب نہیں۔ اس لئے اس نے لقمان کی تذکیر و مواعظت سے بحث کی ہے حسب و نسب اور مقام و زمان سے نہیں اور یہیں تک ہمیں بھی اپنے آپ کو محدود رکھنا چاہیے۔



فَتِلْكَ بَيِّنَاتٌ لِّقَوْمٍ
 (۲۷/۵۲)

قوم نمود
 حضرت صالح

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

حضرت صالح علیہ السلام

قوم ثمود

اُمّ سامیہ میں سے جن قبائل نے اندرون عرب میں حکومتیں قائم کیں ان میں سب سے مشہور قبیلہ (بلکہ قوم) ثمود کا تھا۔ ان کی ترقی کا زمانہ عاَدِ اُولٰٓئِکَ کے بعد کا ہے۔ یہ قوم عرب کے شمال مغربی حصہ پر حکمران تھی جسے وادیِ قرشی کہتے تھے، حجران کا دار الحکومت تھا جو اس قدیم راستہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا ہے۔ وادیِ قرشی کے گرد و پیش کا میدان بڑا سرسبز و شاداب ہے لیکن آتش فشاں مادہ سے لبریز۔ قرآن کریم نے اس قوم کو عاَد کا جانشین بتایا ہے۔

وَإِذْ كَرِهْنَا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنَّا بَعْدَ عَادٍ وَكَوَّأْنَا كُرًّا فِي الْأَرْضِ
فَتَخَذُوا مِنْ سُهُولِهَا مَقُورًا وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا ۖ فَادَّكَّرُوا
الْآءَ اللَّهُ وَكَرِهْنَا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ (۷/۷۴)

اس حقیقت کو پیش نظر رکھو کہ خدا نے ہمیں قوم عاد کے بعد اس کا جانشین بنایا اور اس سرزمین میں اس طرح بسا دیا کہ میدانوں سے محل بنانے کا کام لیتے ہو اور پہاڑوں کو بھی تراش کر اپنا گھر بنا لیتے ہو۔ پس اللہ کی قدرتوں کو یاد کرو اور ملک میں سرکشی کرتے ہوئے، خرابی

نہ پھیلاؤ۔

حضرت موسیٰ کے زمانہ سے پیشتر ان کی تباہی ہو چکی تھی کیونکہ دربار فرعون کا مرد مومن اپنی قوم سے کہتا ہے کہ اگر تم اپنی بد کرداریوں سے باز نہ آئے تو تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو قوم نوح و عاد و ثمود کا ہوا تھا (۴۰/۳۲-۳۰)۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس قوم کا زمانہ قریب اڑھائی ہزار ق.م سے لے کر ۱۶۰۰ ق.م تک کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر اپنی نوازشات کی گہری باری فرما رکھی تھی۔ انہیں ممکن فی الارض کیا تھا (۴۱/۶)۔ قوم عاد کی طرح یہ لوگ بھی میدانوں میں رفیع دو وسیع محلات تعمیر کرتے تھے اور پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتے جو فین سنگ تراشی کے نمونے تھے (۴۱/۶، ۸۲/۱۵)۔ پُرُفُصَا بَاغَاتٍ، لِبٰہِلَاتِی کَہِیْتِیَا، صَافٌ وَشَقَافٌ اُجَلِّتے ہوئے چشمتے (۱۳۶۱-۲۶/۱۳۶)۔

وادئ قشری میں سنگین عمارات۔

دولت و سطوت | وَ تَمُودَ الَّذِیْنَ جَاءُوا الصَّخْرَ بِالْاِوَادِ (۸۹/۹)

اور (کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے پروردگار نے) قوم ثمود کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ (کون سی قوم ثمود) وہی جنہوں نے پہاڑوں کے دامنوں میں بڑی بڑی چٹانوں کو تراشا اور مکانات بلکہ قلعے بنائے تھے۔

قومی اکثریت اور جنود و عساکر۔

هَلْ اَشْكُ حَدِيثُ الْجُنُودِ لَا فِرْعَوْنَ وَ تَمُودَ (۸۵/۱۸-۱۷)

(اور اے پیغمبر اسلام! تمہیں لشکروں (جنود و عساکر) کی خبر بھی پہنچی (یا نہیں؟) کونسے جنود و عساکر؟) فرعون اور قوم ثمود کے جنود و عساکر کی!

یہ تھی وہ قوم جن کی طرف خدا کے پیغمبر آتے رہے۔ لیکن انہوں نے اپنی دولت و حشمت، حکومت و قوت کے نشے میں قوانین الہیہ کی تکذیب کی۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ (۸۵/۸۰)

اور (دیکھو) حجر کے لوگوں نے بھی رسول کی بات جھٹلائی۔

یہاں ان کے وارا حکومت کی نسبت سے اصحاب الحجر کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ ان کا نام مذکور ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ۝ (۲۶/۱۴۱)

اور (دیکھو) قوم ثمود نے رسولوں کی بات جھٹلائی۔

سورہ قمر میں ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ (۵۷/۲۳)

(اور دیکھو) قوم ثمود نے (انکار و بد عملی کے بدنتائج سے ڈرانے والوں کی بات جھٹلائی۔

بعثت حضرت صالح | تا آنکہ جب ان کی سرکشی و عدوان حد سے بڑھ گئی اور قانونِ مشیت کے مطابق مہلت کا زمانہ ختم ہونے کو آیا تو ان کی طرف، اسی قبیلہ سے حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے۔

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صَالِحًا ۝ (۲۶/۲۵) نیز (۱۱/۶۱) (۴/۳۱) (۱۱/۱۳۲) (۲۶/۲۵)

اور (دیکھو) ہم نے قوم ثمود کی طرف انہی کے بھائی بند صالحؑ کو مبعوث کیا۔

اس وقت ہر جاہر و مستبد قوم کی طرح اس قوم کی بھی یہ حالت ہو چکی تھی کہ وہ ملک میں فساد برپا کرتے تھے اس لئے ان سے کہا گیا کہ

وَ اذ تَعَثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ (۷/۴۷)

اور ملک میں سرکشی کرتے ہوئے خرابی نہ پھیلاؤ۔

مفسدین کی قوم | اب بابِ حکومت و اقتدار بے حد سرکش و مفسد تھے۔

لہ فساد برپا کرنے سے ہمارا ذہن ڈاکر زنی، قزاقی، بد امنی وغیرہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ لیکن فساد کا قرآنی مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔ اس کے نزدیک ہر وہ نظام جو غیر خداوندی قوانین پر مشتمل ہو، فساد ہے۔ (خواہ اس میں بظاہر کیسا ہی امن کیوں نہ ہو) اور اس کے مقابلہ میں اصلاح صرف اسی نظام کا نام ہے جو قوانینِ خداوندی پر قائم ہو۔ اس مفہوم کو سامنے رکھنے سے فساد اور مفسد کی قرآنی اصطلاحات کے صحیح معنی سمجھ میں آسکیں گے تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر ملے گی۔

وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۚ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ
وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ (۱۵۱-۱۵۲/۲۴)

اور (دیکھو، صالحؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "اے قوم نمود!، حد سے تجاوز کرنے والوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو جو زمین پر فساد برپا کرتے رہتے ہیں اور (کبھی) اصلاح احوال (کا ارادہ بھی) نہیں کرتے۔

جب رزق کی تقسیم قوانین خداوندی کے مطابق نہیں ہوتی تو انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کو فساد فی الارض کہا جاتا ہے، یعنی انسانی معاشرہ کی ناہمواریاں۔ جب یہ ناہمواریاں (قوانین خداوندی کے مطابق) ہمواریوں میں بدل جاتی ہیں تو اسے اصلاح کہا جاتا ہے۔ قوم نمود کے معاشرہ میں اسی قسم کی ناہمواریاں پیدا ہو چکی تھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ دار الحکومت میں تو وزراء تھے جن کے سپرد علاقہ کا انتظام تھا اور چونکہ پورے کا پورا نظام حکومت بگڑ چکا تھا اس لئے یہ سب کے سب منسوخ و مستبد تھے۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ
وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ (۲۸۱/۲۴)

اور شہر میں نو آدمی اس برآوردہ اور ذمہ دار تھے جو (ہمیشہ) ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے اور اصلاح حال (کی تو طرف توجہ ہی) نہیں کرتے تھے۔

ان کا سرغنہ ان سب سے بڑھ کر شقی و بد بخت تھا۔

إِذِ انبَعَثَ أَشْقَاهَا ۖ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ... (۱۲۱-۱۲۲/۹۲)
(اور یاد کرو) جب اُس (قوم) کا بد بخت ترین شخص اُٹھا، تو اللہ کے رسول (صالح) نے ان لوگوں سے کہا.....

ان حالات کے ماتحت بھلا احکام الہیہ کی طرف کون توجہ دیتا؟

وَ اتَيْنَهُمْ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝ (۸۱/۱۵)

اور (دیکھو) ہم نے انہیں اپنے قوانین عطا کئے (مگر انہوں نے اُن سے کوئی نفع نہ اٹھایا)۔ چنانچہ وہ اُن سے روگردانی کر والے ہی رہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ایک نکتہ پر غور کیجئے۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ اس قوم میں فساد عام ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کہتا ہے کہ ان کے مرکزی مقام (دار الحکومت) میں نو سسر برآوردہ ایسے تھے جو درحقیقت اس فساد کے سرچشمہ تھے۔ یہ چیز ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ قوموں میں فساد کا ذمہ دار دراصل اوپر کا طبقہ ہی ہوتا ہے۔ عوام تو ان کے پیچھے چلنے والے ہوتے ہیں۔ جس قسم کا اوپر کا طبقہ اسی قسم کے عوام۔ اگر اوپر کے طبقہ کی اصلاح ہو جائے تو قوم خود بخود اصلاح یافتہ ہو جاتی ہے۔

وہی دعوت انقلاب | یہ تھے وہ حالات جن میں حضرت صالحؑ کی بعثت ہوئی۔ آپ اشرفی لائے اور قوم کو اسی اساسی اور اصولی پیغام خداوندی کی طرف دعوت دی جو آسمانی سلسلہ رشد و ہدایت کی اولین کڑی ہے۔ فرمایا۔

قَالَ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ ۖ (۲۴/۴۳؛ ۲۴/۴۱؛ ۱۱/۷۱)

اُس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! اللہ ہی کی عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی الہ (حاکم اور آقا) نہیں۔

حکومت صرف ایک خدا کی، کسی انسان کی نہیں اور اس حکومت کی عملی تشکیل اس طرح کہ دونوں میں تقویٰ اور مرکز کی اطاعت۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۚ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ

أَمِينٌ ۚ فَأَتَّقُوا اللَّهَ وَآطِيعُوا أَمْرًا (۱۳۲-۱۳۴/۲۴)

اُن سے اُن کے بھائی بند صالح نے کہا کہ ”کیا تم قوامین خداوندی کی نگہداشت نہیں رکھتے؟ یاد رکھو! میں تمہارے لئے خدا کا ایک امانت دار پیغامبر ہوں۔ خدا کے نظام کی حفاظت میں آ جاؤ اور (کیونکہ میں اس نظام کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہوں) میری اطاعت (اور فرمانبرداری) کرو۔“

یعنی مفسدین کی حکومت کی اطاعت مت کرو، بلکہ اطاعت فقط حکومت الہیہ کی کرو۔

فَأَتَّقُوا اللَّهَ وَآطِيعُوا أَمْرًا ۚ وَآطِيعُوا أَمْرًا ۚ (۱۳۲-۱۳۴/۲۴)

يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ (۱۵۰-۱۵۲/۲۶)

پس قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو اور میری (یکجہیت مرکز) اطاعت کرو اور حد سے تجاوز کرنے والوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو، جو (صرف یہی جانتے ہیں کہ) ملک میں فساد برپا کرتے رہتے ہیں اور (کبھی) اصلاح حال (کا ارادہ تک) نہیں کرتے۔

کتنا بڑا اعلان بغاوت اور کیسا نعرہ انقلاب ہے! حقیقت یہ ہے کہ علمبرداران حکومت خداوندی دنیا میں سب سے بڑا انقلاب برپا کرنے کے لئے آتے ہیں۔ دوسرے انقلاب کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک کی حکومت کی جگہ کسی دوسرے کی حکومت قائم کر دی جلتے۔ لیکن آسمانی انقلاب کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حکومت و اقتدار کی کنجیاں انسانوں کے ہاتھ سے چھین کر اقتدار و اختیار کے حقیقی مالک خدا کے لئے ارض و سموات کے سپرد کر دی جائیں۔ اس سے بڑا انقلاب اور کیا ہو سکتا ہے جس میں کسی انسان کو کسی شکل میں، کسی دوسرے انسان پر حکومت کا حق ہی حاصل نہ ہو اور رزق کے معاملہ میں کوئی انسان کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ سب انسان برابر اور ایک خدا کے قانون کے محکوم جو رب الغلین ہے جس کی حکومت میں ظلم و استبداد، سلب و نهب اور غضب حقوق کا امکان ہی نہیں، یہ تھی وہ حکومت جو ہتھیار صحیح قائم کرنا چاہتے تھے، وہ ارباب قوت و سلطنت جن کے چہرے کی سُرخیاں اور حریم ناز کی رنگینیاں انسانی خون کی رہیں منت تھیں، کس طرح اپنے اقتدار و اختیار سے دست کش ہو کر مخلوق خدا کے خدام کی صف میں کھڑے ہو جاتے؟ لہذا فری ہو جو ہوتا چلا آیا ہے اور جو ہوتا چلا جائے گا۔ کمزور و ناتواں اور

ارباب قوت کی طرف سے مخالفت

مظلوم و مقہور انسانوں نے جو انسانی پیرہ دستیوں سے تنگ آپکے تھے، اس دعوت ربانی پر آگے بڑھ کر لبیک کہا اور ارباب دولت و قوت اس کی مخالفت میں صف آرا ہو گئے!

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا
..... اِنَّا بِالَّذِينَ امْنَتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ۝ (۴۵-۴۶/۷)

قوم کے جن سردار اور وہ لوگوں کو (اپنی دولت و طاقت کا گھمنڈ تھا انہوں نے مومنوں سے کہا، یعنی ان لوگوں سے جنہیں ان کی پیرہ دستیوں نے سخت کمزور کر رکھا تھا کہ کیا تم نے سچ بچ کو معلوم کر لیا ہے کہ صالح خدا کا بھیجا ہوا ہے؟ (یعنی ہمیں تو ایسی کوئی بات اس میں کھائی

نہیں دیتی) انہوں نے کہا ہاں بے شک جس پیام حق کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے، ہم اُس پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ اس پر ان سرکش و متمرّد داروں نے کہا، تمہیں جس بات کا یقین ہے، ہمیں اس سے انکار ہے۔

وہ آمادہ پیکار تھے۔ لیکن حضرت صالح ایک ناصح مشفق کی طرح انہیں برابر سمجھاتے چلے جاتے تھے کہ اپنے ہاتھ سے اپنی قبریں نہ کھودو۔ لیکن نشہ حکومت میں ان ناصح کو سنتا کون ہے؟

قَالَ يَقَوْمِ لِمَ تَسْتَجِلُّونَ بِالسِّنَّةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّفْكَتُونَ ۝ (۳۶ - ۳۷/۲۷)

صالح نے کہا کہ اے میری قوم! تم بھلائی (کامیابی و کامرانی) سے پہلے (اُس کے بجائے) برائی (ہلاکت و تباہی) کو کیوں جلدی مانگ رہے ہو؟ تم اللہ کے قوانین کی حفاظت میں کیوں نہیں آجاتے تاکہ تمہاری نشوونما کا سامان بہم پہنچ جائے۔ (اور دونوں جہان کی کامیابیاں تمہارے قدم چومیں) وہ (کم نجات) بولے کہ ہم تو تمہیں اور تمہارے ساتھیوں (ایمان لانے والوں) کو اپنے لئے (مخوس سمجھتے ہیں) کہ تم نے خواہ مخواہ ہماری عیش و عشرت میں کھنڈت ڈال دی (اُس پر صالح نے (جواب میں) کہا کہ تمہاری یہ نحوست خدا کے قانونِ مکافات کی وجہ سے ہے۔ تم وہ لوگ ہو جو (بہت جلد) عذابِ الہی میں مبتلا کئے جاؤ گے!

یہ نتائج و عواقب سے آگاہ کرتے اور وہ (معاذ اللہ) اُن کا مذاق اڑاتے۔ وہ کہتے کہ (خاکِ بدہن) تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے جو اس طرح کی ہلکی ہلکی باتیں کرتے ہو۔

قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَخَّرِينَ ۝ (۳۷/۱۵۳)

انہوں نے کہا کہ (اے صالح!) اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے! انہیں تعجب اس بات پر تھا کہ یہ ایک ہمارے جیسا انسان دعوائے رسالت میں سچا کیسے ہو سکتا ہے؟

مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا جِئْتَنَا بِحُجَّةٍ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ (۳۷/۱۵۴)

انہوں نے کہا کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم ہماری ہی طرح کے ایک انسان ہو (پھر تم رسول

کیسے ہو گئے؟) پس اگر تم سچے ہو تو (اپنے اس دعوے پر کوئی نشانی (معجزہ) لاؤ!

یعنی اسی ساز کہن کی صدائے بازگشت جسے ہم اُمم سابقہ کے احوال و کیفیات میں دیکھ چکے ہیں، یعنی ان سے کہا جاتا تھا کہ میں جس نظام کی طرف دعوت

دیتا ہوں اسے عقل اور فکر کے معیار پر پرکھ کر دیکھو کہ اس میں بھلائیاں ہی بھلائیاں نظر آتی ہیں یا نہیں اور وہ اس کے جواب میں کہتے کہ ہم بھلا اپنے جیسے انسان کو خدا کا رسول کیسے مان لیں۔ اگر تم خدا کے رسول ہو تو ہمیں کوئی معجزہ عقول بات کر کے دکھاؤ۔

فَقَالُوا أَكُفْرًا مِّثْلًا وَاحِدًا نَتَّبِعُهُ لَ إِنَّا إِذَا لَفِئْ ضَلِيلٌ وَ سُعْرٌ (۵۴/۲۳)

تو انہوں نے کہا: کیا ہم ایسے آدمی کا اتباع کریں گے جو ہم ہی میں سے ہے اور اکیلا ہے پھر تو

ہم ایک (بڑی) گمراہی اور پاگل پن میں مبتلا ہوں گے۔

بشر کے ساتھ دلحد کے ٹکڑے پر بھی غور کیجئے۔ چونکہ وہ نشہ قوت میں ہدمت تھے اس لئے یہ کہتے تھے کہ اگر کوئی ایسا شخص ہوتا جس کے ساتھ کوئی بہت بڑی جماعت ہوتی تو اس جماعت کی قوت سے ڈر

کر ہم اس کی بات مان بھی لیتے۔ لیکن اب ہم اس کی بات کیوں مانیں جب یہ بالکل اکیلا ہے اور پھر جیسا کہ

ہمست اشیر النفس لوگوں کی افتاد ہے، وہ اصول سے ہٹ کر ذاتیات پر اتر آتے ہیں اور حق و صدا کی دعوت کا جواب گالیوں سے دیتے ہیں۔ قوم ثمود نے بھی یہی کیا۔ کہنے لگے۔

ء أَلْفَى الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشْرٌ (۵۴/۲۵)

(اور دیکھو انہوں نے کہا) کیا ہم سب لوگوں کے درمیان سے (خدا کو ایک ہی ملا تھا کہ) اس پر وحی

نازل کی گئی (ہرگز نہیں) بلکہ یہ بڑا ہی جھوٹا اور بہت ہی شیخی باز ہے۔

ادھر سے یہ دریدہ دہنی اور ادھر سے فقط جواب اتنا کہ

سَيَعْلَمُونَ عَدَا مِّنَ الْكُذَّابِ الْأَشْرُ (۵۴/۲۶)

کل (ہی) مکافات عمل کے دن، وہ بہت جلد جان لیں گے کہ جھوٹا اور شیخی باز کون تھا۔

یہ ارباب قوت و ثروت کا رویہ تھا۔ ان کے ساتھ مذہبی پیشوا آگے بڑھے اور انہوں نے یہ کہہ کر عوام کے جذبات کو مشتعل کرنا چاہا کہ یہ شخص

تہیں تمہارے بزرگوں کے مذہب سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔

قَالُوا يٰصَلِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَذَا اَاتَّهَمْنَا اَنْ نَّعْبُدَ
مَا يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا وَاِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ
مُرِيْبٍ ۝ (۱۱/۶۲)

لوگوں نے کہا "اے صالح! پہلے تو تو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی امیدیں تجھ سے وابستہ
تھیں۔ (مگر یہ ایک دم تجھے کیا ہو گیا) کیا (اب) تو ہمیں اس سے بھی روکتا ہے کہ ہم ان کی
عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کریں جن کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) ہمارے باپ
دادا اختیار کرتے چلے آئے ہیں۔ (یہ کیسی بات ہے؟) ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے
جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ ہمارے دل میں اترتی ہی نہیں۔

اس کے جواب میں حضرت صالحؑ نے کیا ارشاد فرمایا؟ وہی جو کوس اذہ تقلید کے مسلک کا صحیح جواب
ہو سکتا ہے:

قَالَ يٰقَوْمِ اَدْعُوْنِيْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِنْ رَّبِّيْ وَاَتْلُوْنِيْ
مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يُّنصِرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهُ فَمَا
تَزِيْدُوْنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۝ (۱۱/۶۳)

صالح نے کہا! اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار
کی طرف سے ایک دلیل روشن پر ہوں اور اس نے اپنی رحمت (نبوت) مجھے عطا فرمائی ہو تو پھر
کون ہے جو اللہ کے مقابلے میں میری مدد کرے گا اگر میں اس کے حکم سے سرتابی کروں؟ تم (اپنی
بات منوا کر) مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے، تباہی کی طرف لے جانا چاہتے ہو۔

یعنی تم اپنے مسلک کی صحت کے ثبوت میں فقط یہ دلیل رکھتے ہو کہ یہ تمہارے آباؤ اجداد سے متوارث چلا

لے یہاں ایک نکتہ اور بھی قابل غور ہے۔ یہ اقوام اپنے انبیائے کرام کے متعلق بصد حسرت و یاس یہ کہتی ہیں کہ تم سے تو
ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا؟ اس سے واضح ہے کہ حضرات انبیائے کرام اپنے دعوے نبوت
سے پیشتر اپنی اقوام میں ممتاز شخصیت کے مالک ہوتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ امتیاز ان کے کیر کڈ اور قابلیت کی بنا پر تھی۔
اس لئے بیخاماتِ البتہ کے حاملین شروع ہی سے بلند سیرت و کردار کے مالک ہوتے تھے۔

آ رہا ہے اور میرے پاس میرے اشد کی عطا فرمودہ وہ تندیل فروزاں ہے جس کی روشنی میں حق و باطل الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ پھر کہتے کہ میں ایسی شمع نورانی کو چھوڑ کر اندھوں کی لاٹھی کے پیچھے کس طرح چل پڑوں؟ پھر یہ بھی دیکھتے کہ ایک پیغمبر بھی اپنے آپ کو قوانین البتہ کی معصیت کے انجام سے محفوظ خیال نہیں کرتا! اللہ کا قانونِ مکافات کا تقاضا بھی یہی ہے۔ یہ ہے وہ ایمان جس پر نظامِ خداوندی کی ثریا بوسِ عمارت مستحکم ہوتی ہے، یعنی اس نظام میں سب سے برگزیدہ و بلند ترین ہستی بھی اپنے آپ کو قانونِ خداوندی کا مطیع و فرمانبردار سمجھتی اور اس کی خلاف ورزی سے خوف کھاتی ہے۔

خفیہ زین ادھر سے تذکرہ و موعظت اور ادھر سے تکذیب و تہدید ساتھ ساتھ بڑھی گئی اور اس کے ساتھ ہی خفیہ سازشیں بھی کہ اربابِ قوت و استبداد کے ہی تجربے ہیں جو حق و صداقت کا گلا گھونٹنے کے لئے ہمیشہ استعمال کتے جاتے ہیں۔

وَ كَانَ فِي الْمَدِينَةِ تَسْعَةٌ رَهَطٌ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ
وَلَا يُصْلِحُونَ هَ قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ
لَنَقُولَنَّ بِوَأَلِيَّتِهِ مَا شَاءَ نَا مَهْلِكُ أَهْلِهِ وَ إِنَّا لَصَادِقُونَ ه

(۲۸ - ۲۹/۲۷)

اور (دیکھو) شہر میں تو آدمی تھے جو (ہمیشہ) ملک میں فساد برپا کرتے رہتے تھے اور (کبھی) اصلاح (کا خیال) نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے (آپس میں مشورہ کیا اور) کہا کہ ایک دوسرے کے سامنے خدا کی قسمیں کھا لو کہ ہم رات کو اس پر اور اس کے گھروالوں پر بیکارگی حملہ کر کے انہیں قتل کر دیں گے اور پھر (جب پوچھ گچھ ہوگی تو) ہم اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے وقت موجود نہیں تھے (نہ ہیں) اس بارے میں کوئی خبر ہے) اور ہم (اپنے اس بیان میں بالکل) سچے ہیں!

ایک نکتہ اس مقام پر ذرا رکتے اور ایک اہم حقیقت پر غور کیجئے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے کہا کہ ”تم اللہ کی قسم اٹھاؤ۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ لوگ اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دینِ جب بگڑ کر مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو

اس میں خدا پر ایمان تو ہوتا ہے لیکن اس خدا کا تصور وہ نہیں رہتا جو دین نے عطا کیا تھا۔ اُن لوگوں کی حالت یہ تھی کہ وہ خدا پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے، لیکن رزق کے سرچشموں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لئے ہوئے تھے۔ حضرت صالحؑ انہیں جو خدا کی طرف دعوت دیتے تھے تو اس سے مراد یہ تھی کہ اُن کا اپنے تصور کے مطابق خدا پر ایمان، ایمان نہیں تھا۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ تھے کہ حکومت صرف اس کے قوانین کی کی جائے اور رزق کے سرچشموں کا مالک بھی اس کو سمجھا جائے۔ یہ ہے فرق ”مذہب“ میں خدا پر ایمان اور ”دین“ میں خدا پر ایمان ہیں! (تفصیل اس کی ”اسلام کیا ہے“ میں ملے گی)۔

اب آگے بڑھتے۔ اس قوم کے مفسدین خفیہ سازش کر رہے تھے کہ حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھیوں کو چپکے سے قتل کر دیا جائے۔ ان خفیہ تدابیر کا جواب لوح مکافات کی پیشانی پر ایک ہلکی سی ہنسی کے آثار کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ حضرت صالحؑ نے انہیں بار بار آگاہ کیا لیکن انہیں نہ ماننا تھا نہ مانے۔ حتیٰ کہ ان لوگوں نے، جو آنکھیں بند کئے ہلاکت و بربادی کے جہنم کی طرف بڑھے جا رہے تھے، علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ جاؤ اس عذاب کو لے آؤ جس کی یوں دھمکی دیتے چلے آ رہے ہو!

وَ قَالُوا يُضَلِّمُوا كُنْتُمْ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ (۷/۷۷)

انہوں نے کہا: ”اے صالح! اگر تم واقعی پیغمبروں میں سے ہو، تو اب وہ بات ہم پر لا دکھاؤ جس کا تم نے ہمیں خوف دلایا تھا۔“

ناقص صالحؑ | انسان بھی کس قدر خود شکن واقع ہوا ہے! اپنی ہلاکت کو بلبلا کر گھر دکھاتا ہے۔ ان کی پاداش عمل کا وقت آپہنچا تھا۔ بہلت کی معیا و ختم ہو چکی تھی۔ لیکن آخری حجت کے طور پر حضرت صالحؑ نے کہا کہ دیکھو یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ تم کام فدا و ندی کا احترام کرنا چاہتے ہو، ایک محسوس چیز تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں کھول کر بات نہیں بتائی گئی۔

حضرت صالحؑ نے جس محسوس شے کو بطور فیصلہ پیش کیا اس تک آنے سے پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ ماہہ التنازع بات کیا تھی۔ اُس زمانہ میں مویشی اور چراگا ہیں، چشمے اور کھیت، سب سے بڑی دولت ہوتے تھے۔ اربابِ اقتدار کی حالت یہ تھی کہ وہ چراگا ہوں اور چشموں کو اپنے مویشیوں کے لئے مخصوص

کر لیتے تھے اور کمزور انسانوں کے جانور بھوکوں مر جاتے تھے۔ حضرت صالحؑ کا پیغام یہ تھا کہ یہ چشمے اور چراگا میں ربوبیتِ عامہ کے لئے خدا کی طرف سے مُختِ بلے ہیں، اس لئے انہیں تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیے۔ وہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ بالآخر انہوں نے اس کا اقرار کیا کہ ہم سب کے جانوروں کو یکساں طور پر چراگا ہوں میں چرنے اور چشموں سے پانی پینے کی اجازت دیتے ہیں۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ اس کا عملی طریق یہ ہے کہ مختلف لوگوں کے جانوروں کی باریاں باندھ دی جائیں تاکہ نہ کسی پر زیادتی ہو نہ کسی کے حقوق میں کمی۔ انہوں نے اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو آپ نے کہا کہ اس بات کا عملی ثبوت دیکھو اس معاہدہ کا احترام کرتے ہو یا نہیں، یہ ہے کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یوں سمجھو کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں، خدا کی زمین اور خدا کی اونٹنی۔ اسے میں اس کی باری کے لئے چھوڑتا ہوں۔ اگر تم نے اُسے آزاد چرنے دیا تو سمجھا جائے گا کہ تمہارے قلوب، قانونِ خداوندی کے احترام کی طرف مائل ہیں، اگر تم نے اسے ایذا پہنچائی تو وہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ تم اپنی روش پر قائم ہو۔ فرمایا۔

هٰذِهِ نَاقَةٌ لَكُمْ آيَةٌ فَنذَرُوهَا قَائِلٌ فِي آَرْضِ آلِثَلٰه

وَ لَا تَمْسُوْهَا بِسُوْءٍ فَيَاْخُذْكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (۷۳/۷۴ نیز ۱۱/۱۲)

یہ "خدا کی اونٹنی" تمہارے لئے ایک (فیصلہ کن) نشانی ہے۔ پس اسے کھلا چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے چرے۔ اسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ ورنہ عذابِ جانگاہ تمہیں آپکڑے گا۔ اس ناقہ کے لئے پانی پینے کی باری ٹھہرا دی۔

قَالَ هٰذِهِ نَاقَةٌ لَّهَآ شَرِبٌ وَّ لَكُمْ شَرِبٌ يُّوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ؕ وَّ لَا

تَمْسُوْهَا بِسُوْءٍ فَيَاْخُذْكُمْ عَذَابٌ يُّوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (۱۵۵-۱۵۶/۱۵۷)

(اور دیکھو) صالح نے کہا کہ یہ ایک اونٹنی ہے۔ پانی پینے کے لئے ایک اس کی باری ہے اور ایک مقررہ دن میں تمہاری (یعنی تمہارے جانوروں کی) باری ہے۔ اسے کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچانا (ورنہ یاد رکھو) پھر تمہیں ایک بڑے دن (یومِ مکافاتِ عمل) کا عذاب آپکڑے گا۔

لے "خدا کی اونٹنی اور خدا کی زمین"۔ بس یہ ہے دین کے معاشی نظام کا نقطہ اساس۔ نبی اکرمؐ کے ارشادِ گرامی کے مطابق۔ "اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے"

ان تمام حدود و شرائط سے مقصود فقط یہ دیکھنا تھا کہ وہ احکامِ الہیہ کے احترام کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہیں یا نہیں۔

إِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَازْتَبَهُمْ وَاصْطَبِرُوا وَ
نَبِّئُهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ ۗ كُلُّ شَرْبٍ مُّحْتَضَرٌهُ (۲۸-۲۹)

(اور دیکھ، اے صالح!) ہم اس اونٹنی کو آزمائش بنا کر بھیج رہے ہیں لہذا تو ان کا نگران رہ اور استقامت سے کام لے اور انہیں بتا دے کہ پانی کی ان کے درمیان تقسیم ہے (یہ اونٹنی اپنی باری پر پانی پئے گی اور ان کے جانور اپنی باری پر) تو (اپنی اپنی) باری پر ہر باری والا حاضر ہوا کرے گا۔

اسی لئے اس اونٹنی کو ایک کھلی ہوئی نشانی کہا گیا ہے کہ اس سے ان کی قلبی کیفیات و رجحانات محسوس مشہور طریق کے نقاب ہو سکتے تھے۔

وَ اتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوا بِهَا ۗ وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ
إِلَّا تَخْوِيفًا ۝ (۱۷/۵۹)

اور ہم نے قوم ثمود کو اونٹنی دی کہ ایک آشکارا نشانی تھی۔ لیکن انہوں نے اس پر ظلم کیا (اور نشانی سے عبرت نہ پکڑی) اور ہم نشانیاں تو صرف اس لئے متعین کرتے ہیں کہ لوگ (انکار و سرکشی کے نتائج سے) ڈریں۔

کھلی ہوئی سرکشی کرنے کو تو ان لوگوں نے معاہدہ کر لیا تھا لیکن سرمایہ پرستی اور اقتدار خواہی کی ذرا بھی پرواہ نہ کی اور اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يُضْلِمُ أَتَيْنَا بِمَا
تَعِدُّنَا إِنَّ كُنْتُمْ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ (۷/۷۷)

غرض کہ انہوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی۔ انہوں نے کہا: 'اے صالح! اگر تم واقعی پیغمبروں میں سے ہو، تو اب وہ بات ہم پر لا دکھاؤ جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو'

اونٹنی کو کسی نے یونہی آفاقہ زخمی نہیں کیا، بلکہ ان سرکشی کرنے والوں نے خاص اہتمام سے اپنے سرغنہ کو بلایا اور اُس نے بھرپور ہاتھ سے اُسے ہلاک کیا۔

فَنَادُوا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَرَ ۝ (۵۴/۲۹)

چنانچہ انہوں نے اپنے ساتھی کو پکارا (بلایا) پس اُس نے (اونٹنی پر بھرپور) وار

کیا اور ہلاک کر ڈالا!

ہلاک کرنے کو تو کمر گئے، لیکن جب اس کا احساس بیدار ہوا کہ ہم نے کس قدر پختہ عہد کیا تھا اور اب اس سے کس طرح بیدردی سے پھر گئے ہیں، تو دل میں ارتعاش پیدا ہوا۔

فَعَقَرُوا ذُحَا فَاصْبَحُوا مِنْدِ مِثْنًا ۝ (۲۶/۱۵۷)

غرض کہ انہوں نے اُس (اونٹنی) کو ہلاک کر ڈالا۔ (مگر پھر بعد

میں) نادام ہوئے۔

چنانچہ وقت گذرنا گیا اور اس قوم کی سرکشی بڑھتی چلی گئی۔ ان کا معمول یہ ہو گیا کہ حضرت صالحؑ نے جو کچھ کہا انہوں نے اس کی تکذیب کی اور اس سے برعکس سمت کو چلے۔ چنانچہ حضرت صالحؑ نے آخر میں کہا کہ آتش فشاں پہاڑ تمہارے سر پر کھڑا ہے۔ یہ کھٹنا چاہتا ہے۔ اس سے بچ نکلنے کا سامان کرو۔ لیکن انہوں نے حسبِ معمول اس کا بھی مذاق اڑایا۔

فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ذَلِكَ دَعْوَىٰ غَيْرِكُمْ كَذِبًا ۝ (۱۱/۶۵)

صالحؑ نے کہا "تم تین دن تک اپنے گھروں میں کھاپی لو۔ یہ دعوت ہے جو چھوٹا نہ نیکلے گا۔

غور کیجئے، انہیں تین دن پہلے بتایا جاتا ہے کہ اب تمہاری تباہی کے اسباب پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ چونکہ ان کی ہر بات کو جھٹلاتے تھے اس لئے انہوں نے اس وعید کا بھی مذاق اڑایا اور آنے والی تباہی کی کوئی پروا نہ کی۔

یہی ہے وہ چیز جسے ہم تذکرہ حضرت نوحؑ کے ضمن میں بہ صراحت لکھ چکے ہیں کہ ہوتا صرف اس قدر تھا کہ ان حوادث کے متعلق حضرات انبیائے کرامؑ کو قبل از وقت معلوم ہو جاتا تھا۔ (خواہ فراست کی بنا پر یا وحی خداوندی کی رُوسے) وہ اپنے اس علم کو چھپا کر نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کا اعلان کر دیتے تھے۔ لیکن چونکہ قوم ان کی ہر بات کا مذاق اڑاتی تھی اس لئے ان کے اس اعلان کو بھی سنجیدگی سے (SERIOUSLY) نہیں لیتی تھی اور اپنی حفاظت کا سامان نہیں کرتی تھی اس لئے تباہ ہو جاتی تھی۔

اس کے بعد؟

اس کے بعد وہ کچھ ہوا جس کے تصور سے آج بھی ہر قلب سلیم سینے میں دھڑکنے لگ جائے اور ہر دیدہ

ہلاکت انجیز عذاب! | عبرت ہشتم حیراں بن جائے۔ اُن آگ سے بھرے ہوئے (آتش فشاں) پہاڑوں

میں ایک دھماکا ہوا جس سے ایک چیخ، ایک گرج، ایک کڑک کی آواز

فضا میں گونجی اور قوم ثمود کی بستیاں راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔

فَاَخَذَ تَهُمُ الرِّجْفَةُ فَاَضْبَعُوا فِي دَارِهِمْ جَثِمِينَ ۝ (۷۸/۷۸)

پھر ایسا ہوا کہ لرزادینے والی ہولناکی نے انہیں آیا اور جب ان پر صبح ہوئی تو گھروں میں

اوندھے منہ پڑے تھے۔

یہاں اس عذاب کو ایک لرزہ انجیز دہشت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ اسے زور کی کڑک سے موسوم کیا گیا ہے۔

وَ اَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ فَاَضْبَعُوا فِي دِيَارِهِمْ جَثِمِينَ ۝

كَانَ لَمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۚ اَلَا اِنَّ تَمُوْدًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۚ اَلَا

بُعْدًا لِّتَمُوْدَ ۝ (۷۷/۷۸-۷۹) نیز (۸۳-۸۴)؛ (۱۵/۸۳)؛ (۲۱/۱۶) نیز (۲۹-۳۱) (۵۲/۳۱)

اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا، ان کا حال یہ ہوا کہ ایک زور کی کڑک نے آیا۔ جب صبح ہوئی تو

سب اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے تھے۔ (وہ اس طرح اچانک مر گئے) گویا ان گھروں میں

کبھی بسے ہی نہ تھے! تو سن رکھو کہ ثمود نے اپنے پروردگار کے قانون سے انکار کیا اور ہاں سن

رکھو کہ ثمود کے لئے عسری ہوئی:

اللہ کی تدبیر | قوم ثمود نے حضرت صالحؑ کے خلاف ایک خفیہ تدبیر کی تھی وہ تو ناکام و نامرور ہی

اور قانون مکافات کی وہ خفیہ تدبیر جو یوں اُن کے پاؤں کے نیچے سختی کو پہنچ رہی تھی

اس طرح ابھری کہ کوئی ابھرنے والا سامنے نہ رہا۔

وَ مَكَرْنَا مَكَرًا ۙ وَ مَكَرْنَا مَكَرًا ۙ وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

فَاَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اِنَّا دَمَرْنَاهُمْ ۙ وَ قَوْمَهُمْ جَمِيعًا ۝

فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً ۙ بِمَا ظَلَمُوْا ۙ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۙ

لَقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ (۵۰-۲۴/۵۲)

اور دیکھو! ایک خفیہ تدبیر انہوں نے کی تھی اور ایک خفیہ تدبیر ہم نے کی اور انہیں اس کا کوئی احساس و شعور تک نہیں تھا۔ پس ذرا غور تو کرو کہ ان کی خفیہ تدبیر کا انجام کیسا رہا (یہی رہا نا!) کہ ہم نے انہیں اور ان کی (پوری) قوم کو سب کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ چنانچہ (آج) ان کے مکانات خود ان کے ظلم (انکار و بد عملی) کی وجہ سے (بالکل) ویران پڑے ہوئے ہیں۔ ان واقعات میں بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو حقیقت کا علم رکھتے ہوں (عبرت و وعظمت کی بڑی نشانی ہے۔

وہ اس ہلاکت و تباہی کے خوفناک طوفانِ آتشیں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے لیکن اتنے عاجز و بے بس تھے کہ اپنی حفاظت کا کوئی سامان نہ کر سکے اور اس آفتِ جہاں سوز سے راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئے

وَفِي ثَمُودَ إِذْ قِيلَ لَهُمْ تَمَتُّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ ۚ فَتَوَّعَتُوهُمْ رَيْبَهُمْ فَاخَذَتْهُمْ الضُّعْفَةُ ۚ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۚ فَمَا اسْتَطَاعُوا مِنْ قِيَامٍ ۚ وَمَا كَانُوا مُنْتَصِرِينَ ۚ (۴۳-۵۱/۴۵)

اور (تمہارے لئے اے پیروانِ دعوتِ اسلامی!) ثمود (کے حالات) میں عبرت ہے۔ جب ان سے کہہ دیا گیا کہ (تمہارے لئے کچھ مدت تک مہلت ہے۔ چنانچہ) وقتِ معین تک کھاپی لو۔ چنانچہ وہ اپنے انکار و بد عملی سے باز نہ آئے اور انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی اختیار کی۔ بالآخر انہیں ایک کڑک نے آپکڑا۔ حالت یہ تھی کہ وہ (یہ سب کچھ) دیکھ رہے تھے (مگر کچھ نہ کر سکتے تھے) انہیں کھڑا ہونے کی بھی طاقت نہیں تھی اور نہ وہ اپنا بچاؤ کر سکتے تھے بلکہ

ہلاکت اور ایسی ہلاکت! تباہی اور اس قدر تباہی!!

لے ظاہر ہے کہ جب حضرت صالحؑ نے انہیں قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا تو اگر وہ ان کی بات کو درخورِ اعتنا سمجھتے اور وہاں سے نکل جاتے تو اس تباہی سے محفوظ رہتے۔ حضرت صالحؑ اور ان کی جماعت اسی طرح اس تباہی سے محفوظ رہی تھی کہ وہ قبل از وقت وہاں سے نقل مکانی کر گئے تھے۔

وَعَادًا وَثَمُودَ وَ أَصْحَابَ الرَّسِّ وَ قُرُونًا بَيْنَ ذَلِكَ كَثِيرًا ۝
 وَ كَلَّا ضَرَيْنَا لَهُ الْإِثْمَانَ وَ كَلَّا تَبَرْنَا تَتَبِينَا ۝ (۳۸-۳۹/۲۵)
 اور عاد کو اور ثمود کو اور اصحاب الرّس کو اور ان کے درمیان میں بہت سی اُمتوں کو ہم نے تباہ
 کر دیا۔ (اُمم مذکورہ میں سے) ہر ایک (کی ہدایت) کے واسطے عجیب عجیب (یعنی موثر اور مبلغ) مثالیں
 بیان کیں (مگر انہوں نے ان سے کوئی اثر نہ لیا اور جب مکافاتِ عمل کا وقت آپہنچا، تو) ہم
 نے ہر ایک کو بالکل ہی برباد کر دیا۔

بھلا قانونِ مکافات کی گرفت سے کوئی چھوٹ سکتا ہے!

وَ ثَمُودَ إِذْ أَتَيْنَاهُمْ ۝ (۵۱/۵۳) نیز (۵/۴۹)

اور (دیکھو، تمہارے پروردگار نے) ثمود کو بھی تباہ کر دیا۔ چنانچہ اسے (صفحہ ہستی پر)
 باقی نہیں رکھا۔

یہ تھا عذاب جو آج بھی ہر سننے والے کے لئے وجہ ہزار عبرت و موعظت ہے۔

فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۖ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً ۖ وَ مَا كَانَ الْآخِرُهُمْ
 مُؤْمِنِينَ ۝ وَ إِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝ (۱۵۸-۱۵۹/۳۴)
 چنانچہ (دیکھو) انہیں قانونِ مکافات کے عذاب نے آپکڑا۔ بلاشبہ اس واقعہ میں (نصحت
 اور عبرت حاصل کرنے والوں کے لئے ایک بڑی) نشانی ہے اور (بات یہ تھی کہ) ان میں سے
 اکثر (معاندانہ انکار اور ضد کی وجہ سے قبولِ حق کی صلاحیت کو کھو چکے تھے اور) ایمان لانے والے
 نہیں تھے (چنانچہ وہ تباہ ہو گئے)۔ بے شک تیرا رب عزیز اور رحیم ہے۔

یہاں آیت کے اخیر میں 'خدا کے' عزیز و رحیم ہونے کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ عزیز
 تو صاحبِ غلبہ کو کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے بڑھ کر غلبہ و اقتدار کس کا ہو سکتا
 ہے؟ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ایسا کرنا خدا کی صفتِ رحیمیت کا بھی تقاضا تھا۔ یہ نکتہ غور طلب ہے۔
 ان کی ہلاکت، رحمتِ خداوندی کا تقاضا اس لئے تھی کہ خدا نے تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے سامانِ
 رزق کو سطحِ ارض پر بکھیر رکھا ہے۔ لیکن مستبد قوتیں انہیں اپنے قبضے میں لیتی ہیں اور مخلوقِ خدا بھوکوں
 مرتی رہتی ہے۔ ان لوگوں کو ہزار سمجھایا بچھایا گیا کہ وہ دوسرے لوگوں کو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے محروم نہ

کریں۔ لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ اب اس کے بعد دوسری صورتیں باقی تھیں۔ یا تو ان لوگوں کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا اور باقی انسانوں کو تباہ و برباد ہونے دیا جاتا اور یا ان لوگوں کو راستے سے ہٹا کر عام انسانوں کو رزق کے سرچشموں تک پہنچنے دیا جاتا۔ رحمت خداوندی (خدا کی ربوبیت عامہ کی اسکیم) کا تقاضا یہی تھا کہ ان مستبد قوتوں کو راستے سے ہٹا کر رزق کو عام کر دیا جائے

سورۃ الشمس میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا ۖ إِذْ نَبَّهَتْهَا ۖ فَقَالَ لَهُمْ
رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا ۖ فَكَذَّبُوهُ ۖ فَغَارُوهَا ۖ فَنَدَمَ
عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذُنُوبِهِمْ ۖ فَغَارُوهَا ۖ وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا ۖ (۱۱۱-۱۱۵/۹)

(اور دیکھو) قوم ثمود نے اپنی سرکشی کے ساتھ سچائی کو جھٹلایا۔ جب ان کا بد بخت ترین (سرغنہ) کھڑا ہوا تو اللہ کے رسول نے (آخری تمام حجت کے طور پر) خدا کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی اور اُس کے پانی پینے کی باری کے متعلق کہا۔ چنانچہ انہوں نے رسول کو جھٹلایا اور اونٹنی کو ہلاک کر ڈالا۔ بالآخر ان کے جرائم کی وجہ سے ان کے پروردگار نے ان پر تباہی بھیج دی (اور ایسی تباہی بھیجی کہ) انہیں (تہس نہس کر کے زمین کے) ساتھ ہموار کر دیا اور (نہا جو کچھ کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کا قانون مکافات کسی کو پھرتا ہے تو خدا اس خیال سے قطعاً نہیں گھبراتا کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟

آپ آخری آیت پر غور فرمائیے اور دیکھئے کہ اس میں خدائے

قانون مکافات کی ہمہ گیری کائنات کی سطوت و جبروت اور اس کے قانون کی ہمہ گیری نفاذ پذیری کس شوکت و اجلال سے ہیبت فگن اور لرزہ انگیز ہے۔ اس کے ساتھ ہی بذنوبہم کا ٹکڑا ابھرا بھر کر گواہی دے رہا ہے کہ یہ شان جبروت و کبر بانی (معاذ اللہ) ایک مستبد و مطلق العنان بادشاہ کی لاپرواہی اور بدستی کی مظہر نہیں بلکہ اس قوت و اقتدار کی آئینہ دار ہے جس کی رُو سے نظام کائنات اس نظم و ضبط اور عدل و انصاف سے چل رہا ہے جس میں ایک ذرہ بے مقدار سے لے کر عظیم الشان کڑوں تک ذرا سی خلاف ورزی احکام کی مجال نہیں رکھتے۔ اور جب اس کے نظام عدل کی یہ کیفیت ہے تو انسانی اعمال قانون جزا و سزا کی گرفت سے کب باہر جاسکتے ہیں؟ اور جب اس قانون کے ماتحت اس کا فیصلہ نافذ

ہوتا ہے تو اس پر کسی قسم کے جذبات اثر انداز نہیں ہو سکتے کہ وہ جہاں رحمن و رحیم ہے وہاں
 مَلِکِ یٰوَمِیْرَ الدِّیْنِیْنِ بھی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ذرا اس پردہ ساز کو اٹھا کر دیکھا جائے تو اس کا
 مَلِکِ یٰوَمِیْرَ الدِّیْنِیْنِ (قانونِ مکافاتِ عمل کا حاکم مطلق) ہونا بھی دراصل اس کی رحمت ہی کا ایک
 شاخہ ہے کہ اگر قانونِ مکافات اس طرح بے لوث طریق پر نافذ العمل نہ ہو تو کائنات میں فساد برپا ہو جائے۔
 لٰہِذَا وَا لَّا یَخَافُ عُقُبًا وہ محو عظیم ہے جس کے گرد تمام نظامِ کائنات گردش کر رہا ہے، خارجی کائنات
 بھی اور خود انسانوں کا معاشرتی اور اجتماعی نظام بھی جس کا فیصلہ عدل اور رحمتِ عامہ کے تقاضوں کے مطابق ہو،
 اسے اپنے فیصلے کے عواقب سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

جماعتِ مومنین کو بچا لیا گیا | پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ان لوگوں سے تین دن پہلے کہہ دیا گیا
 تھا کہ ہلاکت بہت قریب آرہی ہے، یعنی حضرت صالحؑ کو اس

آنے والے حادثہ کا علم پہلے دے دیا گیا تھا۔ چنانچہ حضرت صالحؑ اپنی جماعتِ مومنین کو ساتھ لے کر ان لوگوں سے
 کنارہ کش ہو کر کسی محفوظ مقام کی طرف چلے گئے۔

فَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اٰتٰیْتُكُمْ رِسٰلَۃً رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ
 لَکُمْ وَا لٰکِنّی اِلَّا تَجْحَدُوْنَ النَّصِیْحَیْنَ ۝ (۷/۷۹)

پھر صالحؑ ان سے کنارہ کش ہو گیا، یہ کہتے ہوئے کہ "اے میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے
 پروردگار کا پیغام تمہیں پہنچایا اور نصیحت کی، مگر افسوس تم پر! تم نصیحت کرنے والوں کو پسند
 نہیں کرتے۔

دوسرے مقام پر ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَآئِنًا صٰلِحًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهُ بِرُحْمٰیۃٍ مِّمَّنَّا
 وَّ مِنْ حِزْبِ یٰوَمِیْنِ ط اِنَّ رَبَّکَ هُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ ۝ (۱۱/۶۴)

پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آپہنچا، تو ہم نے صالحؑ کو اور ان لوگوں کو جو اس کے
 ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت سے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے محفوظ رکھا۔ (۱۱/۶۴)
 پیغمبر! بلاشبہ تیرا پروردگار ہی ہے جو قوت والا اور سب پر غالب ہے۔

اس لئے کہ وہ مومنین و متقین کی جماعت تھی۔

وَ اٰخِیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ سَاوَاۤءُ یَسْتَقُوْنَ ۝ (۲۴/۵۳ نیز ۲۱/۱۸)
 اور (دیکھو) ہم نے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے تھے ہلاکت سے محفوظ رکھا اور (حقیقت یہ ہے کہ)
 وہ تھے بھی متقی (اس لئے اس کے ستم تھے!)۔

ان بقایائے ثمود سے حوسل آگے بڑھی انہیں ثمودِ ثانیہ کہا جاتا ہے۔

یہ ہے قوم ثمود کی داستانِ ہجرت انگریز جو صاحبِ علم و بصیرت کے لئے اپنے اندر سامانِ ہجرت رکھتی
 ہے اور جن کی اُجڑی ہوئی بستیاں ہر رہ گز سے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ غر
 دیکھو مجھے جو دیدہ ہجرت نگاہ ہوا

فَتَلَّكَ بِیُوتُھُمْ خَاوِیۃً یٰمٰنًا ظَلَمُوْا ۙ اِنَّ رَفِیْ ذٰلِكَ لَآیۃٌ
 لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝ (۲۴/۵۲)۔

چنانچہ یہ ان کے مکانات ویران پڑے ہیں۔ بلاشبہ (اُن کی) اس (ہجرت انگریز تباہی) میں اُن
 لوگوں کے لئے جو حقیقت کا علم رکھتے ہیں (بڑی) نشانی ہے۔

اسی داستان کو قرآنِ کریم نے بغیر نام لئے سورۃ المؤمنون کی چند آیات میں یوں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ قوم نوح
 کی غرقابی کے بعد ارشاد ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِھُمْ قُرُوْناً اٰخِرِیْنَ ۝ ثُمَّ اَنْشَاْنَا
 مِنْۢ بَعْدِھُمْ قُرُوْناً اٰخِرِیْنَ ۝ (۳۱-۳۲/۲۳)

پھر ہم نے قوم نوح کے بعد قوموں کا ایک دوسرا دور پیدا کر دیا۔ ان میں بھی اپنا رسول بھیجا جو
 خود انہی میں سے تھا (اس کی دعوت بھی یہی تھی) کہ ”اللہ ہی کی عبودیت (حکومتِ اِطاعت)
 اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئیِ اِلٰہ نہیں۔ کیا تم (انکار و فساد کے نت سائج بد سے) ڈرتے
 نہیں۔ اس کی قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی اور آخرت کے پیش آنے سے
 منکر تھے اور جنہیں دنیا کی زندگی میں ہم نے آسودگی دے رکھی تھی (لوگوں سے) کہنے لگے اس
 سے زیادہ اس کی کیا حیثیت ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے۔ جو کچھ تم کھاتے ہو یہ بھی کھاتا

ہے جو کچھ تم پیتے ہو یہ بھی پینا ہے۔ اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت کرنی تو بس سمجھ لو تم تباہ ہوئے۔ تم سُنتے ہو یہ کیا کہتا ہے؟ یہ تمہیں امید دلاتا ہے کہ جب مرنے کے بعد محض مٹی اور ہڈیوں کا چورا ہو جاؤ گے، تو پھر تمہیں موت سے نکالا جائے گا۔ کیسی اُن ہونی بات ہے جس کی تمہیں توقع دلاتا ہے! (بھلا دوبارہ زندہ ہونا کیسا؟) زندگی تو بس یہی زندگی ہے جو دنیا میں ہم بسر کرتے ہیں۔ یہیں مرتے ہیں، یہیں جینا ہے۔ ایسا کبھی ہونے والا نہیں کہ مر کر پھر جی اٹھیں۔ کچھ نہیں، یہ ایک مفتری ہے جس نے اللہ کے نام سے جھوٹ موت بات بنا دی۔ ہم کبھی اس کی بات ماننے والے نہیں! اس پر رسالہ لکھا "خدا یا! انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے۔ پس تو میری مدد کر! حکم ہوا، عنقریب ایسا ہونے والا ہے کہ یہ اپنے کئے پر شرمسار ہوں گے۔ چنانچہ فی الحقیقت ایک ہولناک آواز نے انہیں آپکڑا، اور ہم نے خس و خاشاک کی طرح اُنہیں پامال کر دیا۔ نو محرومی ہو، اس گردہ کے لئے کہ ظلم کرنے والا ہے! پھر ہم نے اُن کے بعد قوموں کے اور بہت سے دور پیدا کئے۔

اور اس کے بعد وہ نقطہ ماسکہ جو قوموں کی موت و حیات کے لئے ایک اٹل قانون کی حیثیت لئے ہوئے ہے یعنی

مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ (۲۳/۴۳)

کوئی قوم اپنے مقررہ وقت سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔

یہ وقت معین (اجل) کسی قوم کے اجتماعی اعمال کے طور پر تاج کا نام ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو ظلم اور زیادتی سے ہلاک نہیں کرتا۔ یہ ہلاکت ان کے اپنے ہاتھوں کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ ۚ وَأَهْلُهَا مُصَلِحُونَ (۱۱)

اور تیرا رب ایسا نہیں کہ بستیوں کو (یونہی) ظلم سے ہلاک کر دے دراصل ان کے رہنے والے (باقی رہنے کی) صلاحیت رکھتے ہوں۔

سوۃ المؤمنین کی مندرجہ صدر آیات کو ایک بار پھر سامنے لائیں۔ ان میں کہا گیا ہے کہ وہ لوگ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو قوم صرف اس زندگی کو آخری زندگی سمجھے وہ کبھی اپنی عیش سامانیوں کو چھوڑ کر نوح انسانی کی پرورش کے لئے جدوجہد کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتی۔

اس کے لئے تو صرف وہی آمادہ ہو سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ زندگی کو مسلسل آگے چلانا ہے اور اگلی زندگی میں خوشگوار یوں کا معیار یہ ہے کہ اس زندگی میں دوسروں کی پرورش کے لئے کیا کیا ہے؟ یہ وجہ ہے کہ قرآن سرماہ پرستی کے خون آشام نظام کو مٹانے کے لئے ایمان بالآخرۃ کو بنیادی تصور قرار دیتا ہے۔

رسول اجر رسالت نہیں مانگتا | قوم ثمود کا قصہ یہیں تک ہے لیکن دو ایک مقامات ایسے ہیں جن پر آگے بڑھنے سے پیشتر مزید غور و تفکر کی ضرورت ہے۔ آپ نے حضرت نوح اور حضرت ہوڈ کے تذکرہ میں دیکھا ہو گا کہ قرآن کریم نے ان حضرات کا یہ قول نصیحت سے درج کیا ہے کہ ”میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر اللہ کے ہاں ہے“ حضرت صالح کے تذکرہ میں بھی اس چیز کو دہرایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۚ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ

(۲۴/۱۳۵)

اور میں تم سے (اپنی) اس (رہنمائی و ہدایت) پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو صرف تمام جہانوں کے پالنے والے ہی کے ذمہ ہے (اور بس)۔

یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے جس کا قرآن کریم نے یوں بتکرار ذکر کیا ہے۔ ایک داعی الی الحق کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی دعوتِ رشد و ہدایت کا معاوضہ کچھ نہیں چاہتا۔ اس کے نزدیک تبلیغِ پیاماتِ الہیہ اور قیامِ نظامِ خداوندی کے لئے جدوجہد ایک اہم فریضہ ہے جس کی ادائیگی اس پر لازم آتی ہے۔ اس لئے وہ انسانوں سے اس کا کوئی اجر یا معاوضہ نہیں مانگتا۔ اور یہ اس داعی الی الحق کے عظیم النظر کیہ بچھڑ کی درخشندگی کی دلیل ہے۔ واضح رہے کہ دنیا میں معاوضہ صرف روپیہ کی شکل میں ہی نہیں ہو کرتا۔ ذرا علم و فضل کی مسندوں، زہد و تقویٰ کے آستانوں اور رہبرانِ ملت کی بارگاہوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ کس قدر متنوع شکلیں ہیں جن میں اپنی ”بے لوث“ خدمات کا معاوضہ طلب کیا جاتا ہے! نذرانہ نہیں تو محدودیت اور اطاعت اور اطاعت بھی اکثر اوقات پرستش کی حد تک، کبرِ نفس کے تقاضوں کی تسکین۔ اَنَا الْمَوْجُودِ دلائلی کے بلند آہنگ و عادی، تنقید کی حد سے ماورائیت اور کم از کم نام کی شہرت، جھوٹی عزت! اور ان تمام داعیات و اقتضایات کے باوجود بلا مزد و معاوضہ خدمت کا دعویٰ! کتنا

بڑا فریب ہے جو اپنے آپ کو اور دوسروں کو دیا جاتا ہے۔ لیکن ایک حق و صداقت کے داعی کی روش ان سب سے الگ ہوتی ہے۔ اس کا ہر قدم "اللہ کے لئے" اٹھتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا اعلان یہ ہوتا ہے کہ

قُلْ إِنَّا صَلَوَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۱۳۳)

(اے پیغمبرِ سلام!) تم کہہ دو میری صلوة اور میرے فرائض زندگی اور ان کے ادا کرنے کے طور طریقے

میرا جینا، میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہان کا پروردگار ہے!

یاد رکھئے! دنیا میں کوئی اقدام خلوص و صداقت پر مبنی نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ اس کا جذبہ محرکہ خالص للہیت نہ ہو، یعنی اس کے صلہ میں محسوس معاوضہ تو ایک طرف، اس قسم کے غیر محسوس رجحانات قلبی و ذہنی کو بھی دخل نہ ہو۔ کام کو اپنا فرض سمجھ کر انجام دیا جائے اور اس پر یقین رکھا جائے کہ جو کام قانونِ خداوندی کے مطابق کیا جائے اس کا معاوضہ اس کے نتائج ہوتے ہیں جو خود اس کے اندر مضمحل ہوتے ہیں۔ اسی کا نام ہے

إِنْ أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ

نَاقَةُ اللَّهِ | دوسری چیز یہ کہ اس اونٹنی کو جس کا ذکر قصہ حضرت صالحؑ میں آیا ہے، ناقة اللہ سے موسوم اور آیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

هَذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةٌ فَاذْكُرُونَهَا أَتَأْكُلْنَ فِي آَرْضِ اللَّهِ وَلَا

تَمْسُوهَا سَوْءٍ فَيَأْخُذْكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (۷۳/۷۴)

یہ خدا کی اونٹنی تمہارے لئے ایک (فیصلہ کن) نشانی ہے۔ پس اسے کھلا چھوڑ دو کہ خدا کی

زمین میں جہاں چاہے چرے۔ اسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ کہ (اس کی پاداش میں) عذاب

جاں گاہ تمہیں آپکڑے۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس اونٹنی کو ناقة اللہ کیوں کہا گیا تھا اور وہ کس بات کی نشانی تھی۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اونٹنی، عام اونٹنیوں جیسی اونٹنی تھی۔ قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ اس کی تخلیق غیر معمولی انداز سے بطور خرق عادت ہوئی تھی۔ محض آیت کے لفظ سے یہ سمجھ لینا کہ اس کی پیدائش معجزانہ طور پر ہوئی تھی، قرآن کے اسلوب بیان اور حقیقی تعلیم سے بیگانگی کی دلیل ہے۔ قرآن نے کشتی حضرت

نوح کے متعلق بھی فرمایا کہ وہ آیت (نشانی) تھی

فَأَنْجَيْنَاهُ وَأَصْحَابَ السَّفِينَةِ وَجَعَلْنَاهَا آيَةً لِلْعَالَمِينَ ۝ (۲۹)

الغرض ہم نے نوح کو اور (اُس کے ساتھی) کشتی والوں کو (اُس عذابِ غرق سے) محفوظ رکھا اور ہم نے اس کشتی کو جہان (والوں) کے لئے ایک نشانی بنا دیا تھا۔

حالانکہ وہ عام طریقہ کے مطابق ہی تیار ہوئی تھی۔ خانہ کعبہ کے متعلق بھی فرمایا ہے کہ

فِيهِ آيَاتٌ مَّا بَيَّنَّتْ (۳/۹۷)

اس میں کھلی کھلی نشانیاں ہیں۔

اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ خدا کے اس گھر کی تعمیر میں بھی کسی خرقِ عادت واقعہ کا دخل نہ تھا۔ مہاجرِ حرم (علیہ السلام) نے اس کی تعمیر اسی طرح کی تھی جس طرح

کعبہ بھی آیت ہے

اور مکانوں کی کی جاتی ہے۔ لیکن وہ ملتِ حنیفہ کے لئے مرکزِ محسوس اور ان کی موت و حیات کے پرکھنے کی ایک کھلی ہوئی علامت (آیت) ہے جس طرح قومِ ثمود سے کہا گیا تھا کہ یہ ناقةِ اللہ تمہارے کفر و ایمان کے پرکھنے کی ایک نشانی ہے۔ اگر تم نے اس کی حفاظت کی تو یہ تمہاری آفاتِ الٰہیہ کی نشانی ہوگی اور اگر اسے ضرر پہنچایا تو اس سے تمہارا انکار و جحود واضح ہو جائے گا۔ اسی طرح ملتِ اسلامیہ کی ایمانی قوت و ضعف کے پرکھنے کا معیار بیت اللہ ہے۔ اگر ان میں بیت اللہ کی حفاظت کی ہمت رہی تو یہ ان کی ملی زندگی اور حرارتِ ایمانی کی دلیل ہوگی۔ اور اگر اس پر دوسروں کا اثر غالب آ گیا تو یہ ان کی اسلامی موت کی نشانی (آیت) ہوگی۔ قومِ ثمود نے ناقة اللہ کی حفاظت نہ کی اور اللہ کے رسوا کن عذاب میں گرفتار ہو گئی۔

فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَالِحًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَمِن

حِزْبِي يَوْمَئِذٍ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ۝ (۱۱/۶۴)

پھر جب ہماری (ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آپہنچا، تو ہم نے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کی مانند ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے محفوظ رکھا۔ (اے پیغمبر! بلا)

تیرا پروردگار ہی ہے جو قوت والا اور سب پر غالب ہے!

اور ہم بیت اللہ کی حفاظت کے قابل نہ رہے تو ذلت و رسوائی کا عبرت انگیز عذاب ہم پر مسلط ہو گیا اور قومِ ثمود کی طرح اس چالیس کروڑ "ہجومِ مومنین" کی یہ حالت ہو گئی کہ

فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جثِينًا ۚ كَأَن لَّمْ يَغْتُوا فِيهَا ۖ (۶۵-۶۸)

جب صبح ہوئی تو سب اپنے گمروں میں اوندھے پڑے تھے۔ گویا ان گمروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔

اپنے دیار و امصار میں یوں مڑوں کی طرح اوندھے پڑے ہیں گویا ان میں کبھی زندوں کی طرح بسے ہی نہ تھے!

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً ۖ (۲۶/۱۵۸)

یقیناً اس کے اندر ایک نشانی ہے۔

وَمَا كَانَ آكُزَّهُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ (۲۶/۱۵۸)

اور (حقیقت یہ ہے کہ) ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر ان حقائق و حیر پر "ایمان" نہیں رکھتے۔ یونہی سرسری طور پر پڑھ کر تگے بڑھ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ خود ہماری ہی عبرتناک داستان ہے کسی اور کا قصہ نہیں۔

اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جس چیز کی نسبت خدا اپنی طرف کرتا ہے اس سے بالخصوص یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ وہ تمام نوع انسانی کے مشترک فائدے کے لئے ہے۔ اس پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ قوم ثمود کے اکابر، مویشیوں کی نسبت امیروں اور غریبوں کی طرف کر کے، غریبوں کے مویشیوں کو چشموں کے قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ جب ان سے اس بات پر معاہدہ ہوا کہ یہ چشمے اور چراگاڑیں سب کے مویشیوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے تو اس کے لئے بطور نشان یہ کہا گیا کہ یہ ایک اونٹنی جس کے متعلق یہ سمجھو کہ یہ نہ کسی امیر آدمی کی ہے نہ غریب کی۔ یہ خدا کی مخلوق ہے اسلئے اسے خدا کی زمین میں چرنے کا حق ہے فاقہ اللہ اور ارض اللہ میں یہی خصوصیت مضمحل ہے، اسی طرح جیسے خدا نے کعبہ کو بیتتی (میرا گھر) کہا کہ یہ اعلان کر دیا کہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ وہ تمام نوع انسانی کے مفاد کے لئے یکساں طور پر کھلا رہے گا۔

واضح رہے کہ ارض کو اسی لئے ارض اللہ کہا گیا ہے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اسے تمام نوع انسان کی پرورش کے لئے کھلا رہنا چاہیے۔ (تفصیل اس کی میری کتاب "نظام ربوبیت" یا "خدا اور سرمایہ دار" میں ملے گی)۔

خلاصہ مبحث

اُمم سابقہ کا دوسرا مشہور قبیلہ ثمود تھا جس کا مسکن وادیِ قرمیٰ اور دار الحکومت حجر تھا۔ یہ قوم بھی دولت و قوت کی فراوانی کی مالک تھی، لیکن عاد کی طرح مفسد فی الارض ان کی طرف حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے۔ انھوں نے ان کی دعوتِ انقلاب کی سخت مخالفت کی اور وہی کچھ کیا جو اس سے قبل عاد نے حضرت ھوٹ سے کیا تھا۔ وہی اعتراضات، وہی اسلاف پرستی کا جذبہ، وہی قوت پر زعم باطل قرآن اس ضمن میں جس بات کو نمایاں طور پر اُجھار کر سامنے لایا ہے وہ یہ ہے کہ جب انسانوں نے بل حل کر تہذیبی زندگی شروع کی تو اسی زمانے سے "امیر و غریب" کی کشمکش شروع ہو گئی جو اب تک جاری ہے۔ کچھ لوگوں نے کسی نہ کسی طرح قوت حاصل کر کے رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیا اور اس طرح کمزور اور ضعیف ان کے دستِ کرم کے محتاج ہو گئے یہی احتیاج تھی جس کی وجہ سے غریبوں کا طبقہ صاحبِ قوت و دولت طبقہ کا غلام بن گیا اور ان کی زندگی کا مقصد ان کے آرام و آسائش کے سامان فراہم کرنا قرار پا گیا۔ حضراتِ انبیائے کرامؑ کی آمد کے بنیادی مقاصد میں سے یہ بھی تھا کہ وہ رزق کے سرچشموں کو ان مستبد قوتوں کے فولادی پنجوں سے چھڑا کر انھیں نوعِ انسانی کی ضروریات کے لئے عام کر دیں۔ ظاہر ہے کہ اس انقلابی تحریک کی سب سے بڑھ کر مخالفت ان لوگوں کی طرف سے ہوتی تھی جن کے ہاتھوں سے رزق کے یہ سرچشمے پھینے جاتے تھے۔ اسی کشمکش کا منظر ہے جو "ناقہ صالح" کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اُس زمانے میں لوگوں کی سب سے بڑی دولت مویشی تھے اور پانی ان کی زندگی کا سب سے بڑا آسرا۔ یہ اکابرینِ پانی کے چشموں پر قابض ہو جاتے تھے اور غریبوں اور کمزوروں کے مویشیوں کی ان تک رسائی نہیں ہونے پاتی تھی۔ (ہم آگے چل کر داستانِ حضرت موسیٰؑ میں دیکھیں گے کہ طاقت و دولت اور کمزوروں کے جانوروں کے پانی پینے کا یہ انسانیت سوز منظر مدین کی پراگاہ میں کس طرح نکھر کر سامنے لایا گیا ہے) حضرت صالحؑ نے ان اکابرین سے یہ عہد لیا کہ وہ بستی کے تمام لوگوں کے مویشیوں کی باری باندھ لیں اور اس میں امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہ رہے۔ سب مویشی اپنی اپنی باری پر آکر پانی پیئیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ اکابرین اس معاہدہ پر قائم رہتے ہیں یا نہیں، حضرت صالحؑ نے غریبوں کے جانوروں کے نمایندہ کی حیثیت سے خود اپنی اونٹنی کو پیش کیا اور ان سے کہا کہ اگر انھوں نے اس سے اس کی باری پر پانی پینے دیا تو سمجھ لیا جائے گا کہ وہ اپنے عہد پر قائم ہیں۔ لیکن اگر انھوں نے اُسے روکا تو اس سے مفہوم یہ ہو گا کہ وہ قانونِ عدل و مساوات سے کشی برتنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ ان سرکش اکابرین نے اس اونٹنی کو نہ صرف پانی پینے سے روکا بلکہ اسے گھائل کر کے ختم ہی کر دیا۔ اس کے بعد

ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو دنیا میں ہر ظالم اور مستبد قوم کے ساتھ ہونا چاہیے۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے اس چھوٹے سے واقعہ سے انسانی نظام معیشت کے کس قدر اہم گوشے سے نقاب کشائی کی ہے اور اس پیچیدہ ترین گتھی کو سلجھانے کے لئے کس قدر بلند اصول پیش کیا ہے۔ زمان اور مکان کی تبدیلی سے احوال و ظروف میں تبدیلی ہو جاتی ہے لیکن رُوح ہمیشہ وہی کار فرما رہتی ہے۔ حضرت صالحؑ کے زمانہ سے لے کر آج تک انسان نے اپنے معاشی نظام میں سینکڑوں تبدیلیاں کیں لیکن ”پانی کا چشمہ“ اکابرین کے جانور اور غریب کی اونٹنی“ اصولی طور پر ہمیشہ باقی رہی۔ اس کا حل جب بھی ملا، اسی اصول میں ملا جسے قرآن نے اس ضمن میں پیش کیا ہے اور جب بھی ملے گا اسی اصول میں ملے گا، یعنی خدا کی اونٹنی اور خدا کی زمین“



ذکر کفر ابھیہم والفقہ من البیت اسعین قبل من اللہ التامین العین

معماری حرم

قوم راربط ونظام از مرکزے

روزگار مش رادوام از مرکزے

رازدار و رازما بیت الحرم

سوزما ہم سازما بیت الحرم

حضرت ابراہیم علیہ السلام

گذشتہ صفحات میں ان انبیائے کرام (علیہم السلام) کا تذکرہ ہماری نگاہوں سے گزرا ہے جن کی دعوتِ رشد و ہدایت کا سلسلہ اپنی اپنی قوم تک محدود رہا۔ لیکن، جیسا کہ متعدد مقامات میں بیان کیا جا چکا ہے، اسلام تمام نوزیع انسانی کا دین ہے اس لئے اس کا حلقہٴ مخاطب عالمگیر ہے۔ زیرِ نظر باب میں اس جلیل القدر ہستی کا تذکرہ جمیلہ ہمارے قلب و نگاہ کے لئے وجہٴ شادابی بنے گا جس کے مقدس ہاتھوں اسلام کی اس آفاقیت اور عالمگیریت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ یہ ذاتِ گرامی قدر، پیکی خلت و صداقت، حضرت ابراہیم کی ہے جنہیں مشیتِ لیزدی نے اس منصبِ جلیلہ کے لئے منتخب کیا کہ سامی اقوام میں نبوت و رسالت کی نعمتِ عظمیٰ آپ کی ذریت سے باہر نہ گئی۔ اس شجرِ مقدس کی ایک شاخِ طوبیٰ حضرت عیسیٰ تک منبج رہی تو دوسری شاخ سے وہ گلِ سرسبز بستمِ فشاں ہوا جس پر نورِ نکہت کی تمام رعنائیاں اپنے اوجِ کمال تک پہنچ کر ختم ہو گئیں اور جس کی جلوہ فردشیاں اور عنبرِ فشانیاں زمان و مکان کی حدود و قیود سے بے نیاز ہو کر قیامت تک کے لئے زینتِ وہ محفلِ انسانیت قرار پائیں۔ اس نبیِ آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ملت، ملتِ ابراہیمی اور اُمتِ اُمتِ حنیفیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ کیونکہ دنیا میں "خاندان" توحید پرستی کے مؤسس اولیٰ اور مورثِ اعلیٰ حضرت جلیل اکبر (ابراہیمؑ) ہی ہیں۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس سلسلہٴ نبوت و رسالت کی ایک برگزیدہ کڑی تھے جس

کے تذکرہ کی ابتدا حضرت نوحؑ سے کی گئی ہے۔

وَ اِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لِبُرْهَانِمَه (۳۳)

اور (یقیناً نوح کے) گروہ میں سے ابراہیم بھی تھا۔

آپ کا زمانہ حضرت نوحؑ کے بعد اور حضرت اسحقؑ و یعقوبؑ سے پہلے ہے۔

وَدَهَبْنَا لَهُ اِلْمَحْقَ وَ يَعْقُوبَ ۚ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَ لُوْهًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ ۚ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوبَ ۚ وَ يُوسُفَ وَ مُوسٰى وَ هٰرُونَ ۚ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ؕ (۷/۸۵)

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور (اسحاق کا بیٹا) یعقوب دیا۔ ہم نے ان سب کو راہِ راست دکھائی، وہی راہِ راست جو ابراہیم سے پہلے نوح کو دکھایا چکے تھے اور ابراہیم کی نسل میں سے داؤد سلیمان ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون کو بھی (وہی راہ دکھائی)۔ ہم اسی طرح حسن عمل کرنے والوں کو ان کے حسن عمل کا بدلہ دیتے ہیں۔

چنانچہ حضرت یوسفؑ نے فرمایا۔

وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اَبَائِيْ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ يَعْقُوبَ ۚ (۱۳/۳۷)

میں نے اپنے باپ دادوں یعنی ابراہیم اور اسحق اور یعقوب کی ملت کی پیروی کی ہے۔

توریت کا بیان ہے کہ حضرت نوحؑ کی آٹھویں پشت میں نوح پیدا ہوئے جو حضرت ابراہیمؑ کے دادا تھے۔ ان کے یہ سلسلہ اس طرح آگے بڑھا۔

نوح
تاریخ (آذر)

حضرت ابراہیمؑ	حضرت اسحاقؑ	حضرت یوسفؑ
حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسحقؑ انہوں نے کنعان یعنی فلسطین و شام میں حکومت قائم کی۔ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے بنی اسرائیل علیہم السلام	مدیاں (حضرت قطور کے بطن سے) یہ صحابہ کے قریب بحر احمر کے ساحل کے پاس منگن ہوئے۔	حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسمعیلؑ (جو باد یہ فنساران میں جلوہ افروز ہوئے)۔ حضرت ختم المرسلین نبی اکرمؐ

لہٰذا توریت کے بیان کے مطابق یہ سلسلہ یوں قائم ہوا تھا۔ (حضرت) نوحؑ، سام، ارملسد، سلح، عیبر، فلج، رعو، سروج، نوح، تاریخ، حضرت ابراہیمؑ۔

حضرت ابراہیمؑ کے والد کا فاندان، کلدانیوں کے شہر اُور میں آباد تھا۔ کلدانیوں (بابل) کا تمدن تاریخ کے اوراق پر ابھرے ہوئے حروف میں نظر آتا ہے۔ تورات میں حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں عراق اور شام کی باہمی جنگ کا قصہ مذکور ہے جس میں شنعاء (بابل) کے بادشاہ کا نام امرافیل درج ہے۔ قیاس ہے کہ یہ بادشاہ وہی ہے جو حمورابی کے نام سے مشہور ہے اور جس کے قوانین بابل کے مینارہ پر کندہ ملے ہیں۔ اس قیاس کی رُو سے حضرت ابراہیمؑ کا عہد (۲۲۰۰ ق.م) قرار دیا جاسکتا ہے۔

زمانہ اور ماحول | ان کی قوم بُت پرستی اور ستارہ پرستی میں مشہور تھی۔ خود حضرت ابراہیمؑ کے والد ایک بہت بڑے پجاری (آدار) تھے۔ لہذا جن موروثی اثرات کو لیتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے اور جس ماحول میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی، علم النفس (PSYCHOLOGY) کے اصول کی رُو سے آپ کو انہی معتقدات کا حامل ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ایک نبی اور عام انسانی بچے میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔ عام انسانی بچہ اپنے موروثی اثرات و نقوش اور ماحول کی تعلیم و تربیت کی تخلیق ہوتا ہے، لیکن جسے اللہ تعالیٰ مقام نبوت کے لئے مختص کرتا ہے وہ ان خارجی اثرات سے غیر متاثر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بتوں کی آغوش کا پرورش یافتہ بچہ دنیا میں سب سے بڑا بُت شکن ثابت ہوا اور یہ بت شکنی صرف مٹی اور پتھر کے محسوس و مرنی بتوں تک ہی محدود نہ رہی بلکہ ایک ایسے زمانے میں جب کہ انسانی نگاہ محسوسات کی چار دیواری سے باہر مشکل جاتی تھی، تیشہ ابراہیمؑ نے اعماق قلب میں چھپے ہوئے غیر محسوس و غیر مرنی بتوں تک کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور یوں دنیا میں خالص اور سچی توحید کے عملی پیکر کی حیثیت سے ملت موعده کے محسوس اولیٰ قرار پائے۔ لیکن یہ دعوت توحید کچھ آسان کام نہ تھا اس میں توجہ

صد منزل است و منزل اقل قیامت است

اس دعوت کے معنی یہ تھے کہ ساری دنیا کی مخالفت مول لے لی جائے۔ لیکن اس مخالفت سے ان کے جوہر

لے خود اُور کے معنی شہرِ بستی کے ہیں۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ تورات کے اُور سے مراد بابل وغیرہ کوئی بڑا شہر ہو۔ کتاب پیدائش میں ہے:-

اور تاریخ نے اپنے بیٹے ابرام اور اپنے پوتے لوط یعنی
 حاران کے بیٹے کو اور اپنی بہوتری
 ابرام کی جود کو لیا اور ان کے ساتھ کدیوں کی اُور سے روانہ ہوئے کہ کنعان کے ملک میں جائیں اور وہ
 حاران تک آئے اور وہاں رہے۔ (پیدائش ۱۱/۳۱)

خودی کی اور بیداری ہوتی تھی۔ یہ تصادم درحقیقت اس امر کے پرکھنے کے مواقع تھے کہ ان کی صلاحیتیں کس حد تک بیدار ہو چکی ہیں اور ان کے عزم میں کس حد تک کھینچاؤ آچکی ہے۔ اس کے متعلق سورہ بقرہ میں ہے۔

وَ إِذِ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا مَا كَانَ لِيَاجُزِيَٰنَا بِمَا كُنَّا نَعْمَلُ ۝۱۳۳ (۲/۱۳۳)

جب اللہ نے ابراہیم کے لئے اس کی مضمحل صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع بہم پہنچائے تو معلوم ہوا کہ اس کی صلاحیتیں تکمیل پا چکی ہیں۔

امامتِ نوعِ انسانی اس پر کہا گیا کہ جس کی صلاحیتیں اس حد تک تکمیل پا چکی ہوں اسے حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے لئے صلاحیتوں کے پرکھنے کا معیار بن جائے۔

قَالَ اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۝۱۳۴ (۲/۱۳۴)

(جب ایسا ہوا تو) خدا نے فرمایا (اے ابراہیم!) میں تجھے انسانوں کے

لئے امام بنانے والا ہوں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ مہاروں کے پاس ایک چھوٹا سا اوزار ہوتا ہے یعنی پیتل کے ایک چھوٹے سے لٹو کے ساتھ لمبا دھاگا بندھا ہوتا ہے۔ اس سے وہ دیکھتا ہے کہ دیوار سیدھی اٹھ رہی ہے اور چنائی ہموار ہو رہی ہے اسے امام کہتے ہیں۔ ایک بلند سیرت کا انسان (نبی) دوسروں کے لئے امام کا کام دیتا ہے۔

دعوتِ توحید کی ابتدا اس دعوتِ توحید کی ابتدا خدا اپنے گھر سے ہوئی۔ ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو ایک عظیم الشان بت کہہ میں پایا جس کا سب سے بڑا

بجاری خود ان کا باپ تھا۔ انہوں نے باپ اور بت کہہ میں آنے والے دوسرے اصنام پرستوں کی اس حرکت کو حیرت و استعجاب سے دیکھا اور کہا کہ تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے جو اس کھلی ہوئی غلط روش پر چلے جا رہے ہو۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِرَبِّهٖ اِذْ رَاۤءَۤ اَصْنَامًاۙ الْهٖۤۃُ ۚ اِنِّیۤۤٔ

اَرٰیۤکَۙ وَ قَوْمَکَۙ فِیۤ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ۝۴ (۲/۴)

اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ابراہیم نے اپنے باپ اور بت کہہ میں سے کہا تھا، کیا تم (پتھر کے) بتوں کو

معبود مانتے ہو؟ میرے نزدیک تو تم اور تمہاری قوم کھلی گمراہی میں مبتلا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل سورۃ مریم میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِبْرَاهِيْمَ ؕ اِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا ۝
..... فَتَكُوْنُ لِلشَّيْطٰنِ وَاٰلِآءِهٖ ۝ (۱۹/۴۵-۴۱)

اور (اسے سب سے بڑا) کتاب میں ابراہیم کا ذکر کر لیتا ہوں جو سچا نبی تھا اور اللہ کا نبی تھا۔ اس وقت کا ذکر جب اس نے اپنے باپ سے کہا، اے میرے باپ! تو کیوں ایک ایسی چیز کی عبادت کرتا ہے جو نہ تو سنتی ہے نہ دیکھتی ہے نہ تیرے کسی کام آسکتی ہے؟ اے میرے باپ! میں سچ کہتا ہوں۔ علم کی ایک روشنی مجھے مل گئی ہے جو تجھے نہیں ملی۔ پس میرے پیچھے چل! میں تجھے یہی راہ دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ! غلط جذبات کی اطاعت نہ کر۔ یہ تو خدا سے سرکشی کے مظاہر ہیں۔ اے میرے باپ! میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو، خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے تجھے سزا ملے اور تیرا حشر بھی سرکش انسانوں جیسا ہو جائے۔

بُت خانے کا سب سے بڑا پجاری اور خود اپنے بیٹے کی زبان سے اس قسم کی باتیں! پہلے تو سمجھایا بجھایا ہو گا لیکن جب دیکھا کہ بیٹا اس مسلکِ بُت پرستی کا کھلا ہوا دشمن ہے تو کہا۔

قَالَ اَرَا خِبْتُ اَنْتَ عَنِ الْاَلْحٰبِیِّ یٰ اِبْرٰهٰیْمُ ؕ لَیْنُ لَمْ تَنْتَهِ
لَا تُرْجَمَنَّكَ ۝ اِحْجُرْنِیْ مِلْثًا ۝ (۱۹/۴۶)

باپ نے (یہ باتیں سن کر) کہا، ”ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ یاد رکھ، اگر تو ایسی باتوں سے باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر کے چھوڑوں گا (یاد احتکارِ کرعاق کروں گا)۔ اپنی خیر چاہتا ہے تو جان سلامت لے کر مجھ سے الگ ہو جا۔

اگرچہ آج بھی مندروں کے پجاریوں، کلیساؤں کے راہبوں اور خانقاہوں کے پیشواؤں کی حیثیت کچھ کم نہیں ہوتی، لیکن جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں ’مندر کا پجاری اور مملکت کا بادشاہ یکساں حیثیت رکھتا تھا۔ بلکہ پجاری کا رتبہ بادشاہ سے کچھ زیادہ ہی ہوتا تھا۔ بادشاہ اپنی بادشاہت کے لئے پجاریوں کی ”اشیر باد“ دُعا کا محتاج ہوتا تھا۔ اس لئے ایک پجاری کے بیٹے کا اس مسلک سے انحراف ’نہ صرف اسے“ ملحد و بے دین“ ہی بنا دینے والا تھا بلکہ اس سے اتنا بڑا منصب و مقام بھی چھین لینے کا موجب بننے والا تھا۔ یہ

ہو گیا کہ (اس کا باپ) اللہ کے قانون کا دشمن ہے (اور کبھی حق کی راہ اختیار کرنے والا نہیں) تو اس سے بیزار ہو گیا۔ بلاشبہ ابراہیمؑ بڑا ہی درد مند، بڑا ہی بردبار (انسان) تھا!

قوم سے خطاب | باپ کے ساتھ کسی ذاتی معاملہ پر جھگڑا تو تھا ہی نہیں کہ گھر کی چار دیواری تک محدود رہتا۔ معاملہ آگے بڑھا تو حضرت ابراہیمؑ نے قوم کو کبھی اسی طرح مخاطب کیا۔ سورۃ انبیاء میں ہے۔

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا هَذِهِ التَّمَثِيلِ الْيَتَىٰ أَنْتُمْ لَهَا
عَاكِفُونَ ۝ (۲۱/۵۱)

جب اس نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ کیا صورتیاں ہیں جن پر تم جم کر بیٹھ رہے ہو۔

یہ ایک ایسا واضح اور کھلا ہوا اعتراض تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا! انسان اور اپنے ہاتھوں کی تراشیدہ صورتیوں کے سامنے جھکے! یہ ایک ایسی واضح گمراہی ہے جس کے جواز میں ایک لفظ بھی نہیں کہا جاسکتا
الہ اس کے کہ

قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عِبَادِينَ ۝ (۲۱/۵۳)

تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو دیکھا وہ انہی کی پوجا کرتے تھے۔

لیکن اس مضحکہ انگیز دلیل کی حقیقت کیا ہے؟
اسلاف پرستی | قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنْتُمْ وَ آبَاؤُكُمْ

فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (۲۱/۵۳)

ابراہیمؑ نے کہا، یقین کرو تم خود بھی اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں تھے۔
لیکن قوم کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ یہ نوجوان سچ مچ اپنے اسلاف کی روش کہن کے خلاف ہے۔
اس لئے انھوں نے کہا:-

قَالُوا آجَعْتَنَا يَا نَحْوَىٰ أَمْ أَنْتَ مِنَ اللَّاعِبِينَ ۝ (۲۱/۵۵)

اس پر انھوں نے کہا، تو ہم سے سچ مچ کہہ رہا ہے یا تو اپنی مزاح کر رہا ہے؟

آپ نے کہا کہ اس میں مزاح کی کون سی بات ہے! یہ ایک حقیقت ہے جس پر کامل متانت اور سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

قَالَ بَلْ رَبُّكُمْ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ ذَهَبٌ وَ
 أَنَا عَلَىٰ ذَالِكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ۝ (۲۱/۵۶)

ابراہیم نے کہا مذاق نہیں۔ میں سچ بچ تم سے یہ کہتا ہوں کہ جس خدا کا قانون ربوبیت کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جاری و ساری ہے اس کا قانون تمہارے معاشرہ میں بھی نافذ ہونا چاہیے۔ میں اس حقیقت کی شہادت پیش کر رہا ہوں۔

بُت پرستی کی تائید میں جو دلیل قوم کی طرف سے پیش کی گئی تھی وہ تو ہمارے سامنے آچکی ہے۔ اس مسلک کے ابطال میں حضرت ابراہیم نے جو کچھ فرمایا وہ قابل غور ہے۔ سورۃ شعرا میں ہے۔

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ ۖ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَ قَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ
 قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَانًا فَنَنْظُرُ لَهَا غَلْفِينَ ۖ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ
 إِذْ تَدْعُونَ ۖ أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ إِذْ يُضْرَوْنَ ۖ (۲۶/۴۳-۴۹)

اور (اے پیغمبر اسلام!) ابراہیم کے حالات ان کے سامنے پیش کرو جب اس نے اپنے والد اور اپنی قوم سے (متحیر ہو کر) کہا کہ آخر یہ تم کن کی عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا "ہم مورتیوں کو پوجتے ہیں۔ چنانچہ ان کی پوجا میں جمے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس پر ابراہیم نے کہا، کیا وہ تمہاری سنتے ہیں جب تم انہیں پکارتے ہو یا تمہیں نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ (کیونکہ اس کے بغیر تو کوئی چیز بھی اطاعت کے لائق نہیں ہو سکتی)۔

اس سوال کا جواب کیا تھا؟ اسی ساز کہن کی صدائے بازگشت۔

قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُونَ ۖ (۲۶/۷۴)

وہ بولے، نہیں، یہ بات تو نہیں ہے، بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔

اس کے جواب میں حضرت ابراہیم نے پھر یہی فرمایا کہ اس بات کو چھوڑو کہ یہ مسلک تمہارے اسلاف سے متواتر تم تک پہنچا ہے۔ سوچو یہ کہ یہ مسلک ہے کیسا؟ اسلاف پرستی کے خلاف کیسی بصیرت افروز

دلیل ہے، یعنی نفسِ شے پر غور کرو اور سوچو کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ کوئی روش محض اس لئے صحیح نہیں قرار پاسکتی کہ وہ چند نسلوں سے منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے۔ فرمایا۔

قَالَ أَفَرَأَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ۗ أَنْتُمْ وَ آبَاؤُكُمْ
أَوْ قَدُمُونَ ﴿۵۱﴾ — (۲۶/۲۶)

ابراہیم نے کہا (ظالمو!) تم نے غور بھی کیا کہ تم اور تمہارے اگلے باپ دادا، کن لوگوں کی عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کرتے چلے آ رہے ہیں؟

شِرْكَ كِي بِنِيَاد | اس مقام پر آپ نے غیر اللہ کی عبودیت کے متعلق یہ فرمایا کہ دیکھو! ان میں سے کسی میں یہ قوت نہیں کہ تمہیں کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچا سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی لغزش کی سب سے خطرناک گھائی، جالب منفعت اور دفع مضرت کا خیال ہے۔ ایک انسان کسی دوسرے انسان کے سامنے جھکتا اس وقت ہے جب وہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ شخص اسے کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ مظاہر فطرت (آگ، پانی، بادل، بجلی، شیر، سانپ) کی پرستش یا ان دیوی دیوتاؤں کی تماثیل (مٹی اور پتھر کے بتوں) کی پوجا کی ابتداء بھی اسی جذبہ کے ماتحت ہوئی اور اس سے آگے بڑھ کر، انسانوں کی حکومت و عبودیت کی بنیادیں بھی انہی تصورات پر استوار ہوئیں! ایک داعی توحید، قلب و دماغ کے بت خانوں کی انہی بنیادوں کو اکھیرتا ہے جب وہ اس حقیقت باہرہ کو سامنے لاتا ہے کہ دنیا میں نفع و مضرت کی قوت خدا کے قانون کے علاوہ اور کسی میں نہیں۔ سورہ نکلوتہ میں ہے۔

وَ اِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ التَّقْوٰةُ
..... وَ مَا عَلٰى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْمُبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (۱۶) — (۲۹/۱۸)

اور (اسے پیغمبر! اسی طرح) ہم نے ابراہیم کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا، (یاد کرو) جب اس نے اپنی قوم سے کہا، اللہ ہی کی عبودیت (اطاعت و حکومت پذیری) اختیار کرو اور اس کے قوانین کی نگہداشت کرو۔ اگر تم جانو، تو یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ تم لوگ خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے ہو اور (اس طرح) ایک (سفید) جھوٹ گھڑتے ہو۔ خدا کو چھوڑ کر جن لوگوں کی تم عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کرتے ہو، وہ یقیناً تمہارے لئے روزی کے مالک نہیں۔ رزق

خدا کے قانون کے مطابق طلب کرو۔ اسی کی عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کرو اور اس کی عطا کردہ نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ تمہارا ہر قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہے یہی سچائی اور صداقت ہے۔ لیکن اگر تم اسے جھٹلاتے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں تم سے پہلے اور امتیں بھی (سچائی کے علمبرداروں کو) جھٹلا چکی ہیں۔ رسول (اور پیغمبر) کے ذمہ تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ واضح طور پر خدا کے ارشادات پہنچا دے (اور بس!)۔

جلبِ منفعت کے دائرہ میں رزق کو بڑی ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ (رزق کے خزانوں کی کنجیاں کس طرح خدائے واحد کے اپنے ہاتھوں میں ہیں اس کی تفصیل میری کتاب 'نظامِ ربوبیت' میں ملے گی)۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم دعویتِ الٰہیہ کے باب میں ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں:-

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ
..... وَ إِلَيْهِ تُقْلَبُونَ ۝ (۱۹-۲۱/۲۹)

کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں کہ خدا (پہلی بار اپنی) مخلوق کو (عدمِ محض سے) کس طرح وجود میں لاتا ہے؟ پھر انہیں مختلف مراحل سے بار بار گزارتا ہے۔ ایسا کرنا اس کے لئے کچھ دشوار نہیں۔ (اسے پیغمبر!) تم ان سے کہو کہ زمین میں گھومو پھر وادو دیکھو کہ خدا نے (اپنی) مخلوق کو کس طرح پیدا کیا ہے! پھر خود ہی تمہاری سمجھ میں آجائے گا کہ کس طرح حیاتِ نو عطا کر دیتا ہے۔ درحقیقت خدا تو ہر چیز پر قادر ہے۔ جو شخص چاہتا ہے وہ اسے اپنے قانونِ مکافات کے مطابق عذاب (دُنیوی و اُخروی) میں مبتلا کر دیتا ہے اور جو چاہتا ہے اسے سامانِ ربوبیت عطا کر دیتا ہے۔ اور (یاد رکھو) تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

مہلک و مہلک، ابتدا اور انتہا، موت اور حیات، سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جو ذاتِ اقدس ان قوتوں کی مالک ہو اس کے سوا کون مافظ و ناصر ہو سکتا ہے؟

وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۚ وَمَا لَكُمْ
مَنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ دَلِيلٍ ۚ وَلَا لَكُمْ نَصِيرَةٌ (۲۲/۲۹)

اور (یاد رکھو) تم نہ تو اپنی تمدنی دنیا میں سے شکست دے سکتے ہو اور نہ ہی خارجی کائنات میں۔ اور خدا کے سوا نہ تمہارا کوئی کارساز ہے نہ مددگار!

اس وقت تو فقط اتنا ہے کہ اسلاف سے جذبہ عقیدت اور سوسائٹی میں ایک دوسرے سے تعلقات کی بنا پر ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی ایک روش پر آنکھیں بند کر کے چلے جا رہے ہو۔ جب حقائق بے نقاب ہونگے تو تم خود دیکھ لو گے کہ ایسی کھلی ہوئی گمراہی کی روش کی ذمہ داری کون اپنے سر لیتا ہے اور وقت بڑھنے پر اس قسم کے تعلقات کیسے قائم رہ سکتے ہیں۔ جن انسانوں کی خودی خود تراشیدہ ہوں گے سامنے جھک کر اس درجہ کمزور ہو چکی ہو ان کا حال ظاہر ہے۔

وَ قَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَدْنَابًا ۗ.....
مَا أُولَٰئِكَ إِلَّا نَجَّاتُهُم مِّن تَحْسَبُهُمْ آيَاتِنَا كِبَارًا ۚ (۲۹/۲۵)

اور (ابراہیم) نے کہا "تم نے خدا کو چھوڑ کر جن (لوگوں کی) مورتیوں کو اپنا محبوب بنا رکھا ہے، وہ شخص اس لئے ہے کہ اس سے تم میں ایک جامعیت کی صورت پیدا ہو گئی ہے، (اس اشتراک سے تم ایک قوم بن گئے ہو)۔ جس سے تمہیں کچھ دنیاوی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں۔ مگر جب انقلاب خداوندی آئے گا تو تم دیکھو گے کہ تم میں سے کس طرح ایک دوسرے کے تعلقات سے انکار کرتا ہے اور سب تعلقات چھوڑ کر دُور ہٹ جاتا ہے۔ لیکن اس وقت تم سب جہنم کے عذاب میں ماخوذ ہو گے اور تمہارا کوئی حامی و ناصر نہ ہوگا۔

سورۃ الصّٰفّٰت میں حضرت نوح کے تذکرہ کے بعد ارشاد ہے۔

وَ اِنَّ مِّنْ شَيْعَتِهِ لَوِزْهَيْنِمَ ۗ اِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ
..... فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۸۳ - ۸۴/۸۴)

اور (دیکھو) درحقیقت نوح ہی کے گروہ میں سے ابراہیم بھی تھا۔ (یاد کرو) جب وہ قلب سلیم لے کر اپنے پروردگار کے حضور متوجہ ہوا اور اس نے اپنے باپ اور اپنی تمام قوم سے کہا کہ تم کن لوگوں کی عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کر رہے ہو؟ (سوچو تو سہی) کیا خدا کو چھوڑ کر جھوٹ موٹ کے معبودوں (کی اطاعت) کا ارادہ رکھتے ہو؟ پھر تمام جہانوں کے پروردگار کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

غور فرمائیے، یہاں بھی اور ۲۹/۱۷ میں بھی اصنام پرستی کو "افک" کہا گیا ہے۔ کتنی عظیم حقیقت کو ایک لفظ میں ادا کیا گیا ہے! یہ عقیدہ

اصنام پرستی افک ہے

کہ اپنے ہاتھوں کے تراشیدہ بُت، خدایا خدا کے مظہر ہیں، ایک خود ساختہ جھوٹ کے سوا اور کیا ہے؟ اور اگر ایسی بے کس و بے بس، عاجز و ناتواں، محتاج و ضعیف ہستیاں اس قابل ہیں کہ انھیں خدا بنا لیا جائے تو کہتے کہ وہ ذاتِ مطلق جو نہ صرف اپنے آپ کے لئے کسی کی محتاج نہیں بلکہ تمام کائنات اپنی پرورش کئے لئے اس کی محتاج ہے، اسے کیا کہا جائے گا؟ خدا شناسی کے متعلق تمہارا قیاس کس قدر غلط ہے؟ تم نے سمجھا ہی نہیں کہ خدا کسے کہتے ہیں اور اس کی قوتیں کیا ہیں؟ اگر اس کے متعلق صحیح اندازہ تمہارے ذہن میں آجاتا تو تم کبھی اپنے شرفِ انسانیت کو اس طرح ذلیل و خوار نہ کرتے!

اگر قوم کچھ بھی عقل و بصیرت سے کام لیتی تو جس حقیقت کا اندازہ سے ان کی گمراہی اور غلط نگہی ان پر واضح
ستارہ پرستی کے خلاف اندازِ موعظت کی گئی تھی، وہ اپنے مسلک سے یقیناً ہٹ جاتی۔ لیکن جن آنکھوں پر اسلاف پرستی

کے اس قدر دبیز پردے پڑ چکے ہوں، ان کی سمجھ میں یہ باتیں کیسے آسکتی ہیں؟ حضرت ابراہیمؑ نے یہ دیکھ کر کہ قوم ایسے اسلوبِ تذکیر و موعظت سے اثر قبول کرنے پر آمادہ نہیں، ایک اور انداز اختیار فرمایا اور محسوسات کے خوگر انسانوں کی غلط بینیوں کا پردہ خود محسوسات کی وادیوں میں چاک کر دیا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ ان کی قوم ستارہ پرست بھی تھی۔ انھیں بتانا یہ تھا کہ ستارے اپنی ہستی کی بقا کے لئے خود ایک الگ نظام کے پابند اور اپنی حرکات و سکنات میں یکسر مجبور ہیں۔ اس حقیقتِ مجرہ (ABSTRACT TRUTH) کی تبیین کے لئے نظری دلائل کے بجائے محسوس و مشہود (CONCRETE) طریقِ استدلال کی طرف رجوع کیا گیا۔ سورۃ النعام کے چھٹے رکوع کو دیکھئے اور غور فرمائیے کہ قرآن کریم نے کس قدر دل نشین انداز سے اس حقیقت کا مرقع دیدہ بینا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ابتدا یوں ہوتی ہے:

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاٰبِيْهِ اِذْ مَسَّ اَنْتَخِذْ اَصْنٰفًا اِلٰهَةً ۚ اِنِّىْ
 اَرٰى لَكَ وَ قَوْمَكَ فِى ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۶/۷۴)

اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ابراہیم نے اپنے باپ آذر سے کہا تھا، کیا تم (پتھر کے) بتوں کو مجبور
 مانتے ہو؟ میرے نزدیک تو تم اور تمہاری قوم کھلی گمراہی میں مبتلا ہے۔

یہاں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ پر علم و بصیرت کے دروازے کھول کر انھیں

کس طرح اصنام پرستی کی جہالت کی اصل سے آگاہ کر رکھا تھا۔ اس کے بعد ارشاد ہے:-

ذَٰلِكَ نُرِيّٰ اِبْرٰهِيْمَ مَلٰكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ
لِيَكُوْنٰ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۶/۷۵)

اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو قانون کائنات کی عظیم الشان قوتوں کا مشاہدہ کرا دیا تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائے۔

یعنی جس طرح وحی الہی نے علم و بصیرت کی روشنی میں ان پر دیوی دیوتاؤں کی تمائیل اور اجرام سماوی کے مجسموں کی حقیقت کو بے نقاب کر دیا تھا، اسی طرح انھوں نے قلب سلیم اور عقل صحیحہ کی روشنی میں نظام کائنات پر غور و خوض سے اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیا کہ کائنات کی تمام اشیاء مع اجرام فلکی خدا کے قانون کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں اور خود کسی قوت اور اختیار کی مالک نہیں ہیں۔ اس علم و یقین کے بعد وہ قوم کے پاس گئے، اور، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، ان کی غلط روش کے نتائج کو محسوس ہیکروں میں ان کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ رات کی تاریکی چھا گئی۔ وہ لوگ اجرام سماوی کی پرستش کے لئے معبد میں اکٹھے ہوئے۔ اتنے میں ایک کوکب درخشندہ لیلائے شب کی پیشانی پر چمکا۔ لوگ اس کے سامنے سجدہ ریز ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا! یہ ہے (بقول تمہارے) میرا پروردگار! اور پھر خاموشی سے بیٹھ کر ان کے

اجرام فلکی کی نظر فریب تابناکیاں انڈل و تعبد کے مظاہروں کو دیکھتے رہے۔ حسی کہ وہ ستارہ اپنے وقت معین پر تاریکی کے پردہ میں چھپ

گیا، تو اب آپ نے انھیں مخاطب کیا اور کہا کہ یہ ستارہ جو شعلہ مستعمل کی طرح دم بھر کے لئے چمکا اور پھر ختم ہو گیا کیا یہ اس قابل ہے کہ اسے خدا مانا جائے؟ تمہاری جہالت اسے گوارا کرے تو کرے میری بصیرت اس کھلی ہوئی ضلالت کو کیسے قبول کر سکتی ہے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَا كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۗ فَلَمَّا أَفَلَ
قَالَ لَا اُخْبِتُ الْاَوْفَلِيْنَ ۝ (۶/۷۶)

پھر جب ایسا ہوا کہ اس پر رات کی تاریکی چھا گئی، تو اس نے (آسمان پر) ایک کوکب (چمکتا ہوا) دیکھا۔ اس نے کہا، کیا یہ میرا پروردگار ہے، لیکن جب وہ ڈوب گیا تو کہا، نہیں! میں انھیں پسند نہیں کرتا جو ڈوب جانے والے ہیں۔

اتنے میں ظلمتِ شب کا دروازہ کھلا اور چاند اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ بار ہوا۔ قوم پھر سجدہ میں گر گئی۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا! وہ نہیں؟ بلکہ تم کہتے ہو کہ یہ میرا پروردگار ہے؟ تو اب اس کا حال بھی دیکھ لو! اور جب اس کی کشتی سیمیں نیل کے دریا میں اپنی منزل قطع کر کے کسی خاموش دنیا میں روپوش ہو گئی تو فرمایا کہ اس میں کچھ شبہ نہیں اگر میرے اللہ نے مجھے ہدایت کی راہ نہ دکھائی ہوتی تو میں بھی انہی میں سے ہوتا جو ان مجبور ہستیوں کو خدا مان رہے ہیں۔ میں انہی میں پیدا ہوا تھا ۱۰ اسی ماحول میں میری تربیت ہوئی تھی۔ تو یہ فقط اللہ کی ہدایت ہے کہ مجھ پر ان کی اس غلط روش کی حقیقتیں یوں بے نقاب ہو رہی ہیں۔

فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِعًا قَالَ هَذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَأِن لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ ۝ (۶/۷۷)

پھر جب ایسا ہوا کہ چاند چمکتا ہوا نکل آیا، تو ابراہیم نے کہا، اچھا! یہ میرا پروردگار ہے؟ جب وہ ڈوب گیا تو کہا کہ اگر میرے پروردگار نے مجھے حقیقت کی راہ نہ دکھائی ہوتی تو میں ضرور اسی گروہ میں سے ہوتا جو راہِ راست سے بھٹکا ہوا ہے۔

اب اس کے بعد صبح نمودار ہوئی اور مہرِ عالمتاب، نور و حرارت کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے، پستیوں اور بلندیوں کی ہر شے پر چھا گیا۔ انھوں نے دن بھر اس کے عروج و زوال کا بھی تماشا دیکھا اور جب شام کو وہ بھی کہیں روپوش ہو گیا تو آپ نے اپنی قوم سے کہا کہ اب اس سے بڑا خدا تمہارے ہاں اور کوئی نہیں۔ یہی تمہارا سب سے بڑا؛ اس کا بھی حشر دیکھ لو! بھلا کہو کہ میں تمہاری اس مشرکانہ روش میں کس طرح شریک ہو جاؤں؟ میں اس سے کنارہ کش ہوں۔

فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِعَةً قَالَ هَذَا رَبِّي هَذَا أَكْبَرُ ۖ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يُعْتَبِرُ بِئِي بَصْرِيٍّ ۖ مِمَّا تَشْرِكُونَ ۝ (۶/۷۸)

پھر جب صبح ہوئی اور سورج چمکتا ہوا طلوع ہوا تو ابراہیم نے کہا یہ میرا پروردگار ہے کہ یہ سب سے بڑا ہے؛ لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو اس نے کہا، اے میری قوم! تم جو کچھ خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو اس سے میں بیزار ہوں۔

قوم نے کہا کہ اگر آپ ان خداؤں سے بے زار ہیں اور ان کی پرستش سے کنارہ کش ہوتے ہیں تو وہ کون سا

معبود حقیقی خدا ہے جس کی طرف آپ رجوع کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں ارض و سموات ہوں جس نے ارض و سموات کو پیدا کیا ہے۔

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا
وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۚ (۴/۸۹)

میں نے تو ہر طرف سے مُنہ موڑ کر صرف اسی ہستی کی طرف اپنا رخ کر لیا ہے جو کسی کی بنائی ہوئی نہیں بلکہ آسمان و زمین کی بنانے والی ہے (اور جس کے حکم و قانون پر تمام آسمانی اور زمینی مخلوقات چل رہی ہیں) اور میں ان میں سے نہیں ہوں جو اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے ہیں!

اس پر انھوں نے، جیسا کہ ظاہر ہے، دھمکی دی ہوگی کہ تم ہمارے معبودوں کی شان میں گستاخی کر رہے ہو! ان کے غصے سے ڈرو! یہ تباہ کر کے رکھ دیں گے! ایک خدا پرست پر بھلا ان دھمکیوں اور توہم پرستیوں کا کیا اثر! آپ نے فرمایا!

وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ آلِهَتَكُمْ أَشْرَكْتُمْ
بِاللَّهِ..... وَهُمْ مُفْتَدُونَ ۚ (۴/۸۲ - ۸۱)

میں ان ہستیوں سے کیونکر ڈر سکتا ہوں جنہیں تم نے خدا کا شریک ٹھہرا لیا ہے، جبکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراؤ جن کے لئے اس نے کوئی سند اور دلیل تم پر نہیں اتاری؛ بتلاؤ! ہم دونوں فریقوں میں سے کس کی راہ امن کی راہ ہوتی اگر علم و بصیرت رکھتے ہو۔ جن لوگوں نے خدا کو مانا اور اپنے ماننے کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، تو انہی کے لئے امن ہے اور وہی ٹھیک راستے پر ہیں۔

خدا ان حقائق پر ایک مرتبہ پھر غور کیجئے۔ علم و بصیرت کے کتنے عظیم اسرار و غوامض ہیں جو ایک سادہ سی بات کے اندر مضمر ہیں۔ فرمایا کہ ایک تم ہو کہ تمہارے پاس اپنے مسک کے جواز میں کوئی دلیل نہیں اور ایک وہ ہیں جن کے پاس علم و ایقان کی محکم قوتیں ہیں۔ سو چونکہ ان دونوں فریقوں میں سے کونسا فریق ہے جو امن و سلامتی کی راہ پر ہے۔ علم و بصیرت کی روشنی میں چلنے والا یا جہالت و توہم پرستی

کی تاریکی میں اندھوں کی طرح ٹھکریں مارنے والا؛ کتنی بلیغ حقیقت ہے جو چند الفاظ میں سموئی گئی ہے۔

یہ تھی وہ دلیل محکم جو حضرت ابراہیمؑ کو ان کی قوم کے مقابلے میں خدا کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔

وَتِلْكَ مُجْتَمَعًا اتَيْنَاهَا اِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ ۗ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ
مَنْ نَشَاءُ ۗ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝ (۶/۸۳)

اور (دیکھو) یہ ہماری حجت ہے جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم پر دی تھی۔ ہم جس کے درجے بلند کرنا چاہتے ہیں (اسے علم و دلیل پر مبنی بصیرت دے کر) بلند کر دیتے ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار حکمت والا، علم رکھنے والا ہے۔

یوں خدا نے حکیم و علیم، علم و حکمت کی نعمتیں عطا کر کے ظلمت و جہالت کی پستیوں میں گرے ہوئے لوگوں کے مقابلے میں اپنے بندوں کے مدارج بلند کرتا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ | اس واقعہ جلیلہ کے متعلق قرآن کریم کا بیان ختم ہوا۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ بعض لوگ جو

قرآن کریم کے اس مجزا نہ طریق بیان اور حضرت ابراہیمؑ کے اس مخصوص طریق استدلال کی حقیقت کو نہیں پہچانتے وہ اس غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ (معاذ اللہ) حضرت ابراہیمؑ نے ستارہ، چاند اور سورج کو کچھ وقت کے لئے اپنا پروردگار سمجھ لیا تھا اور ان کے غروب ہونے کے بعد ان کی عبودیت سے بیزاری ظاہر کی تھی۔ یہ غلط فہمی اپنے بطلان کے لئے کسی خاص دلیل و برہان کی محتاج نہیں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، نبی، منصب نبوت و رسالت کے لئے مشیت کے پروگرام کے ماتحت شروع ہی سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس لئے وہ ان امور میں جو حقیقت کے خلاف ہوتے ہیں، اپنے ماحول اور وراثت کے اثرات سے بالکل متاثر نہیں ہوتا۔ لہذا یہ تسلیم کرنا کہ ایک نبی، حکما و عقلا کی طرح، ذاتی تجارب و مشاہدات کی ٹھوکروں کے بعد استقرانی طور پر صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے، حقیقت نبوت سے بیگانگی کی دلیل ہے۔ نبوت اکتسابی ملکہ نہیں جسے تجارب و مشاہدات سے حاصل کیا

بیت شکنی کا واقعہ | لطیف نظری دلائل کے بجائے محسوس عینی مشاہدات سے احقاقِ حقی اور ابطالِ باطل کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اب دوسرا واقعہ سامنے آتا ہے۔ حضرت

ابراہیمؑ نے اصنام پرستی کے خلاف جو حقیقت کشا دلائل پیش کئے تھے ان کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ جب قوم نے ان پر کان نہ دھرا تو اس باب میں بھی حضرت ابراہیمؑ نے دوسرا طریق استدلال اختیار کیا۔ یہ واقعہ قرآن کریم نے دو مقامات پر بیان کیا ہے ایک سورۃ انبیاء اور دوسرے صافات۔ سورۃ انبیاء کے پانچویں رکوع کو دیکھئے۔ ابتدا یوں ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدًا مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَلِيمِينَ ۝

(۲۱/۵۱)

اور اس سے پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کے مقام کے مطابق سمجھ بوجھ عطا فرمائی تھی اور ہم اس کی حالت سے بے خبر نہ تھے۔

اس کے بعد وہ اپنے باپ اور قوم سے کہتے ہیں کہ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ مٹی کی مورتیاں کون سے اختیار و اقتدار کی مالک ہیں جو تم انہیں اپنا معبود بناتے بیٹھے ہو؟ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ان مورتیوں کی عبادت کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ تو ہمارے آباء و اجداد سے متوارث چلی آرہی ہے، یعنی اُن کے تقدس اور الوہیت اور قوم کے مسلک کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ اس روش کو اسلاف کی سند حاصل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ کیا تم اور کیا تمہارے آباء و اجداد سب کھلی ہوئی گمراہی میں ہو۔

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنتُمْ وَ آبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (۲۱/۵۲)

ابراہیم نے کہا یقین کرو، تم خود بھی اور تمہارے باپ دادا سب صریح گمراہی میں پڑے ہو۔

قوم کی ذہنیت اس درجہ مفلوج ہو چکی تھی کہ وہ سراپا استعجاب تھے کہ یہ نوجوان بالآخر کہتا کیا ہے! یہ "تقدس اور الوہیت کے مجتہد عاجز و درماندہ ہیں!" تم اور تمہارے آباء و اجداد سب کھلی ہوئی گمراہی میں ہو!! انہوں نے کہا کہ کیا تم یہ سب کچھ سچ (SERIOUSLY) کہہ رہے ہو یا محض بطور تفتنِ طبع؟

قَالُوا أَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ أَمْ آنتَ مِنَ اللَّعِينِينَ ۝ (۲۱/۵۳)

اس پر انہوں نے کہا، تو ہم سے سچ (SERIOUSLY) کہہ رہا ہے یا مزاح کر رہا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ اگر یہ بات اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آسکی کہ یہ بُت مجبور و درماندہ ہیں اور ان میں کسی قسم کی کوئی قُدرت نہیں تو

وَقَالُوا لَا كِبَارًا لَّكُمْ بَعْدَ أَنْ تُوذُوا مَذْبُوحِينَ ۝ (۲۱/۵۷)

بخدا! میں ضرور تمہارے ان بُتوں کے خلاف ایک تدبیر کروں گا، جب تم سب پیٹھ پھیر کر چل دو گے۔

پھر دیکھوں گا یہ بُت کس طرح اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں یا مجھ پر کوئی آفت ڈھا دیتے ہیں؟ لوگوں نے ان کی یہ بات ایک کان سے سُنی اور دوسرے کان سے نکال دی۔ ان کے دل میں ان بتوں کی عظمت و تصرف کی عقیدت اس قدر گہری تھی کہ یہ بات ان کے حیطہ تصور میں بھی نہ آسکتی تھی کہ کوئی شخص ان کی طرف انگلی بھی اٹھا سکتا ہے۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ کو تو ان عقل کے اندھوں کو دکھادینا تھا کہ یہ پتھر کی مورتیاں کس درجہ بے بس ہیں۔ معبد خالی ہوا تو انہوں نے موقع پا کر ایک ایک بُت کے ٹکڑے کر دیئے اور سب سے بڑے بُت کو اسی طرح رہنے دیا کہ (جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا)۔ اس سے یہ تدبیر زیادہ نتیجہ خیز ہو گئی۔

فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا إِلَّا كَبِئْرًا لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ (۲۱/۵۸)

چنانچہ (اُس نے ایسا ہی کیا) اُس نے بتوں کو توڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ صرف ایک بُت جو ان میں بڑا سمجھا جاتا تھا، چھوڑ دیا کہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔

معبد میں کُہرام مچ گیا | ذرا تصور میں لائیے اس نظارہ کو کہ جب ان بتوں کے پرستار معبد میں

دوپہس آئے ہوں گے تو ان کی حالت کیا ہوگی۔ غیظ و غضب کا ایک طوفان برپا ہوا جس میں ہر طرف سے یہ آواز سنائی دی کہ

قَالُوا مَنْ فَعَلَ هَذَا بِآلِهَتِنَا إِنَّهُ لَمِنَ الظَّالِمِينَ ۝ (۲۱/۵۹)

انہوں نے کہا "ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی؟ (جس کسی نے کی ہو) وہ بڑا ہی ظالم ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اس ارادہ کا اظہار کر دیکھو میں ان بتوں سے کیا کرتا ہوں پجاریوں کی مخصوص جماعت کے سامنے کیا ہوگا اور عوام اس سے باخبر نہ ہوں گے۔ اس لئے عوام یقینی طور پر نہیں جانتے تھے کہ یہ کس کا کام ہے اور پجاری اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے کہ مبادا اس سے عوام

بگڑ بیٹھیں کہ جب تمہیں یہ چیلنج دے دیا گیا تھا تو تم معبد کی حفاظت سے اس قدر غافل کیوں ہو گئے۔ لیکن عوام کو یقینی طور پر علم ہو یا نہ ہو، بت پرستی کے متعلق حضرت ابراہیمؑ کا مسلک (ATTITUDE) تو سب پر واضح تھا۔ اس لئے ننگہ تپاس انہی کی طرف اٹھ سکتی تھی۔

قَالُوا سَمِعْنَا فَتَىٰ يَدُكُوسُ هُمْ يُقَالُ لَهُ اِبْرٰهِيْمُ ۝ (۳۱/۴۰)

چند آدمیوں نے کہا ”ہم نے ایک نوجوان کو ان کے بارے میں کچھ کہتے سنا تھا۔ اسے ابراہیم کہہ کر پکارتے ہیں“

پجاریوں نے کہا کہ

قَالُوا قَالُوا بِهٖ عَلٰی اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ۝ (۳۱/۴۱)

انہوں نے کہا۔ ”اسے یہاں تمام آدمیوں کے سامنے بلا لاؤ تاکہ سب گواہ رہیں۔

جب حضرت ابراہیمؑ تشریف لائے تو ان سے پوچھا گیا۔

قَالُوْا ؕ اَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاللّٰهِيْنَا يَا اِبْرٰهِيْمُ ۝ (۳۱/۴۲)

ان لوگوں نے ابراہیم سے کہا ابراہیم! کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی؟

واقعہ اپنی انتہائی نزاکت تک پہنچ چکا تھا۔ اب وقت تھا کہ جس غرض کے لئے یہ تدبیر عمل میں لائی گئی تھی

اسے قوم کے سامنے لایا جائے۔ اگر پجاریوں کے اس سوال کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ

کہہ دیتے کہ میں نے تو پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ میں ایسا کروں گا تو اصل مقصد پیچھے سرک جاتا۔ آپ نے

ان پجاریوں سے یہ کہا کہ تمہارا تو یہ دعوے ہے کہ بت تمہیں غیب کی خبریں سُنا دیا کرتے ہیں اور اسی

دعوے کی بنا پر تم عوام کو دھوکے میں رکھ کر ان پر تم اپنی خدائی کا سکہ جھمائے رکھتے ہو۔ اگر یہ سچ ہے

کہ یہ بت تمہیں لوگوں کے دلوں کی باتیں بھی بتا دیا کرتے

ہیں اور آنے والے واقعات تک سے بھی مطلع کر دیا

بات سمجھانے کا نیا انداز

کرتے ہیں، تو یہ سب سے بڑا بُرت ”خداؤں کا خدا“ تمہارے سامنے موجود ہے۔ ذرا اس سے پوچھو

کہ یہ کیا ہوا ہے؟

قَالُوْا ؕ اَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاللّٰهِيْنَا يَا اِبْرٰهِيْمُ ۝ قَالَ سَلْ

فَعَلَهُ ۝ كَيْفُ رُحْمُ هٰذَا فَسَلُّوْهُمْ اِنْ كَانُوْا

يَنْطِقُونَ ۵ (۶۲-۲۱/۹۳)

ان لوگوں نے ابراہیم سے کہا ابراہیم! کیا تو نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ ابراہیم نے کہا جس نے یہ کیا، تم اس کی بابت مجھ سے پوچھنے کی بجائے انہی بتوں سے پوچھو۔ اور ان میں سے بھی اس سے جو ان میں سب سے بڑا ہے۔ اگر بت بول سکتے ہیں تو تمہیں جواب دیدیں گے!

اس سوال و جواب پر ایک مرتبہ پھر غور کر لیجئے کہ آگے چل کر اس کے متعلق ایک اہم حقیقت سامنے آئے گی۔ بات بالکل صاف ہے کہ یہ ایک الزامی حجت تھی۔ پجاریوں سے یہ مخفی نہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ ہی نے یہ حرکت کی ہے اس لئے کہ آپ نے علی الاعلان ایسا کہا تھا۔ اس جواب سے بیک وقت دو کام ہو گئے۔ ایک طرف تو عوام پر ان بتوں کی عجز و اماندگی آشکارا ہو گئی اور دوسرے پجاریوں کی اس اہل فریبی کا پردہ بھی چاک ہو گیا کہ یہ بت انہیں تمام باتوں سے آگاہ کر دیا کرتے ہیں۔ پجاریوں پر یہ زرد ایسی پڑی کہ جو اس گم ہو گئے اور چپکے سے ایک طرف جا کر

فَرَجَعُوا إِلَىٰ أَنفُسِهِمْ فَقَالُوا إِنَّكُمْ أَنْتُمُ الظَّالِمُونَ ۵ (۲۱/۹۴)

تب وہ آپس میں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ بات تو یہ ٹھیک کہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ہی ناحق پر ہیں۔

لیکن حضرت ابراہیمؑ ان کے جواب کے انتظار میں تھے۔ وہ سامنے آئے تو ندامت سے سر جھکائے ہوئے۔

لَمَّا نَسُوا عَلَىٰ رُءُوسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا هَؤُلَاءِ يَنْطِقُونَ

(۲۱/۹۵)

پھر وہ اس حال میں پڑ گئے کہ (شرم و خجالت سے) سر جھکے ہوئے تھے وہ اس سے کہنے لگے کہ تم ہمیں رسوا کرنے کے لئے اس قسم کے سوالات کر رہے ہو، ورنہ تمہیں خود معلوم ہے کہ یہ بت بات نہیں کیا کرتے۔

ذرا اس ٹکڑے پر پھر غور فرمائیے کہ لَقَدْ عَلِمْتُمْ حضرت ابراہیمؑ سب سے بڑے پجاری کے

لے ان الفاظ کا ایک اور بھی مفہوم ہے جسے استدراک کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

بیٹے تھے اس لئے گھر کے بھیدی پجاریوں نے آپ سے کہا کہ یہ تو تم جانتے ہو کہ یہ بت دولا نہیں کرتے۔ ان کی نسبت جو کچھ ہم نے مشہور کر رکھا ہے، فقط دایم فریب ہے۔ اب جو پجاری یوں غاسر و نام ہوتے

اصل حقیقت | تو حضرت ابراہیمؑ نے انہیں اور عوام کو مخاطب کر کے لکارا اور کہا کہ یہ واقعہ تمہارے سامنے ہے۔ کچھ بت تو یہ ٹوٹے پڑے ہیں۔ ان میں سے کسی میں یہ طاقت نہ ہوئی کہ اپنے آپ کو بچا سکتا اور یہ سب سے بڑا "خدا" بت بنا سامنے کھڑا ہے۔ یہ نہ ان چھوٹے خداؤں کی حفاظت کر سکا نہ مجھ پر ہی اپنا عتاب نازل کر سکا اور نہ اب ان پجاریوں کو ہی کچھ بتاتا ہے۔

قَالَ أَفَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ ۗ (۲۱/۶۶)۔

اس نے کہا کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبود اختیار کرتے ہو جو نہ تمہیں کچھ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔

یہ ہیں تمہارے خدا؟

أَفِ لَكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۗ (۲۱/۶۷)۔

کس قدر قابل افسوس ہے تمہاری حالت اور ان کی بھی جنہیں تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو۔ کیا تم عقل سے بالکل کدے ہو گئے؟

حجت کا اتمام ہو گیا۔ وہی حقیقت جو اس سے پہلے لطیف اشاروں میں سمجھائی جاتی تھی اب محسوس شکل میں سامنے لائی گئی۔ لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ پجاریوں نے اپنی منہی ہوئی عظمت کو بچانے کے لئے کیا کچھ نہ کیا ہوگا! انہوں نے عوام کے جذبات کو بھڑکایا اور خوب بھڑکایا اور چلا کر کہا کہ

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَ انصُرُوا إِلَهَتَكُمْ ۚ إِنَّكُمْ فَعِلِينَ ۗ (۲۱/۶۸)۔

انہوں نے (آپس میں) کہا اگر ہم میں کچھ بھی ہمت ہے تو آؤ اس آدمی کو آگ میں ڈال کر جلا دیں اور اپنے معبودوں کا بول بالا کریں۔

وہی استبداد کے اہلسانہ حربے جو حق و صداقت کی آواز کو دبانے کے لئے شروع سے آج تک استعمال ہوتے چلے آ رہے ہیں! وہ لوگوں کے جذبات کو اس طرح مشتعل کر رہے تھے لیکن حضرت ابراہیمؑ کی (خدا کی طرف سے دی ہوئی راہ نمائی کے مطابق) یہ تدبیر تھی کہ ان کے غصے کی آگ بھڑکنے نہ پائے اور

ابراہیمؑ کے حق میں اسن وسلامتی کا موجب بن جائے۔

قُلْنَا يَا كُوفِي بَرِّدًا وَسَلَامًا عَلٰی
اِبْرٰهِيْمَ ؕ (۲۱/۶۹)

چنانچہ آخر الامر ہوا یہ کہ

وَ اَزَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمْ اِلَّا خٰسِرِيْنَ ؕ (۲۱/۷۰)

وہ اس کے خلاف اپنی تدبیر کا ارادہ کر رہے تھے۔ لیکن ہم نے ایسا کیا کہ وہ اپنے ارادے میں ناکام رہ گئے (اور ہم ابراہیمؑ کو وہاں سے نکال کر لے گئے۔ ۳۷/۹۸)۔

اس سے ظاہر ہے کہ وہ ابھی اس کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ کو پھر کر زندہ جلا دیا جائے کہ حضرت ابراہیمؑ وہاں سے محفوظ طور پر نکل گئے۔ (تفصیل آگے آتی ہے)۔

باندازِ دیگر | یہ تھا سورۃ انبیاء کا بیان۔ سورۃ صافات میں بھی یہی واقعہ مذکور ہے لیکن تھوڑی سی تبدیلی
تفصیل کے ساتھ۔

وَ اِنَّا مِنْ شَيْعَتِهِ اِبْرٰهِيْمَ ؕ اِذْ جَاءَ رَبُّهٗ بِقَلْبِ سَلِيْمٍ
اِذْ قَالَ لِوَلَدَيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ؕ اَلَيْفَكَ الْاِلٰهَةُ دُوْنَ
اِلٰهِ تَرْبٰدُوْنَ ؕ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ (۸۳ - ۸۷)

اور نوح ہی کے گروہ میں سے ابراہیمؑ بھی تھا۔ (یاد کرو) جب وہ قلبِ سلیم لے کر اپنے پروردگار کے حضور متوجہ ہوا، وہ اپنے باپ اور اپنی تمام قوم سے ہمیشہ کہتا رہتا تھا کہ ”تم کن چیزوں کی عبودیت اختیار کر رہے ہو؟ (سوچو تو سہی) کیا خدا کو چھوڑ کر جھوٹ موٹ کے معبودوں کی اطاعت کرتے ہو۔ پھر تمام جہانوں کے پروردگار کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

ان آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی قوم کو بت پرستی سے روکنے کی کوشش کرتے رہتے

۱۔ (وہ ابراہیمؑ کے خلاف عداوت اور انتقام کی آگ اس طرح بھڑکا رہے تھے) اور ہم ایسا انتظام کر رہے تھے کہ اس آگ کے شعلے سرد پڑ جائیں اور وہ ابراہیمؑ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکیں۔

تھے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ وہ بُت پرستی کے خلاف ہی نہیں ستارہ پرستی کے خلاف بھی تبلیغ کرتے رہتے تھے۔

فَنظَرَ نَظْرَةً فِي الْجُومِ ۗ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ ۝ فَتَوَلَّوْا
عَنْهُ مُدْبِرِينَ ۝ (۸۸-۹۰/۳۴)

وہ ان کے معبود ستاروں میں طرح طرح کے نقائص نکال کر انہیں سمجھاتا اور ان سے کہتا کہ میں تمہاری ان باتوں سے سخت نالاں ہوں اور ان معبودوں سے سخت بیزار۔ وہ اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ دے سکتے اور مُنہ پھیر کر چل دیتے۔

اس کے بعد وہی ”بُت شکنی“ کا واقعہ سامنے آتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک مرتبہ دیکھا کہ معبود خالی ہے۔ وہ اندر جا گھسے۔ دیکھا کہ بتوں کے سامنے کھانے پینے کی چیزیں بطور چڑھاوار کھی ہیں۔ ان سے طنزاً کہنے لگے کہ:-

أَوْ تَأْكُلُونَ ۚ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُونَ ۝ (۹۱-۹۲)

تم انہیں کھاتے نہیں؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم کچھ بولتے بھی نہیں۔

اس کے بعد۔

تیشہ ابراہیمیؑ | فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ ۝ (۹۳/۳۴)

پھر اپنے دائیں ہاتھ سے (یعنی پوری قوت کے ساتھ) ان پر ایک ضرب

رسید کی (اور انہیں توڑ ڈالا)۔

لوگوں کو جب معلوم ہوا تو بھاگے ہوئے معبود کی طرف آئے۔

فَأَقْبُوا إِلَيْهِ يَزْعُمُونَ ۝ (۹۴/۳۴)

پھر (جب لوگوں کو معلوم ہوا تو) وہ ابراہیمؑ کی طرف

دوڑے ہوئے گئے۔

باقی تذکرہ سورۃ انبیاء میں (پہلے) گزر چکا ہے۔ انکشاف حقیقت کے بعد آپ نے فرمایا:-

قَالَ اتَّعْبُدُونَ مَا تَخْلُقُونَ ۚ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ۝

ابراہیم نے کہا کیا تم ان بتوں کی پرستش کرتے ہو جنہیں (اپنے ہاتھوں سے) تراشتے ہو۔ حالانکہ خدا نے ہی تمہیں پیدا کیا ہے اور (تمہارے ان تمام افعال کو بھی) جو کچھ تم کرتے ہو۔ اس پر غم و غصہ کا طوفان اُمنڈا اور انہوں نے کہا۔

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ (۳۴/۹۷)
لوگوں نے کہا (بس بہت ہو چکی۔ اب) اس کے واسطے ایک آتش خانہ بناؤ اور اسے دہکتی ہوئی آگ میں ڈال دو۔

اس کے بعد کیا ہوا، اسے ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ اس دوران میں ایک اور DEVELOPMENT ہوگئی۔ پہلے اسے دیکھ لیجئے۔

بادشاہ سے بحث | دعوتِ ابراہیمی کا تذکرہ آگے بڑھا۔ بات ایسی نہ تھی جو چھپی رہ جاتی۔ اُسے بادشاہ وقت تک پہنچا گیا۔ اس زمانہ کے مطلق العنان بادشاہ ایکسر استبداد کے مجسمے۔ اُسے دعوتِ توحید میں، دیوتاؤں کی خدائی سے زیادہ خود اپنی خدائی کے چھن جانے کا خوف تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کو بلایا اور خدائے واحد کے بارے میں بحث و جدل شروع کر دی۔ سورۃ بقرہ کے پینتیسویں رکوع میں ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ حَاجَّوْا بَرَّهْمَ فِي رَيْبَةِ أَنْ أَلَّهِ
اللَّهُ الْمَلِكُ (۲/۲۵۸)

(اے پیغمبر!) کیا تم نے اس شخص کی حالت پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے اس کے پروردگار کے بارے میں حجت کی تھی کہ خدا نے اُسے پادشاہت دے رکھی تھی؟ (یعنی تاج و تختِ شاہی نے اس کے اندر ایسا گمنڈ پیدا کر دیا تھا کہ خدا کے بارے میں حجت کرنے لگا تھا)۔

بادشاہ نے پوچھا کہ تم غیر اللہ کی پرستش چھڑا کر جس خدا کی طرف دعوت دیتے ہو اس خدا کی خصوصیات کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا۔

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ لَهُ

ابراہیم نے کہا میرا پروردگار وہ ہے جس کے قانون کے مطابق موت اور زندگی کے فیصلے ہوتے ہیں۔

اس کے جواب میں اُس سرکشی و طغیان کے پیکر نے اپنی شانِ نمرودیت سے کہا کہ اس کا کیا ہے؟

قَالَ اَنَا اُخِي وَ اُمِيَّتُ ۝ (۲/۲۵۸)

میری مملکت میں موت اور زندگی کے فیصلے میرے حکم سے ہوتے ہیں۔

یہاں پھر وہی بات سامنے آئی جس کا تجربہ قوم کی طرف سے ہو چکا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دلیل بڑی لطیف و عمیق تھی۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ محوسات کے بت کہہ میں گھرا ہوا بادشاہ حقیقت کو مجاز کا نقاب اوڑھا کر اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ آپ چاہتے تو اس دلیل کی رو میں بیس دلیلیں پیش کر دیتے۔ لیکن وہاں پیش نظر "مناظرانہ فتح مندی" نہ تھی، مقصد احقاقِ حق تھا۔ چنانچہ آپ نے اس دلیل کو چھوڑ کر جس کے تعاقب سے نظری بحث میں اُلجھ کر اصل مقصد سے دُور نکل جانے کا خطرہ تھا، فوراً محسوس طریقے استدلال اختیار کیا اور فرمایا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ يَأْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِيْ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ (۲/۲۵۸)

اچھا اگر ایسا ہی ہے (کہ تمہاری مملکت میں سب کچھ تمہارے حکم سے ہوتا ہے) تو اللہ سورج

کو پورب کی طرف سے (زمین پر) طلوع کرتا ہے، تم کچھم سے نکال کر دکھاؤ۔

جواب نہ بن پڑا | یعنی اگر تم سمجھتے ہو کہ تم خدائی قوتوں کے مالک ہو تو لاؤ سورج کو مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔ ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ تمہیں کس قدر اختیارات حاصل

ہیں۔ اس تحدی کا جواب کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔

فَبُهِّتَ الَّذِي كَفَرَ ۝ (۲/۲۵۸)

وہ (بادشاہ) جس نے انکار کی راہ اختیار کر رکھی تھی اپنا سامنہ لیکر رہ گیا۔

لیکن اس کے باوجود اُسے اعترافِ حقیقت کی جرأت نصیب نہ ہوئی کیونکہ اس سے اپنی جھوٹی عزت و عظمت پر حرف آتا تھا اور "خدائی" کی جگہ "بندگی" اختیار کرنی پڑتی تھی۔

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ جب اس قوم کے اجبار و رہبان حضرت ابراہیمؑ کے مسکت دلائل اور

سکتا یعنی شہادت کے سامنے لاجواب ہو گئے تو سچائے اس کے کہ اعترافِ حقیقت کر لیتے انہوں نے عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور تجویز کیا کہ آپ کو زندہ آگ میں ڈال دیا جائے۔ **تمر کی آگ** کیونکہ ان کے نزدیک بہتوں کی توہین اور مسلکِ بُت پرستی سے بغاوت، جُرمِ عظیم تھا اور ایسے جرائم کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ مجرم کو زندہ نذرِ آتش کر دیا جائے۔ سورۃ صافات میں ہے۔

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ۝ (۳۷/۹۷)

لوگوں نے کہا (بس بہت ہو چکی۔ اب) اس کے لئے ایک آتش خانہ بناؤ اور دہکتی ہوئی آگ میں اسے ڈال دو۔

انہوں نے یہ تدبیر کی لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے خاک میں ملا دیا اور وہ اپنے مشغوم ارادوں میں غامض نامراد رہے۔

فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ۝ (۳۷/۹۸)

چنانچہ انہوں نے اس کے ساتھ ایک منصوبے کا ارادہ کیا مگر ہم نے انہیں ہی بچا دکھا کر چھوڑا (کہ ان کی تمام تدبیریں خاک میں ملا دیں)۔

دیکھتے، یہاں پھر فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا کہا ہے، یعنی انہوں نے ابراہیمؑ کے خلاف اس منصوبے کا ارادہ کیا تھا، سچ مچ انہیں آگ کی بھٹی میں نہیں ڈال دیا تھا۔ وہ ابھی اپنی تدبیروں ہی میں لگے ہوئے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ اس مقام سے ہجرت فرما کر دوسری جگہ تشریف لے گئے۔

وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝ (۳۷/۹۹)

ابراہیمؑ نے کہا میں اس مقام کو چھوڑ کر وہاں جا رہا ہوں جہاں اس نظامِ ربوبیتِ خداوندی کی تشکیل کے لئے حالات زیادہ سازگار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میرا پروردگار وہاں میرے لئے بہت جلد کشادگی راہیں کھول دے گا۔

سورۃ عنکبوت میں ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ فَأَنْجَاهُ اللَّهُ

مِنَ النَّارِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ (۲۹/۲۴)

پس اس کی قوم کا اس کے سوا کوئی جواب ہی نہیں تھا کہ وہ کہنے لگے کہ ابراہیم کو قتل کرو یا (زندہ) جلادو۔ اللہ نے اُسے آگ سے بچالیا۔ بلاشبہ اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہوں (بڑی بڑی) نشانیاں (پہنایاں) ہیں۔

اس واقعہ کو سورۃ انبیاء میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَ الصُّورَۃَ الَّتِي كُنْتُمْ فَعَلِيْنَ ۝ (۲۱/۶۸)
انہوں نے (آپس میں) کہا اگر ہم میں کچھ بھی ہمت ہے تو آؤ اس آدمی کو آگ میں ڈال کر جلادیں اور اپنے معبودوں کا بول بالا کریں۔

اس کے بعد ایک آیت چھوڑ کر کہا۔

وَ جَعَلْنَاهُ دَلِيلًا لِّاٰلِ الْاَرْضِ الَّتِي بَرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَ وَ هَدَيْنَا
لَهُۥٓ اِسْحٰقَ ۙ وَ يَعْقُوْبَ نٰفِلًا ۙ وَ كَلَّمَا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝ (۲۱/۶۲-۶۱)

اور دیکھو ہم نے اُسے اور اُس کے بھتیجے (لوط کو) دشمنوں سے) نجات دلا کر ایک ایسے ملک میں پہنچا دیا جسے قوموں کے لئے (بڑا ہی) بابرکت ملک بنایا ہے (یعنی سرزمین کنعان) اور (پھر) ہم نے اُسے (ایک فرزند) اسحاق عطا فرمایا اور مزید برآں (پوتا) یعقوب۔ ان سب کو ہم نے نیک کردار بنایا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کی سلامتی | ان مقامات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس سرکش و متہرّد قوم نے اپنے جوش انتقام میں یہ منصوبہ باندھا کہ حضرت ابراہیمؑ کو

آگ کے انبار میں ڈال دیا جائے تاکہ ان کے معبود روز روز کی تحقیر و تذلیل سے محفوظ رہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ ان پر ہاتھ ڈالتے آپ حکم خداوندی کے مطابق وہاں سے چپکے سے ہجرت کر گئے اور یوں وہ قوم اپنے ارادوں میں ناکامیاب رہی۔ جس طرح جب اہل مکہ نے یہ سازش کی کہ نبی اکرمؐ کو رات کی تاریکی اور خاموشی میں قتل کر دیا جائے، تو آپؐ نے بحکم خداوندی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور یوں قریش کے خفیہ منصوبے خاک میں مل گئے۔

تقریب کے صفحات میں ہم حضرت ابراہیمؑ کو مع ان کے برادر زادہ (حضرت لوطؑ) اور آپؑ کی ہجرت (حضرت سائرہ) کے مصرتک سفر کرتے دیکھتے ہیں جہاں کے بادشاہ نے

اپنی بیٹی (حضرت ہاجرہ) کو آپ کے عقد میں دیا۔ اس کے بعد آپ نے فلسطین (کنعان میں مستقل سکونت اختیار فرمائی۔ قرآن کریم میں اس ہجرت کے متعلق کئی ایک مقامات پر ذکر آیا ہے۔
سورہ مریم میں ہے۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَ مَا يُعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَ هَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ
وَ يَعْقُوبَ ۗ وَ كُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۗ وَ هَبْنَا لَهُمْ مِنْ رَحْمَتِنَا وَ
جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيمًا ۝ (۱۹/۵۰-۴۸)

پھر جب ابراہیم ان لوگوں سے اور ان سب سے جنہیں وہ اللہ کے سوا معبود مانتے تھے الگ ہو گیا تو ہم نے (اس کی نسل میں برکت دی اور) اسے اسحق اور (اسحق کا بیٹا) یعقوب عطا فرمایا۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے نبوت دی تھی اور اپنی بخشش کی رحمت سے سرفراز کیا تھا۔ نیز ان سب کے لئے سچائی کی صدائیں بلند کر دیں (جو کبھی خاموش ہونے والی نہیں)۔

سورہ انبیاء میں ہے۔

وَ جَعَلْنَاهُ ۗ وَ لُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ ۝
نَافِلَةً ۗ وَ كُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ ۝ (۲۱/۷۲-۷۱)

ہم نے اسے اور (اس کے بھتیجے) لوط کو دو شمنوں سے نجات دلا کر ایک ایسے ملک میں پہنچادیا جسے قوموں کے لئے (بڑا ہی) بابرکت ملک بنا دیا (یعنی سرزمین کنعان) اور (پھر) ہم نے اُسے (ایک فرزند) اسحق عطا فرمایا اور مزید برآں (پوتا) یعقوب۔ ان سب کو ہم نے عمدہ صلاحیتوں کا مالک بنا دیا تھا۔

سورہ عنکبوت میں آگ سے محفوظ رکھنے کے بعد کہا۔

فَأَمَّنَ لَهُ ۗ لُوطٌ م وَ قَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَى رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ ۗ وَ هَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَ يَعْقُوبَ وَ جَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ
التُّبَوَّةَ وَ الْكُتُبَ وَ آتَيْنَاهُ آجْرَهُ فِي الدُّنْيَا ۗ وَ آتَيْنَاهُ
فِي الْآخِرَةِ كَيْمًا ۝ الصَّالِحِينَ ۝ (۲۹/۲۷-۲۶)

چنانچہ لوط اس پر ایمان لایا اور ابراہیم نے کہا، میں اپنے پروردگار (کی بتائی ہوئی سرزمین)

کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔ بلاشبہ وہ (ہر چیز پر) غالب اور (ہر کام میں) حکمت والا ہے۔ اور ہم نے اُسے اسحق اور یعقوب (جیسا بیٹا اور پوتا) عطا کیا اور اس کی اولاد میں (قیامت تک کے لئے) نبوت اور کتاب (کے سلسلہ) کو قائم کر دیا اور ہم نے دنیا میں بھی اُس کے نیک اعمال کا اجر سے دے دیا (کہ تمام عالم انسانی کا اُسے امام بنا دیا) اور حقیقت یہ ہے کہ وہ آخرت میں بھی صالحین میں سے ہوگا۔

”إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَى رَبِّي“ کے ٹکڑے پر غور فرمائیے۔ سورۃ صافات میں اسی روح کو دوسرے الفاظ کا پیکر عطا ہوا ہے جہاں فرمایا۔

وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَى رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝ (۲۹)

اس نے کہا کہ میں ”اپنے رب کی طرف“ جاتا ہوں۔ وہ مجھ پر

کامیاب ہوں اور کامرانہوں کی راہیں کھول دے گا۔

ہجرت کا مفہوم و مقصود | اس ترک وطن کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ دعوتِ حق و صداقت کی راہ میں اس قدر زہرہ گداز اور جگر شکاف آزمائشوں سے

(معاذ اللہ) منہ موڑ کر چل دیئے بلکہ خدا کے حکم سے خدا کی راہ میں مزید سعی و کوشش کی غرض سے ایک مساعد ماحول اور تخم گیر اور بار آور سرزمین کی طرف ہجرت فرمائی۔ حضرات انبیاء کرام کے اسوۃ مقتدرہ میں ہجرت ایک عظیم الشان انقلاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے جس کے اندر ملتِ حنیفیہ کے لئے ایک بھیت افرزا اور حیات آور پیغام مضمربے۔ نظامِ خداوندی کا داعی بہر حال ایک خاص مقام میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں کے رہنے والے اس کے پیغام کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ وہ انتہائی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے گرو و پیش کی فضا کو اس نظام کے لئے سازگار بنائے۔ لیکن جب وہ دیکھ لیتا ہے کہ فضا کی کمزوریاں ایسی محکم ہو چکی ہیں کہ ان کا تنزیہ ناممکن ہے، تو بجائے اس کے کہ وہ اس نامساعد ماحول میں زندگی بسر کرنے پر اپنے آپ کو مجبور سمجھے، وہ اس ماحول کو چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کر جاتا ہے جہاں اس نظامِ الہیہ کے قیام و بقا کے لئے زیادہ امکانات نظر آتے ہیں۔ یہ ہے خاکِ وطن اور ایمانِ مومن کا باہمی تعلق۔ مردِ مومن باہر نکل نہیں پیدا کیا گیا کہ وہ کسی خاص سرزمین میں بیوسر ہو کر رہ جائے۔ وہ آزاد پیدا کیا گیا ہے کہ جہاں اُسے قانونِ خداوندی کی اطاعت کے بجائے انسانوں کی غلامی پر مجبور کیا جائے کہ وہ خدائے ارض و

سموت کی اس فضائے بیط میں بال کشا ہو اور جہاں اُسے خالص اللہ کی محکومیت کے لئے فضا ساز گلہ نظر آئے، سکونت پذیر ہو جائے۔ بقول علامہ اقبالؒ۔

ہجرت آئین حیاتِ مسلم است این ز اسباب ثباتِ مسلم است
معنی او از تنگ آبی رم است ترکِ شبنم بہر تسخیرِ یم است

اگر آپ کسی ایسے کمرے میں بیٹھے ہوں جہاں کونکہ کی گیس آہستہ آہستہ ساری فضا کو زہر آلود کئے جا رہی ہے تو آپ کی پہلی کوشش یہ ہوگی کہ جلدی سے کمرے کی کھڑکیاں اور روشن دان کھول دیتے جائیں۔ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ وہ اس طرح سے بند ہیں کہ آپ کی کوشش سے کھل نہیں سکتے تو آپ اطمینان سے کمرے میں نہیں بیٹھ جائیں گے بلکہ پوری قوت سے دروازہ توڑ کر کسی نہ کسی طرح باہر نکل جانے کی کوشش کریں گے تاکہ کھلی ہوئی سانس لے سکیں۔ یہ انسان کا طبعی تقاضا ہے۔ اس میں کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں۔ حتیٰ کہ پرندوں اور مویشیوں تک کی یہ حالت ہے کہ جب کسی ایک ماحول میں ان کی ضروریاتِ زندگی کے سامان مفقود یا اس کی فضا نامساعد ہو جاتی ہے تو وہ اس مقام کو چھوڑ کر کسی دوسرے مقام کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ طبعی تقاضوں کے ماتحت رونما ہوتا ہے۔ لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) انسان کی زندگی فقط حیوانی (طبعی) زندگی نہیں۔ اس سے آگے، انسانی زندگی اور اس کے تقاضے بھی ہیں جن انسانوں کو اس انسانی زندگی کا احساس ہوتا ہے، ان کے نزدیک کسی ایسی فضا میں سانس لینا، جہاں غیر اللہ کی حکومت سے ان کی انسانیت کا دم گھٹ رہا ہو، ہلاکت آفریں ہوتا ہے۔ اس لئے اس قسم کا انسان اس فضا کو چھوڑ کر کسی مساعد فضا میں جانے کے لئے اُس شخص سے بھی زیادہ مضطرب و بے قرار ہو گا جو کونکے کے گیس سے مسموم کمرے میں گھر چکا تھا۔ لیکن اس میں سوال فقط احساس کا ہے۔ جو شخص کونکے کے گیس سے بے ہوش ہو چکا ہو وہ کمرہ چھوڑ دینے کے لئے مضطرب نہیں ہو گا۔ اس میں اس کا احساس و شعور ہی باقی نہیں رہا۔ اسی طرح جس کی "انسانیت" غیر خداوندی نظام کی محکومیت سے اس درجہ ماؤف ہو چکی ہو کہ اس میں احساس و شعور ہی باقی نہ رہے اس میں اس فضا کو چھوڑنے کا خیال تک بھی پیدا نہیں ہو گا۔ نہیں! بلکہ وہ تو اس پرندے کی طرح، جو قفس کی زندگی کا خوگر ہو چکا ہو، اصل زندگی پنجرے کی تیلیوں کے پیچھے ہی محسوس کرے گا۔ اسے اگر آپ باہر نکالنے کی کوشش بھی کریں گے تو وہ پھر اندر جانے پر مہر ہو گا۔ جس کی ذہنیت یوں مسح ہو چکی ہو وہ "ذہبِ رانی دینی" کا مفہوم کیا

سمجھے؟ اپنی ذہبتِ اِلیٰ رَبِّیْ اور اِیُّیْ مُسَاجِدُ اِلیٰ اللّٰہِ کا مفہوم یہ ہے کہ مومن ہمیشہ غیر خدا ماحول سے خدائی ماحول کی طرف رُخ کرتا ہے اور اس میں وطن کی محبت کی خاردار جھاڑیاں بھی دامن گیر نہیں ہوتیں۔ اس کا حقیقی وطن وہی ہے جہاں قوانینِ خداوندی کی حکومت ہو اور جب ان قوانین کی حکومت ساری دنیا پر پھیل جائے تو ساری دنیا اس کا وطن ہے اور یہی اس کا نصب العین حیات ہے۔

(تفصیل ان امور کی "معراجِ انسانیت" میں ہجرت کے عنوان میں ملے گی)۔

اولادِ ابراہیمیؑ | معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے قبل حضرت ابراہیمؑ کے یہاں کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اور ان کے بیٹے حضرت یعقوب کی بشارت دی گئی ہے۔ لیکن دوسرے مقام پر ایک اور "غلامِ حلیم (نہایت ثقہ اور وقیع بیٹے) کی بشارت ہے۔

فَبَشِّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ (۳۱)

پس (دیکھو ہم نے اسے ایک حلیم لڑکے کی (پیدائش کی) خوشخبری دیدی۔

اس سے حضرت اسمعیلؑ مراو ہیں۔ چنانچہ تورات میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ ۸۷ سال کے ہوئے تو حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسمعیلؑ تولد ہوئے اور آپ کی ولادت سے تیرہ سال بعد جب (حضرت ابراہیمؑ کی عمر ایک سو سال کی ہوئی) حضرت سائرہ کے بطن سے حضرت اسحقؑ پیدا ہوئے۔ قرآن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت سائرہ (جیسا کہ عورت کی طبیعت کا تقاضا ہے) اولاد نہ ہونے کی وجہ سے مغموم رہتی تھیں اور چونکہ عمر زیادہ ہو چکی تھی اس لئے

کبرسنی میں اولاد کی بشارت | روز بروز مایوسی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس مایوسی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے فرستادوں کی زبانی حضرت اسحقؑ کی پیدائش کا مزہ دسترس بخش سنایا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن کریم کے کئی ایک مقامات میں آیا ہے۔ سورہ ہود میں ہے۔

وَ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا اِبْرٰهٖمَ بِالْبَشْرِی قَالُوْا سَلٰمًا
قَالُوْا اَنْتَجِبٰیْنِ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَةً اللّٰهِ وَ بَرَکٰتُهٗ عَلَیْكُمْ

أَهْلَ الْبَيْتِ ط إِنَّهُ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ ۝ (۶۹ - ۷۳/۱۱)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے تھے۔ انہوں نے کہا تم پر سلامتی ہو۔ اس نے بھی کہا تم پر بھی سلامتی ہو۔ پھر ابراہیم فوراً ایک بھٹنا ہوا اچھڑا لے آیا اور ان کے سامنے رکھ دیا کہ میرے ہمان ہیں۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھتے نہیں، تو ان سے بدگمان ہوا اور جی میں ڈرا (کہ یہ کیا بات ہے؟) انہوں نے کہا ”خوف نہ کر ہم تو اللہ کی طرف سے قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ اور اس کی بیوی بھی (خیمہ میں) کھڑی (سُن رہی) تھی۔ وہ ہنس پڑی (یعنی اندیشے کے دور ہو جانے سے خوش ہو گئی) پس ہم نے اسے اپنے فرستادوں کے ذریعے اسحاق (کے پیدا ہونے) کی خوشخبری دی اور اس کی کہ اسحاق کے بعد یعقوب کا ظہور ہو گا۔ وہ بولی، افسوس مجھ پر! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میرے اولاد ہو، حالانکہ میں بڑھیا ہو گئی ہوں اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہو چکا ہے؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے! انہوں نے کہا کیا تو اللہ کے کاموں پر تعجب کرتی ہے؟ اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں تجھ پر ہوں! اے اہل خانہ ابراہیم! اس کے فضل و کرم سے یہ بات کچھ بعید نہیں ہے۔ بلاشبہ اسی کی ذات ہے جس کی ستائشیں کی جاتی ہیں اور وہی ہے جس کے لئے ہر طرح کی بڑائیاں ہیں!

اسی واقعہ کو (۵۱ - ۵۶/۱۵) اور (۲۲۱ - ۲۳۰/۵۱) میں بھی دہرایا گیا ہے۔

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم میں اس کی تصریح نہیں کی گئی کہ حضرت ابراہیمؑ کی دو بیویاں تھیں اور ایک کے بطن سے حضرت اسحقؑ پیدا ہوئے تھے اور دوسری بیوی کے بطن سے حضرت اسمعیلؑ۔ یہ تفصیل تو رات میں ہیں۔

یہ پہلے آچکا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے دیکھا کہ یہ نو وارد کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے تو ان سے خائف ہوئے۔ (۵۱/۲۵) میں کہا گیا ہے کہ وہ قَوْمٌ مُّتَّكِرُونَ (۱) جنہی لوگ) تھے۔ ایک تو حضرت ابراہیمؑ سے ان کا سابقہ تعارف نہیں تھا۔ پھر جب آپ نے اپنی خوئے مسافر نوازی کی رو سے اُنکے کھانے کا انتظام کیا تو دیکھا کہ وہ کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے۔ اس سے آپ کے دل میں شبہ پیدا ہوا کہ یہ

لوگ کسی نیک ارادے سے یہاں نہیں آئے جو میرے یہاں سے کھانا بھی نہیں کھانا چاہتے (جیسے آج بھی ہمارے ہاں یہ دستور نہیں تو کم از کم مقولہ) ضرور ہے کہ جس کے ہاں کانک کھالیا جائے اس کا حلیف بننا پڑتا ہے۔

بہر حال ان حالات کے ماتحت حضرت اسحق کی پیدائش کی خوشخبری پہنچی۔ مقامات مندجہ بالا میں انسانی طبیعت کی ایک لطیف سی جھلک قابل غور ہے۔ مرد کتنا ہی بوڑھا ہو چکا ہو اس کے لئے نئی اولاد کسی قسم کی جھجک کا باعث نہیں ہوتی۔ لیکن ایک سن رسیدہ عورت کے لئے اولاد کا تصور خواہ اس کی آرزو کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو (خفیف سے حجاب کا باعث ضرور ہوتا ہے۔ انسانی طبیعت کی یہی وہ جھلک ہے جو حضرت سارہ کی ان حرکات سے بے نقاب ہو رہی ہے جو اس کبر سنی میں بیٹے کی اس خوشخبری سے اُن سے خود بخود مسزد ہو گئیں۔ دل میں احساسِ محبوبیت، لب پر یوہلیتی اور ہاتھ پیشانی پر فطرتِ نساہت کی کیسی صحیح تصویر ہے؟

حضرت ابراہیمؑ فلسطین میں اقامت پذیر تھے جسے آپ کی ذُریت (بنی اسرائیل) کے لئے برکت والی زمین قرار دیا گیا تھا۔ لیکن خدا کے پروگرام کے مطابق دعوتِ ابراہیمیٰ کو کسی خاص خطہ ارض میں محدود نہیں رہنا تھا، اسلام نوعِ انسانی کا دین ہے۔ اس لئے ہمہ گیری اور آفاقیت (UNIVERSALISM) خود اس کی فطرت میں داخل ہے جیسا کہ ہم اہلسن آدمؑ میں عنوان "شجر ارتقا کا گلِ سرسبد" میں بیان کر چکے ہیں مشیت کے پروگرام کے ماتحت ایک تدبیر (اسکیم) کی ابتدا ہوتی ہے۔ پھر وہ تدبیر اپنے تدریجی ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی ایک عرصہ دراز میں (جس میں ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے) اپنی تکمیل تک پہنچتی ہے۔ ایسی ہی تدبیر کے مطابق شجرِ ابراہیمیٰ کی دوسری شاخ (۱۱ اسمعیلی) کے متعلق یہ طے پایا کہ وہ ایک ایسی سر زمین میں پیوست ہو جائے جہاں سے وہ بڑھتی، پھولتی، پھلتی اور پھلتی ایک دن تمام اطراف و اکنافِ عالم پر چھا جائے۔ کَثْبَعْدَةُ طَيْبَةٍ

لے حضرت ابراہیمؑ کے توطنِ فلسطین کے بعد ان کے برادر زادہ حضرت لوط، سدوم اور عمورہ کے علاقہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے جو اس قطعہ ارض میں نہایت شاداب اور زرخیز علاقہ تھا۔

أَصْلُهَا ثَابِتٌ دَفْرُوعًا فِي السَّمَاءِ (۱۳/۲۳) اُس شجر مقدس کی طرح جس کی جڑیں پاتاں میں ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ چنانچہ اس مقصدِ عظیم کے لئے سرزمین حجاز کا انتخاب ہوا اور حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پہلوٹے بیٹے (حضرت اسمعیلؑ) کو فلسطین و شام کی سرسبز و شاداب وادیوں سے نکال کر عرب کے بے برگ و گیاہ صحرائے نعی و دق میں آسایا۔ اس لئے کہ مشیت کے پروگرام کے مطابق اُن فرخندہ و شاداب وادیوں کو ایک دن دیرانوں میں تبدیل ہو جانا تھا اور اس بے برگ و گیاہ ویرانے کو جنت کی حسین ترین ابدی بہاروں کی بوسہ گاہ بنانا تھا۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جب حضرت ابراہیمؑ سے امامتِ نوری انسانی کا وعدہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا "ذُرِّيَّتِي ۙ مِنْ ذُرِّيَّتِي ۙ" (۲/۱۳۳) یعنی یہ وعدہ کیا میری نسلوں میں بھی متوارث رہے گا؟ تو ارشاد ہوا کہ ہاں رہے گا لیکن لَا يَمْلِكُ عَهْدُ الظَّالِمِينَ (۲/۱۳۳) جو میرے قوانین سے سرکشی کی راہ اختیار کریں گے اُن کا میرے عہد میں کوئی حصہ نہیں۔ یہ ظالمین بنی اسرائیل کا آخری طبقہ تھا۔ جب وہ سرکشی و عدوان سے زندگی کی خوشگوار یوں کے اہل نہ رہے تو نوری انسانی کی امامت کو اس شاخ سے الگ کر کے ذریتِ ابراہیمی کی دوسری شاخ کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ سورۃ شُعْت میں ہے۔

وَبَرَكْنَا عَلَيْهِ وَ عَلَىٰ إِسْحَاقَ ۙ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ ۙ (۲۴/۱۱۳)۔ (نیز ۲۶/۵۷)۔

اور ہم نے ابراہیم اور اسحاق پر (اپنی) برکتیں نازل فرمائیں اور اُن کی اولاد میں سے دو طرح کے لوگ ہوتے۔ ایک زندگی کی متوازن راہ پر چلنے والے اور دوسرے کھلے طور پر اپنے آپ سے زیادتی کرنے والے۔

سرزمین حجاز کی خوش بختی | چنانچہ یہ تھی وہ عظیم المرتبت تدبیرِ الہی جس کے ماتحت حضرت اسمعیلؑ کو فلسطین سے بہت دور سرزمین حجاز

میں بسایا گیا تھا تاکہ جب پہلی شاخ اپنی تازگی و برومندی کھو بیٹھے تو یہ دوسری شاخ اظہر قدوسیانِ حظیرۃ اعلیٰ کا گہوارہ بن سکے۔ سورۃ ابراہیم کے چھٹے رکوع میں اس ویرانے کی آبادی کا تذکرہ ان الفاظ میں

آیا ہے۔

وَ إِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجْعَلْنِيْ
وَّ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَوْصِيَاءَ ۝ رَبَّنَا اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نَخْفٰى
وَّ مَا نَعْلَمُ ۝ وَّ مَا يَخْفٰى عَلٰى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا
فِى السَّمٰوٰتِ ۝ (۲۵ - ۲۸/۱۳)

جب ابراہیم نے کہا کہ اے نوحِ انسانی کے پرورش دینے والے تو اس بستی کو جسے میں
تیرے نظام کے لئے مرکز بنا رہا ہوں (ایسا بنا دے کہ یہ سرکش قوتوں کی چیرہ دستیوں کے ستارے
ہوئے انسانوں کے لئے امن کا مقام بن جائے اور ایسا کر دے کہ میں اور میری اولاد ہر اس بات
سے مجتنب رہیں جو ہمیں تیرے قوانین کی اطاعت سے بے گناہ بنا دے۔ اے میرے نشوونما
دینے والے! ان غیر خدائی قوتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر رکھا ہے۔ میں اس کا اعلان
کرتا ہوں کہ میرا یگانہ وہ ہوگا جو اس مسلک کا اتباع کرے گا جس کی اتباع میں کر رہا ہوں
اور جو اس سے سرکشی برتے گا تو اس کی حفاظت اور پرورش کا انتظام تیرے قانون (طبعی)
کے مطابق ہوگا۔

اے میرے پرورش دینے والے! میں نے (اس عظیم مقصد کے لئے) اپنی کچھ اولاد کو تیرے
واجب الاحترام گھر کے پاس لاکر بسا دیا ہے۔ یہ مقام ایسی جگہ واقع ہے جہاں کھیتی کا نام و
نشان تک نہیں۔ یہ سب اس لئے کیا ہے کہ وہ نظام صلوة کو قائم کریں۔ پس تو ایسا کر دے
کہ (ان تمام نامساعدت حالات کے باوجود) لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں۔ نیز
تو ان کے لئے زمین کی پیداوار سے رزق کا سامان بہم پہنچا دے (تاکہ یہ معاش کی طرف سے
بے فکر ہو کر اس طرح کام کریں) کہ ان کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل بن جائیں۔ اے ہمارے
پروردگار! جو کچھ ہمارے دلوں کے اندر ہے اور جو کچھ اظہار میں آجاتا ہے تجھ پر سب روشن ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اس میں سے کچھ بھی تجھ سے
پوشیدہ نہیں۔

یہ تھا وہ عظیم مقصد جس کے لئے حضرت ابراہیم نے حضرت اسمعیل کو وطن سے دور ایک صحرائیں آباد کیا۔
(فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

(نوع انسانی کے مرکز محسوس کے لئے اس خطّہ ارض کا انتخاب کن مصالح کی بنا پر عمل میں لایا گیا، اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ تورات میں بھی یہ واقعہ (آف اسمیل کی تبدیلی کے ساتھ) مذکور ہے لیکن حضرت اسمعیلؑ کی علیحدگی کا جو سبب بیان کیا گیا ہے وہ خدا کے ایک برگزیدہ رسول کے کبھی شایان شان نہیں ہو سکتا۔) اس قسم کے امور اس حقیقت کی داخلی شہادت ہیں کہ یہ کتابیں انسانی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکیں۔ چنانچہ کتاب پیدائش سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ہاجرہ کا ہار آور ہونا حضرت سارہ کے لئے خوش آئند نہ تھا۔ اس لئے وہ حضرت ہاجرہ کو تنگ کرتی رہتی تھیں، چنانچہ حضرت ہاجرہ ایک مرتبہ اسی وجہ سے گھر چھوڑ کر چلی گئیں۔

اور خداوند کے فرشتے نے اسے ایک میدان میں پانی کے چشمے کے پاس پایا۔ یعنی اس چشمے کے پاس جو مشور کی راہ پر ہے ۵ اور اس نے کہا اے ساری کی لونڈی ہاجرہ تو کہاں سے آئی اور کدھر جاتی ہے؟ وہ بولی کہ میں اسحاقؑ کی بی بی ساری کے سامنے سے بھاگی ہوں ۵ اور خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ تو اپنی بی بی کے پاس پھر جا اور اس کے تابع رہ ۵ پھر خداوند کے فرشتے نے اُسے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے ۵ اور خداوند کے فرشتے نے اُسے کہا کہ تو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی اس کا نام اسمعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا دکھ سُن لیا۔ (پیدائش ۷۔ ۱۱/۱۶)

آگے چل کر کہا گیا ہے کہ حضرت اسمعیلؑ کی پیدائش کے بعد یہ حسد اور کجی تیز ہو گیا اور جب حضرت سارہ کے ہاں حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے تو یہ حسد رقابت کی آگ تک بڑھ گیا۔ اس لئے کہ اس زمانے کی رسم کے مطابق پہلونا چچہ باپ کی سرداری کا وارث اور مقدس خیال کیا جاتا تھا اور حضرت سارہ نہیں چاہتی تھیں کہ (جنابہ) ہاجرہ کا بیٹا اُن کے اپنے بیٹے سے ممتاز رہے۔

لے وادی غیر ذریعہ (بے برگ و گیاہ) تھی لیکن جس مقام پر حضرت اسمعیلؑ کو آباد کیا تھا وہ (بَلَدُنْ) شہر تھا اس سے ظاہر ہے کہ آپ حضرت اسمعیلؑ اور ان کی والدہ کو کسی ویرانے میں نہیں چھوڑ آئے تھے بلکہ انہیں سز زمین حجاز کی مرکزی بستی (مکہ) میں آباد کیا تھا۔ مکہ اس زمانہ میں اس شہرت و جاذبیت کا مالک نہ ہو جو بعد میں اس کے حصّہ میں آئی لیکن بہر نوع وہ بَلَدُنْ (شہر) اُس زمانہ میں بھی تھا۔

اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو وہ ابرہام سے جنمی تھی، ٹھٹھے مارتا ہے ۵ تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی اور اس کے بیٹے کو نکال دے کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اسحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا ۵ اپنے بیٹے کی خاطر یہ بات ابرہام کی نظر میں نہایت بُری معلوم ہوئی۔ خدا نے ابرہام سے کہا کہ وہ بات اس لڑکے اور تیری لونڈی کی بابت تیری نظر میں بُری نہ معلوم ہو۔ ہر ایک بات کے حق میں جو سارہ نے تجھے کہی اس کی آواز پر کان رکھ کیونکہ تیری نسل اسحاق سے کہلائے گی ۵ اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی ایک قوم پیدا کرونگا اس لئے کہ وہ بھی تیری نسل ہے۔

(پیدائش ۹ — ۱۳/۲۱)

چنانچہ اس پڑتورات کے بیان کے مطابق، حضرت ابراہیمؑ نے اپنے حرم محترم حضرت ہاجرہ اور اپنے خلیفہ حضرت اسمعیلؑ کو (جنہیں خدا کے حضور سے دعائیں مانگ کر لیا تھا) ایک لقمہ ووق صحرائیں "دیس نکالا" دے دیا۔

تب ابراہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ کو اس کے کاغذے پر دھر کر دی اور اس لڑکے کو بھی اس کے حوالے کر کے رخصت کیا اور وہ روانہ ہوئی اور بیر سبع کے میدان میں بھٹکتی پھرتی تھی ۵

(پیدائش ۱۳/۲۱)

اس کے بعد کتاب پیدائش میں ایک نہایت درد انگیز افسانے کی صورت میں بیان کیا گیا ہے کہ اس بیابانِ فاران میں حضرت ہاجرہ کے پاس کسی طرح پانی ختم ہو گیا اور اس معصوم بچہ پر اس سے کیا گزری؟ اور جب مشک پانی چک گیا تب اُس نے اس لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا ۵ اور آپ اس کے سامنے ایک تیر کے پتے پر دوڑ جائی مٹھی۔ کیونکہ اس نے کہا کہ میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں۔ سو وہ سامنے بیٹھی اور چلا چلا کے روئی ۵ تب خدا نے اس لڑکے کی آواز سُنی اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ! تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے خدا نے سُنی ۵ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اُسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہیں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا ۵ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر اس مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا ۵ اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیرا انداز ہو گیا۔

(پیدائش ۱۵ — ۲۰/۲۱)

حالانکہ اسی باب کے شروع میں مذکور ہے کہ یہ واقعہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کے بعد کا ہے اور حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کے وقت (تورات کے بیان کے بموجب) حضرت اسمعیلؑ چودہ سال کے تھے۔ بہر حال تورات کے بیان کے مطابق یہ ہے وہ علت جس کی رُو سے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمعیلؑ کو گھر سے نکالا اور صحرا میں چھوڑ دیا۔ واقعہ ایک ہی ہے، لیکن قرآن کریم کی بیان کردہ علت اور تورات

لے قرآن کریم سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت اسمعیلؑ کے وادی غیر ذی ذرع (بلے برگ و گیاہ وادی) میں سکونت پذیر ہونے کا واقعہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کے بعد کا ہے۔ چنانچہ سورہ ابراہیم کے چھٹے رکوع میں جہاں اس واقعہ کا ذکر ہے اس کے بعد کی آیت میں مذکور ہے:-

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي ذَهَبَ بِئِي عَلِيٍّ الْكَبِيرِ إِسْمَاعِيلَ وَ إِسْحَاقَ ۗ إِنَّ
رَبِّيَ لَكَسِيمٌ الدُّعَاءِ ۝ (۱۳۹/۱۴)

اور ابراہیمؑ نے کہا، "ساری ستائش اللہ کے لئے ہے جس نے باوجود بڑھاپے کے مجھے اسمعیل اور اسحاق (دو فرزند) عطا فرمائے۔ بلاشبہ میرا پروردگار (اپنے بندوں کی) دعا میں سناتا اور قبول کرتا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت حضرت اسحاقؑ پیدا ہو چکے تھے۔ تورات کے بیان کے مطابق حضرت اسمعیلؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس کی تھی۔ (پیدائش ۱۴/۱۶)

اور جب ابراہیمؑ کے لئے ہاجرہ سے اسمعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیا سی برس کا تھا۔ (پیدائش ۱۶/۱۶) اور حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر سو برس کی تھی۔

اور جب اس کا بیٹا اسحاقؑ اس سے پیدا ہوا تو ابرام سو برس کا تھا۔ (پیدائش ۲۱/۵)

لہذا حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کے وقت حضرت اسمعیلؑ کی عمر قریب چودہ سال کی تھی۔

یہ عیسائی مستشرقین، حضرت ہاجرہ کے استخفاف میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے محض اس لئے کہ ان کے بیٹے (حضرت اسمعیلؑ) کے سلسلہ زریں سے جناب خاتم الانبیاءؑ کا ظہور ہوا۔ لیکن بعض اوقات، حقیقت اپنا اعتراف اس طرح کرا لیتی ہے کہ معترف خود موجود حیرت رہ جاتا ہے۔ یہودی خاص طور پر اس مذہب کی حرکت میں پیش قدمی رہتے ہیں۔ لیکن جوٹس انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے، "جو شخص اسمعیلؑ کو خواب میں دیکھ لیا۔ (بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کی رُو سے جذبہ محرکہ پر غور کیجئے۔ خدا کے کلام اور انسانوں کی تحریف کا نمایاں فرق سامنے آجائے گا۔

حضرت اسمعیلؑ کے بیابانِ فاران میں اقامت پذیر ہو جانے کے بعد تعمیرِ کعبہ کا عظیم المرتبت واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن اس سے پیشتر اسوۂ ابراہیمی میں ایک درخشندہ کڑی اور بھی ہے جس کے صلہ میں آپ کو بارگاہِ خداوندی سے ”مسلم“ کا رفیع الشان لقب عطا ہوا ہے۔ ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو منصبِ امامت عنایت فرمانے کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا تھا:-

وَ إِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۗ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ
لِلنَّاسِ إِمَامًا ۗ (۲/۱۲۴)

جب اللہ نے ابراہیم کے لئے اس کی مضمحلہ صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع ہم پہنچائے تو معلوم ہوا کہ اس کی صلاحیتیں تکمیل پا چکی ہیں۔ اس پر کہا گیا کہ جس کی صلاحیتیں اس حد تک تکمیل پا چکی ہوں اسے حق ہے کہ وہ دوسروں کی صلاحیتوں کے پرکھنے کا معیار بن سکے۔

مختلف منازل | حضرت ابراہیمؑ کا اسوۂ مقتدہ اس اجمال کی نورانی تفصیل ہے۔ ان مواقع کی نوعیت پر غور کیجئے۔ سب سے پہلے باپ سے اعلانِ بغاوت اور اس کے جواب میں باپ کی دھمکی کہ اگر ان حرکتوں سے باز نہ آیا تو سنگسار کرادوں گا۔ اگر یہ دھمکی نہ بھی دی جاتی تو بھی اپنے والد کے مسلک کی مخالفت میں جو مشکلات سفرِ زندگی میں منتظر تھیں، وہ نظروں کے سامنے تھیں۔ ایک صاحبِ قوت و سطوت قوم کے ایک بڑے بچاری کا بیٹا، باپ کی مسندِ برہمنیت کا وارث، ان تمام جاذبیتوں سے مُنہ موڑ کر دنیا بھر کی مصیبتوں کی زندگی کو مول لے لینا یہ کوئی چھوٹی بات نہ تھی!

گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ، اللہ اس کی دعا قبول کر لے گا“ (جلد ۴ صفحہ ۴۶۸) اور حضرت ہاجرہؑ کے متعلق ہے۔ ہاجرہ اس بلند درجہ کی لہجیت کی مثال ہے جو (حضرت) ابراہیمؑ کے زمانہ میں راسخ تھی۔ کیونکہ ہاجرہ خدا کے فرشتے سے گھبرائی نہیں۔ اس کی وفا شعاری قابلِ تحسین ہے۔ کیونکہ جب (حضرت) ابراہیمؑ نے اسے دور بھیج دیا اس پر بھی اس نے اپنے عہد، نکاح کو قائم رکھا..... خدا نے اسے حُسنِ عمل کے زیور سے آراستہ کیا تھا..... (حضرت) سارہ کی وفات کے بعد خود (حضرت) اسحاق (حضرت) ہاجرہ کو اپنے والد کے گھرانے کے لئے لے گئے۔ (ص ۱۳۸)۔

اس کے بعد اس جابر و سرکش قوم کی مخالفت اور مخالفت بھی اس انداز کی جو ان کے جذبات کو آگ کی طرح بھڑکا دے اور فقط قوم ہی نہیں بلکہ ایک مطلق العنان ظالم اور مستبد بادشاہ کا مقابلہ! کہہ لینے کو آسان ہے، کرنے کے لئے کسی خلیل اللہ ہی کا جگر چاہیے۔

اس کے بعد وطن سے ہجرت، دنیاوی دل بستگی کے ہر سامان سے قطع علائق، دنیا داری کے معیار کے مطابق بے کسی اور در ماندگی، غربت و افلاس کی زندگی۔

پھر "اللہ کے گھر" کی پاسبانی کے لئے حضرت اسمعیلؑ جیسے بیٹے کو ایک بے آب و گیاہ ویرانے میں آباد کر دینا اسی کے لئے ممکن ہے جس کا دل خود اللہ کا گھر بن چکا ہو۔

لیکن یہ سلسلہ ہنوز تشنہ تکمیل تھا۔ کتابِ مجتہد میں ابھی ایک اہم باب کی کمی تھی۔ یہ نظمِ مرتضیٰ، مقطع کے بند کی محتاج تھی مسلم کا خطاب عطا ہونے کے لئے تسلیم و رضا کی ایک سنگلاخ وادی ہنوز باقی تھی۔

اب وقت آ گیا تھا کہ یہ منزل بھی طے ہو جائے اور عشقِ اپنی تکمیل کو پہنچ کر سراپا حُسن بن جائے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، حضرت ابراہیمؑ کی عمر زیادہ ہو چکی تھی اور اولاد کوئی نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت عطا کیا اور ایک فرزندِ سجد و حلیم کی بشارت دی۔

فَبَشِّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ۝ (۳۷/۱۰۱)

پھر ہم نے اسے ایک بڑبڑا لڑکے (کی پیدائش) کی خوشخبری

دے دی۔

ان منتوں اور دعاؤں، ایسی آرزوؤں اور تمناؤں کا بچہ اور وہ بھی بڑھاپے کی عمر کا، جس قدر بھی پیارا ہو کم ہے۔ بچہ بڑھا، پھولا، پھلا۔ کام کاج میں باپ کا ہاتھ بٹالنے کے قابل ہو گیا۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ (۳۷/۱۰۳)

پھر جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے (اور چلنے پھرنے کی قابلیت)

کو پہنچ گیا (یعنی جوان ہو گیا)۔

تو آپ خواب کے ایک اشارے سے سمجھے کہ حکم ملا ہے کہ بیٹے کو اللہ کی بیٹے کی قربانی راہ میں قربان کر دیا جائے۔ ہر چند یہ حکم نہیں تھا، محض خواب میں ایسا

دیکھا تھا۔ لیکن انہوں نے اسے کچھ ”اُدھر کا اشارہ“ سمجھ لیا اور ایسی تھیرا نیکڑ اور ہوش رُبا قربانی کے لئے تیار ہو گئے۔ اشارہ سمجھا اور بتیک اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ!! کہتے ہوئے سر جھکا دیا۔ بیٹے سے پوچھا۔

يٰۤاِبْنِيَّ اِنِّيْٓ اَرَىٰ فِى الْمَنَامِ اٰتِيًّاۙ اَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرٰى ﴿۱۰۳﴾ (۳۷/۱۰۳)

اے فرزند! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ کہو! تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں، کہو! تمہارا کیا خیال ہے؟ ”سوال آپ نے سن لیا! اب بیٹے کا جواب بھی سن لیجئے۔ عرض کیا۔

يٰۤاَبَتِ اَفْعَلُ مَا كُوْنُ مَرْنًاۙ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰدِقِيْنَۙ

(۳۷/۱۰۴)

اباجان! جس بات کا اشارہ آپ کو ملا ہے اسے بلا تامل کر گزر رہے۔ ارشاد اللہ آپ! مجھے ثابت قدم پائیں گے۔

سبحان اللہ! باپ تو ان ارادوں کا باپ اور بیٹا تو اس حوصلہ کا بیٹا۔ باپ نے اپنی محبت کے تمام جذبات اور بیٹے نے جان اور جوانی کو محبوب حقیقی کے ایک اشارہ پر قربان گاہ عشق میں بلا تکلف نذرانے کے لئے حاضر کر دیا۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمعیل کو ادبِ فرزندى؟

مقامِ مسلم | باپ نے بیٹے کو زمین پر لٹا دیا۔ چھری ہاتھ میں لی۔ یہ تسیم و رضا کی آخری منزل تھی۔
اَقْلَمْتُ اَسْلَمًا وَّ تَلَّهٗۙ رَلْبَجِيْمِيْنَ ۙ ﴿۱۰۳﴾ (۳۷/۱۰۳) ”جب وہ دونوں جھک گئے (اَسْلَمًا) اور باپ نے بیٹے کو کپٹی کے بل لٹا دیا۔“ یہ وہ مقام تھا جہاں پہنچ کر انسان مسلم کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔

یہ شہادت کہہ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

چھری چلنے کو تھی کہ آواز آئی۔

قَدْ صَدَقْتَ الرَّغْبِيَاۙ اِنَّا كَذَلِكْ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۙ اِنَّ هٰذَا

لَهُوَ الْبَلْوَا الْمُبِينُ ۝ (۱۵۱-۱۵۲/۱۰۶)

اسے ابراہیم! نو نے خواب (کے اشارے کو حقیقت پر مہول کر کے اسے) سچ مچ پورا کر کے دکھادیا ہم اپنے مخلص بندوں کو اسی طرح اپنی رحمت سے نوازا کرتے ہیں یقیناً یہ اظہار حقیقت کا ایک نمایاں موقع تھا۔

یعنی جو لوگ حسن کارنامہ انداز سے متوازن زندگی بسر کرتے ہیں، ان سے اگر کبھی دفور جذبات میں اس قسم کے اقدامات ہو جائیں تو وحی کی روشنی سامنے آجانے سے وہ ان کے عواقب سے فوراً بچ جاتے ہیں۔ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ کا ہاتھ روک لینا، بہت بڑی تبدیلی احوال تھی۔ اَلْبَلْوَا الْمُبِينُ کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم میں اس واقعہ عظیمہ کا ذکر صرف اسی ایک مقام پر ہے۔ آیات مصرعہ صدر میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس قربانی کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اپنی محنت اور شہیدگی کے جوش میں خواب کو حقیقت سمجھ کر بیٹے کی جسمانی قربانی کے لئے آمادہ ہو گئے۔ مشیت ایزدی نے بھی آخری منزل تک انہیں اسی دھن میں پھلنے دیا کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ جسے نوع انسانی کی امامت کے لئے منتخب کیا جا رہا تھا وہ کن خصوصیات کا پیکر تھا اور اطاعت خداوندی میں کس حد تک جانے کے لئے تیار تھا۔ بقول علامہ اقبالؒ

برکہ در اقلیم تلا آباد شد فارغ از بند زن و اولاد شد

می کند از ما سوا قطع نظر می بند سا طور بر خلق پسر

لیکن جس وقت اس منزل کا آخری مرحلہ آپہنچا اور انہوں نے چھری ہاتھ میں لے لی تو اس وقت آپ کو بتایا **ذبح عظیم سے مقصد** اسٹیمیل پہلوٹا بیٹا ہونے کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ کی سرکاری اور حکومت کے وارث تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے بڑے مقصد کے لئے "اپنا لیا تھا" اور وہ مقصد عظیم تھا بیت اللہ کی تولیت، خانہ خدا کی پاسبانی، جس کے لئے دنیا کی ہر آسائش کو قربان کر دینا تھا۔ یہ تھی وہ "عظیم ارشاد" قربانی" جس کے لئے حضرت اسمعیلؑ کو چالیا گیا تھا۔

وَقَدْ يَنْدُبُنِي بِذِي عَظِيمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ۝ سَلَامٌ عَلَىٰ

إِبْرَاهِيمَ ۝ كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝

(۱۰۷-۱۱۱/۳۷)

ہم نے ایک بہت بڑی قربانی کے لئے اسمعیل کو ذبح ہونے سے بچالیا اور ہم نے آنے والی آئینہ نسلوں کے لئے اس واقعہ کی یاد کو باقی رکھا۔ ابراہیم پر (اُس خدا کی طرف سے ہمیشہ) سلامتی ہو۔ ہم نیکو کار لوگوں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں کہ ان کا نام اور ذکر خیر ہمیشہ کے لئے دنیا کی پیشانی پر چمکتا رہتا ہے۔ بلاشبہ وہ ہمارے (بااخلاص) مومن بندوں میں سے تھا!

یہ تھی وہ خدمت و پاسبانی جو اُس وقت سے لے کر آخری زمانے تک حضرت اسمعیلؑ کی اولاد میں متواتر چلی آئی تا آنکہ خدا کے گھر کی کھیاں خدا کے اُس بندے (عبدہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقدس ہاتھوں تک پہنچ گئیں جس نے اس گھر کو شرفِ انسانیت کے قیام و بقا کا حقیقی ذریعہ بنا لیا تھا۔ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهٖ رِیۡنَ الْاٰلِیۡنِیۡنَ ۝ سَلَّمَ عَلٰی اِبْرٰهٰیْمَ ۔

- تسلیم و رضا کی ان دشوار گزار منازل کو طے کر لینے کے بعد صداقت اور فداکاری کے ان پیمانوں کے سپرد وہ خدمتِ جلیلہ کی گئی جو اسلام کی عالمگیریت کے لئے مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ:
- (۱) اسلام، مذہب نہیں، دین ہے یعنی نظامِ زندگی۔
 - (۲) ہر نظام اپنے لئے ایک مرکز محسوس چاہتا ہے۔
 - (۳) اسلام، تمام نوعِ انسان کے لئے عالمگیر نظام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لئے اس نظام کے مرکز کو بھی تمام نوعِ انسانی کا مرکز ہونا چاہیئے۔
 - (۴) اُس وقت دنیا میں کوئی مرکز ایسا نہیں تھا جسے عالمگیر انسانیت کے نظام کے مرکز کی حیثیت حاصل ہو۔

(۵) کعبہ اس نظام کا مرکز تھا جو تمام نوعِ انسانی کے لئے عالمگیر حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں کعبہ یا حج کا ذکر آیا ہے، انہیں لِلنَّاسِ کہہ کر پکارا گیا ہے، یعنی کسی خاص قبیلہ، قوم، وطن، حکومت یا مذہب کا مرکز نہیں، بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے وجہِ جامعیت کے نظام کا مرکز، تمام انسانوں کے اُمتِ واحدہ بننے کے لئے مرکزِ ثقل۔ یہ حیثیت تھی اس گھر کی جس کی تعمیر کے لئے

حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا گیا اور جس کی پاسبانی کا فریضہ حضرت اسمعیلؑ اور آپ کی نسل کے سپرد کیا گیا۔ دنیا کے مختلف گوشوں میں بڑے بڑے بڑے بڑے دیوبی دیوتاؤں کی پوجا کے لئے عظیم الشان منار، اجرام سماویہ کی پرستش کے لئے وسیع و عریض ہیکل موجود تھے۔ لیکن تمام صفحہ ارض پر خدائے واحد و قہار کی عبودیت کے اظہار کے لئے کوئی مقام نہ لٹھا۔ یہ منصب جلیلہ حضرت ابراہیمؑ کی سعادت کے لئے مقدر تھا۔ سورۃ آل عمران میں ہے:-

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى
لِّلْعَالَمِينَ ۝ (۳/۹۵)

بلاشبہ دنیا میں سب سے پہلا گھر جو خالص انسانیت کی خاطر بنایا گیا وہ مکہ میں ہے، اپنے مقام پر حکم اور نوح انسانی کی نشوونما کا حامل، تمام اقوام عالم کے لئے منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے راہ نمائی کا ذریعہ۔

یہ تھی وہ عظیم النظیر خدمت جو حضرت ابراہیمؑ کو تفویض کی گئی تھی۔ یوں تو اس تمام کائنات میں کون سی چیز ہے جو اللہ کی نہیں (اللہ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ) لیکن مٹی اور پتھر کی جس سادہ سی چار دیواری کو مالک ارض و سموات نے اپنی نسبت کا شرف عطا فرمایا، وہ یہی بیت اقدس تھا جس کا سنگ بنیاد جناب خلیل اللہ جیسے توحید پرست کے مقدس ہاتھوں نے رکھا اور جس کی تعمیر کے لئے حضرت اسمعیلؑ جیسے پیکر ایثار و صداقت نے مٹی اور پتھر کو اپنے سر پر اٹھایا۔

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاٰمَنًا ۙ وَ اِتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ
اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّی ۙ وَ عٰهِدُنَا اِلٰی اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ
لِلطّٰفِلِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكْعِ السُّجُوْدِ ۝ (۲/۱۲۵)

لے مکہ قدیم الایام سے (حتیٰ کہ حضرت ابراہیمؑ سے بھی پہلے) ایک مقدس مقام تصور کیا جاتا تھا اور دور دورہ راز سے لوگ اس کی زیارت کے لئے آیا کرتے تھے۔ اس اعتبار سے یہ مقام عظمت ضرور تھا، لیکن خالصتاً خدائے واحد کی عبادت کے لئے تعمیر کعبہ حضرت خلیل اللہ کے مقدس ہاتھوں انجام پائی۔ اگرچہ یہ مترشح ہوتا ہے کہ آپ نے اس مقام کی تعمیر کسی سابقہ بنیادوں پر ہی رکھی تھی۔

اس گھر کو ہم نے نوع انسانی کے لئے مرکز کی حیثیت دیدی تاکہ وہ (نوع انسانی) اس سے متمسک ہو کر تمام خطروں سے محفوظ ہو جائے۔

سوائے جماعتِ مؤمنین! تمہیں بھی چاہیئے کہ تم بھی ابراہیمؑ کے اس منصب و مقام کے حصول کی کوشش کرو اور اس کے لئے اس کے پیچھے پیچھے چلو۔ ہم نے ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ کو تاکید کی تھی کہ وہ اس مقام کو انسانوں کے خود ساختہ نظریات و تصورات سے دُور رکھ کر اس جماعت کی تربیت گاہ بنا دیں جو تمام نوع انسانی کی حفاظت کی ذمہ دار اور ان کے معاملات کو سنوارنے کی ضامن ہے اور اس فریضہ کو قوانینِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت سے سرانجام دیتی ہے۔

حسین دعائیں | یہ مقام جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اس بے آب و گیاہ وادی میں تھا جہاں انسانی سکونت و اقامت کے لئے کوئی جاذبیت نہ تھی۔ اسی لئے اس کے انتخاب کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی زبان پر قدرتی طور پر یہ دُعا آگئی کہ

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَاُذِقْ اَهْلَهُ
مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللهِ وَاَلْبِغِمْ اَلْاٰخِرَةَ (۲/۱۲۶)

اے وہ جو تمام کائنات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانے والا ہے! تو ایسا کر دے کہ یہ مقام ساری دنیا کے ستائے ہوئے انسانوں کے لئے امن اور پناہ کی جگہ بن جائے اور جو لوگ تیرے قوانین کی صداقت اور مستقبل کی زندگی پر یقین رکھتے ہوں! انہیں زندگی کی آسائشیں اور معاشی سہولتیں عطا فرمادے۔

اس پیکرِ اخلاص کی دُعا کو ایسا شرف قبولیت عطا ہوا کہ ریگستان کا وہی خشک ٹکڑا آج تک دنیا بھر کی شادا بیوں کا مرکزی مقام ہے اور جب تک صفحہ ارض پر سرسبزی و شگفتگی کا آخری نشان باقی ہے وہ مقام ایسا ہی رہے گا کہ اس کی فضا میں جناب خلیل اللہ کی دعائیں گونج رہی ہیں اور اس کی خاک کے ذرات میں حضور نبی اکرمؐ کی پابوسی کی سعادتیں جھلک رہی ہیں۔ اگر یہ مقام دنیا بھر کی نرہتوں اور لطفوں کی جلوہ گاہ نہیں ہو سکتا تو پھر اور کون سے مقام کے مقدر میں یہ شرف لکھا جا سکتا ہے!

ذرا تصور میں لائیے اس سہانے سہمے کو کہ صبح کی نورانی گھڑی، تاروں کی چھاؤں میں بادۂ توحید سے سرمست، جوشِ فدویت میں جھومتے ہوئے باپ اور بیٹا (علیہما السلام) اس مقدس فریضہ کی سرانجام دہی

میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز، انتہائی جذب و انہماک سے مصروف کار ہیں۔ بیٹا، مٹی اور پتھر لار رہا ہے اور معماریِ سرم دیوارِ حُجُن رہا ہے۔

وَ إِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ ۗ (۲/۱۲۷)

اور (پتھر دیکھو) وہ کیسا عظیم الشان اور انقلاب انگیز وقت تھا (جب ابراہیم خانہ کعبہ کی بنیاد چن رہا تھا اور اسماعیل بھی اس کے ساتھ شریک تھا۔

ہاتھ کام میں مصروف ہیں اور لب، پر یہ حسین دعائیں چل رہی ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۲/۱۲۸)

اے اللہ العالمین! تیرے یہ ناچیز بندے تیرے مقدس نام پر اس کی چار دیواری کھڑی کر رہے ہیں ان کی اس حقیر محنت کو شریف قبولیت عطا فرما۔ بلاشبہ تو دعاؤں کا سننے والا اور نیتوں کا جاننے والا ہے۔

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ ۗ (۲/۱۲۸)

اے پروردگارا ہمیں ایسی توفیق عطا فرما کہ ہم تیرے سچے مسلم (تیرے قوانین کے پابند و تیرے احکام کے سامنے جھک جانے والے) بن جائیں اور ہماری نسل میں سے کبھی وہ لوگ پیدا ہوں جو سچے معنوں میں مسلم ہوں، تو ہمیں وہ طور طریق سکھا دے جن سے ہم اس مقصدِ عظیم کے حصول میں کامیاب ہو جائیں اور تیری عنایات کا رُخ ہماری طرف رہے۔ اس لئے کہ تیرا ہی قانون وہ قانون ہے کہ جہاں کسی نے اس کی طرف رُخ کیا وہ تمام سامانِ رحمت کو اپنے ساتھ لئے خود اس کی طرف بڑھ کر آ گیا۔

رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيهِمْ ۗ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۙ (۲/۱۲۹)

یہ سلسلہ اسی طرح سے قائم رہے تا آنکہ ان میں انہی سے اس دعوتِ انقلاب کو لے کر وہ رسول اُٹھ کھڑا ہو جو تیرے ضابطہ قوانین کو لوگوں کے سامنے پیش کر دے۔ انہیں اس کی تعلیم بھی دے اور

یہ بھی بتا دے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا اور وہ نظام متشکل کر دے جس سے ان کی صلاحیتوں کی برومندی ہوتی رہے، تیرے اس قانون کے ذریعے جو قوت اور حکمت دونوں کا مجموعہ ہے۔

ملتِ حنیفہ کا مرکز محسوس | یہ وہ حسین و مقدس دعائیں تھیں کہ ادھر زبان سے نکلیں اور ادھر شرف قبولیت سے ہم آغوش ہو گئیں۔ ان آرزوؤں اور تمناؤں میں اللہ کے اس مقدس گھر کی تعمیر عمل میں آئی۔ جب وہ مکمل ہو گیا تو ارشاد ہوا کہ اب لوگوں کو دعوت دو کہ وہ قانونِ خداوندی کے مطابق اپنی انفرادی زندگی کو ایک اجتماعی قالب میں ڈھالنے کی غرض سے اس مرکز توحید کی طرف رواں دواں چلے آئیں (۲۲/۲۷۱)۔

تفصیل ان اجمالات کی اپنے اپنے مقام پر ملے گی۔

یہ ہیں ملتِ حنیفہ کے مؤسس اولیٰ حضرت خلیل اکبر (علیہ السلام) جن کی خصوصیات کبریٰ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے مختلف اوراق میں دہرایا ہے تاکہ آپ کا اسوۂ حسنہ توحید پرستوں کے قلب و نگاہ میں اچھی طرح نقش ہو جائے۔ کہیں ان خصوصیات حسنہ کی گلا کاریوں کو پھیلا کر بیان کیا گیا ہے، کہیں اس کی پوشیدہ نکتوں کو یوں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے جیسے چندن کے ہر ریزہ میں پورا گل کہہ سمودیا جائے۔ یا ہیرے کے نیگنے میں آفتاب کی پوری دنیا نے نور جھل جھل کر رہی ہو۔ آپ کے جوہر تسلیم و رضا کے تفصیلی واقعات اوپر گزر چکے ہیں ان تمام تفصیلات کو سمٹا کر ایک لفظ میں یوں دا

مُسْلِمًا کیا گیا ہے کہ

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمُ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّي
الْعَلَمِينَ ۝ (۲/۱۳۱)

جب ابراہیم کے پروردگار نے اسے حکم دیا تھا کہ جھک جاؤ، تو وہ پکار اٹھا تھا کہ میں اس خدا کے قوانین کے سامنے تسلیم خم کرتا ہوں جو تمام نوع انسانی کی نشوونما کا کفیل ہے۔

اس آسلمت کے اندر فرماں پذیری اور فداکاری، اتباع و اطاعت، سرفروشی و جاں سپاری، خود فراموشی اور خداستی کے جذب و کیفیت کی ایک دنیا جنباں و رقصاں نظر آرہی ہے۔ اُس آقائے حقیقی نے کہا کہ

جھک جا اور وہ جھک گئے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس خصوصیت کے متعلق دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اللہ کے حضور قلب سلیم لے کر آئے۔

إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ۝ (۲۴/۸۹ نیز ۲۴/۸۴)
(یاد کرو) جب ابراہیم اپنے پروردگار کی طرف جھکنے والے قلب سے متوجہ ہوا۔

قلب سلیم اور طبع حلیم | اللہ کے سامنے قلب سلیم اور نوح انسانی کی مصیبتوں پر خون ہونے پر جلنے والادل۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَلِيمٌ ۝ (۱۱/۴۳)

صاحب بصیرت و قوت | رقیق القلب اور سلیم الطبع ہونے کے ساتھ ہی علم و بصیرت کی بھی ان بلندیوں پر جو امامت نوح انسانی کے مشایخ شان تھیں۔

وَلَقَدْ اتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُسُودًا ۖ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا
بِهِ عَلِيمِينَ ۝ (۲۱/۵۱)

اور اس سے پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کے درجے کے مطابق کچھ بوجھ عطا فرمائی تھی اور ہم اس کی حالت سے بے خبر نہ تھے۔

پھر اس عقل و فراست کے ساتھ ساتھ قوتِ بازو بھی ایسی عطا ہوئی تھی جو حکومتِ البیتہ کے قیام کے لئے از بس ضروری ہے۔

وَ اذْكُرْ عَبْدًا نَا إِبْرَاهِيمَ ۖ وَ اِسْحٰقَ ۚ وَ يَعْقُوبَ ۚ اُولٰٓئِ
الَّذِيْنَ ۚ وَ الْاَبْصَارِ ۝ (۳۸/۴۵)

اور (اے پیغمبر!) ہمارے بندوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کو یاد کرو جو باحقوں اور آنکھوں والے تھے (یعنی جسمانی طاقت کے مالک اور حقائق پر نظر رکھنے والے تھے)۔

ان خصوصیات پر نگاہ ڈالنے اور پھر حضرت ابراہیم کی رفعتِ شان اور بلند سی مرتبت کا تصور کیجئے۔ شرفِ نسائیت کا کون سا گوشہ ہے جو اس پیکرِ خلقت و صداقت اور مظہرِ رشد و سعادت کے حریم

ایک ذات میں پوری ملت | قلب میں جلوہ ریز نہ تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ منصبِ قیادت و امامت کے لئے سزاوار بھی وہی ہوتا ہے جس کی ذات

میں اُمت کے تمام صالحہ افراد کے جوہر ایک جامر کوز ہوں۔ اس حقیقت بالغہ کو پیش نظر رکھتے اور پھر سورہ نحل کی اس آیت جلیلہ پر نگاہ ڈالتے اور دیکھتے کہ رُوح بصیرت کس طرح وجد میں آتی ہے۔ فرمایا۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا ۖ وَ لَمْ يَكُ
مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۗ (۱۴/۱۲۰)

بلاشبہ ابراہیمؑ (اپنی شخصیت میں) ایک پوری اُمت تھا، اللہ کے آگے جھکا ہوا اور ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔

ایسی جامع شخصیت کہ اس کے اندر پوری کی پوری اُمت سمور ہی تھی اور اُمت بھی قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا ۖ وَ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۗ تو انہیں خداوندی کے سامنے سجدہ ریز، ہر طرف سے مُنہ موڑ کر صرف ایک آقا کی غلام، اس کی حکومت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرانے والی، ایسی اُمتِ مسلمہ ایک ذات کے اندر چھپی بیٹھی تھی جیسے ایک عظیم الشان خیلِ بلند ایک ننھے سے بیج کے اندر موجود ہو۔ امام درحقیقت پوری کی پوری اُمت اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ ان کی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا مظہر، ان کی دعاؤں اور التجاؤں کا ترجمان اور ان کی جملہ خصوصیاتِ حسنہ کا حامل ہوتا ہے۔ امام تنہا نہیں ہوتا۔ اس کے غبارِ ناقہ میں پورا کارواں چھپا ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ے

پچشمِ کم میں تنہا تم را
کہ من صد کارواں گل در کنارم

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا ۖ وَ لَمْ يَكُ
مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۗ (۱۴/۱۲۰)

اسلامی اصولِ معاشرہ کی رُوسے، فرد کی تکمیل ذات کے لئے جماعت کا وجود لاینفک ہے لیکن جماعت بھی تو افراد ہی کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس لئے جہاں جماعت، افراد کے تابندہ جوہروں کا مجموعی پیکر ہوتی ہے وہاں ایک فرد، جماعت کی خصوصیاتِ کبریٰ کا نمائندہ ہوتا ہے۔ فرد اور جماعت کا یہ تعلق ایسا لاینفک اور گہرا ہے جس میں آپ ایک کو دوسرے سے کبھی الگ نہیں کر سکتے۔ لہذا جس شخص کو جماعت کی امامت و نیابت کے لئے منتخب کیا جائے اس میں تو جماعت کے تمام جوہر بدرجہ اتم منعکس ہوں گے۔

جناب خلیل اللہ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف گوشوں پر گہری نگاہ ڈالتے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کی ساری زندگی شرک کے خلاف ایک مستقل جہاد تھی۔ شرک کے معنی ہیں، خدا کے قانون کو سنا کر کسی اور قوت کا قانون شریک کر لینا۔ اُس کی اطاعت کے ساتھ دوسری قوتوں کی بھی اطاعت کرنا۔ اُس کے احکام کے علاوہ اوروں کے فیصلوں کے سامنے جھکنا۔ حضرت ابراہیمؑ کی ساری زندگی شرک کے خلاف جدوجہد میں گزری۔ شرکِ علی کے خلاف آپ کی بغاوت و سرکشی کے واقعات سابقہ اوراق میں گزر چکے ہیں۔ ان سے بھی آگے بڑھتے اور دیکھتے کہ اس زلزلے میں جبکہ ساری دنیا عسوسات کے بُت کدوں میں گھری ہوئی تھی، اس موعدہِ اعظم نے کس قدر خالص توحید کی تعلیم دینے کے لئے توحید کا مقام بلند پیش کیا۔ فرمایا کہ ان بتوں کے مقابلہ میں جن کی تم پرستش کرتے ہو، دیکھو کہ جس خدا کے قانون کی میں اطاعت کرتا ہوں وہ کیسا ہے؟

الَّذِي خَلَقَنِي فَهُو يَهْدِينِ ۝ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ۝ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ۝ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ۝ وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ ۝ (۷۸-۸۲/۲۶)

ابراہیم نے کہا کہ میرا اللہ وہ ہے جس نے مجھے اپنے قانونِ تخلیق کی رُو سے پیدا کیا ہے اور وہی اپنے قانونِ ہدایت کے مطابق میری راہ نمائی فرماتا ہے۔ میرے جسم کی پرورش کے لئے سامانِ خورد و نوش بھی اس کے قانون کے مطابق پیدا ہوتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو شفا بھی اس کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔ موت اور حیات بھی اس کے قانون سے وابستہ ہے اور اس کے قانون سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ تارکِ اعمال کے وقت مجھے تخریبی عناصر کے اثرات سے محفوظ رکھے گا۔

غور کیجئے کہ اُس زمانے میں جبکہ انسانی ذہن زندگی کے ایک ایک شعبے کے لئے الگ الگ معبود تراشتا اور ان کے حضور سجدہ ریز ہوتا تھا۔ اس موعدہ کی نگاہ کس طرح ان تمام امور کے لئے ایک خدا کے قانون تک پہنچ رہی ہے۔ یہی توحید ہے، یعنی ساری کائنات میں ایک خدا کے قانون کا نافذ العمل ہونا۔

ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے چاند، سورج، ستاروں کے مشاہدات کے بعد علانیہ کہہ دیا کہ قَالَ لَا أُحِبُّ الْإِفْلَاقَ ۝ (۶۷/۷۸) میں کسی ایسی قوت کو اپنا اللہ ماننے کے لئے

تیار نہیں ہو تخییر پذیر ہو۔ اس اعلان پر بہ نگاہِ تعمق غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس کے اندر جس طرح آج سے چار ہزار سال پیشتر کے ”ہمدِ تاریک“ کے ایک عام انسان کے لئے توحید کا پورا انصاب موجود تھا، اسی طرح عصرِ حاضر کے بڑے سے بڑے فلاسفر کے لئے بھی اس دانش نوری **افل کا مفہوم** میں غور و تفکر کی ایک دنیا ستور ہے۔ آج یہ چیز فلسفہ کے مسلمات میں سے ہے کہ کائنات کی ہر شے تخییر پذیر ہے۔ حتیٰ کہ خود زمانہ (TIME) تسلسلِ حوادث کے سوا کچھ نہیں۔ یہ سب اافل ہیں تخییر و تبدل کے اثرات سے بلند فقط خدائے حقی و قیوم کی ایک ذات ہے جو زندہ اور قائم ہے اور اپنے قیام میں کسی خارجی قوت کی محتاج نہیں۔ ہر اافل سے منہ موڑ کر خدائے حقی و قیوم کی طرف مراجعت، یہ ہے توحیدِ خالص اور یہی ہے وہ مقام جہاں پہنچ کر ایک مردِ مؤمن دنیا بھر کی شعلہ سامانیوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ۷

علمِ کامل از سوزِ دل است معنیِ اسلام ترکِ اافل است
چو ز بندِ اافلِ ابراہیمِ رست در میانِ شعلہ ہائیکو نشست

یہی ہے وہ مسلکِ ابراہیمی جس کے اتباع کا حکم جناب **ملتِ ابراہیمی کی اتباع** نبی اکرمؐ اور حضورؑ کی وساطت سے ملتِ حنیفہ کو ملا۔ سورۃ

محل کی آیات ذیل پر غور فرمائیے۔

وَ اتَّيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۗ وَ اِنَّهُ فِي الْاٰخِرَةِ لَيَمِّنُ الصّٰلِحِيْنَ ۝

(۱۴/۱۳۳)

اور ہم نے (ابراہیم کو) دنیا میں بھی خوشگوار یاں دیں اور آخرت میں بھی۔ بلاشبہ اس کی جگہ صالح انسانوں میں ہوگی۔

اس کے بعد فرمایا۔

لَمْ نَكُنْ مِنْ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَ مَا كُنَّا

(۱۴/۱۳۳)

اور پھر (اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ (اسی) ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرو۔ ہر طرف سے کٹا ہوا (صرف دینِ حق ہی پر کار بند رہنے والا) اور جو مشرکوں میں سے نہ تھا۔

اس مسلک سے انحراف حماقت ہے (۲/۱۳۰) اور یہی وہ مسلک ہے جس کی وصیت حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد سے فرمائی تھی (۲/۱۳۲)۔ انسانی تحریفات نے حضرت ابراہیمؑ کی تعلیم میں بہت سارے تبدل کر دیا اور یوں رفتہ رفتہ توحید کی یہ شمع لوزانی، ذہن انسان کے تصورات کے رنگین فانوس میں گھر کر رہ گئی۔ یہود و نصاریٰ نے اس دین خداوندی کی عالمگیریت کو نسلوں اور فرقوں میں محدود کر کے اس بحیرہ بیکراں

تعلیم ابراہیمی قرآن کے اندر | رسول كَاثَرٌ يَلْتَأْسِكِي بُشْتًا هُوَی جَس كَلْتَا

حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے وقت دعائیں مانگی تھیں۔ وہ آنے والا آیا اور تعلیم ابراہیمی کو تمام انسانی تحریف و الحاق سے پاک اور صاف کر کے اُس کی اصلی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن کریم نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ:-

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَ اللَّهُ
دَرِي الْمُنْذِرِينَ ۝ (۳/۶۸-۶۵)

اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو کہ ان کا طریقہ ہودیت کا طریقہ تھا یا نصرانیت کا طریقہ تھا، حالانکہ تورات اور انجیل (جن کے نام پر یہ گروہ بند پاں قائم کی گئی ہیں) نازل نہیں ہوئی ہیں مگر اس کے بہت بعد (پس ظاہر ہے کہ جس گروہ بندی کا اُس وقت وجود ہی نہ تھا وہ کیونکر اس کا پیرو ہو سکتا ہے؟) کیا (اسی سی موٹی بات بھی) تم نہیں سمجھ سکتے؟ دیکھو، تم وہ لوگ ہو کہ تم نے ان باتوں میں تو نزاع کی، جن کے لئے کچھ نہ کچھ تمہارے پاس علم موجود تھا، لیکن تم اس بارے میں کیوں نزاع کرتے ہو، جس کے

لے حتیٰ کہ ابراہیمؑ کے ساتھ سب سے بڑی نسبت رکھنے کے مدعیان، یہود و نصاریٰ کے ہاں، حضرت ابراہیمؑ کی کتاب کا ذکر تک نہیں۔ ان کے صحف کا تذکرہ بھی قرآن کریم ہی میں ہے جس نے ان کتابوں کی صحیح تعلیم کو اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے۔

إِنَّ هَذَا كَفَى الصُّحُفِ الْأُولَى ۖ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَ مُوسَىٰ (۱۸۱-۱۸۶/۱۹)
(یٰزۃ ۳۴-۵۲/۳۹) یقیناً یہ پہلے صحیفوں میں (بھی) تھا، صحف ابراہیمؑ و موسیٰ میں۔

لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں؟ اور اللہ (سب کچھ) جانتا ہے مگر تم کچھ نہیں جانتے۔ (یہ سب جہل و تعصب کی باتیں ہیں) ابراہیم نے تو یہودی لکھانہ نصرانی (اور نہ کسی دوسری مذہبی جماعت بندی کا پیرو) بلکہ اپنے ہمد کی تمام گمراہیوں سے) ہٹنا ہوا خدا کا فرمان بردار بندہ اور یقیناً اس کی راہ شرک کرنے والوں کی راہ نہ تھی۔ فی الحقیقت ابراہیم کے نزدیک تو وہ تھے جو اس کے قدم بقدم چلے۔ نیز اللہ کا یہ نبی ہے اور وہ لوگ جو اس نبی پر ایمان لائے ہیں اور یاد رکھو اللہ انہی کا مددگار ہے جو (سچا) ایمان رکھنے والے ہیں۔

سورہ بقرہ میں ہے۔

وَقَالُوا كُفُّوا هُودًا اَوْ نَصَارَى تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اٰبٰٓءِہِمۡ
حٰٓئِنۡفَا..... فَسَيَكۡفِيكُمۡ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِیۡعُ الْعَلِیۡمُ ۝

(نیز ۲/۱۳۰) (۱۳۵-۲/۱۳۴)

اور (دیکھو) یہود و نصاریٰ دونوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ہدایت صرف انہی کے حصے میں آئی ہے) یہودیوں نے کہا یہودی ہو جاؤ، ہدایت پاؤ گے۔ نصاریٰ نے کہا، نصرانی ہو جاؤ، ہدایت پاؤ گے۔ لیکن تم کہو نہیں، خدا کی راہ تو وہی "حنیفی" راہ ہے جو ابراہیم کی راہ تھی اور یقیناً وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ (اے پیروانِ دعوتِ قرآنی!) تم کہو ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اس پر جو ہم پر نازل ہوا ہے، نیز ان تمام تعلیموں پر ایمان لائے ہیں جو ابراہیم کو، اسمعیل کو، اسحاق کو، یعقوب کو اور اولادِ یعقوب کو دی گئی تھیں اور (صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ) ان تمام تعلیموں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو دنیا کے دیگر تمام نبیوں کو ان کے پروردگار سے ملی تھیں۔ ہم ان میں منصبِ رسالت کے اعتبار سے کوئی تفریق نہیں کرتے۔ ہم خدا کے فرمانبردار ہیں! پھر اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو، تو اسی صورت میں یہ ہدایت یافتہ کہلا سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس سے روگردانی کریں، تو پھر سمجھ لو کہ ان کی راہ طلبِ حق کی جگہ مخالفت اور ہٹ دھرمی کی راہ ہے۔ پس (ان سے قطع نظر کر لو اور اپنے کام میں سرگرم رہو) وہ وقت دور نہیں جب اللہ کی مدد تمہیں ان مخالفتوں سے بے پروا کر دے گی۔ وہ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے!

قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اُمتِ مسلمہ کے لئے ملتِ ابراہیمی کے اتباع کی تلقین فرمائی ہے اس لئے کہ اسلام کی بنیاد توحیدِ خالص پر ہے۔

قُلْ صَدَقَ اللهُ فَتَقَاتِبُوا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيفًا ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۳/۹۵)

(اے پیغمبران لوگوں سے) کہو اللہ نے سچائی ظاہر کر دی پس (اگر تمہارے دلوں میں کچھ بھی سچائی کا پاس ہے تو چاہیے کہ) ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرو (جس کی طرف میں دعوت دے رہا

لے مغرب کے متعصب مشرقین کی ہمیشہ یہ ناکام کوشش رہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ ظاہر کیا جائے کہ نبی اکرمؐ نے (معاذ اللہ) ادھر ادھر سے خیالات کو مستعار لیا اور ان کے مجموعہ کا نام اسلام رکھ دیا۔ اس کے لئے وہ اسلام کے کسی عقیدہ کا ماخذ تورات کو قرار دیتے ہیں اور کسی کی سراخ رسانی کے لئے اس زمانے کے عربوں کے عام عقائد و خیالات کی چھان بین کرتے ہیں اور اس ”ریسرچ“ سے ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کوئی نیا دین نہیں۔ اس قسم کی ایک ناکام کوشش پادری ٹسڈل (REV. CLAIR TISDALL) کی کتاب پینا بیع الاسلام *THE SOURCES OF ISLAM* جس کا فارسی سے انگریزی میں ترجمہ سر ولیم میور نے کیا تھا اور جس کے نزدیک کتاب کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ ”تمام مشرق میں اس کی اشاعت نہایت گرم جوشی سے کی جائے“ یہ لوگ اگر بجائے اس کے کہ اسلام کے متعلق خود ہی ذہن میں ایک تصور قائم کر کے پھر اس کی تردید کے سامان فراہم کرنے کی فکر میں مارے مارے پھرتے، خود اسلام سے پوچھ لیتے کہ اس کا دعویٰ کیا ہے تو اس قدر پریشان کن زحمت سے باسانی بچ جاتے۔ اسلام تو اس کا مدعی ہی نہیں کہ وہ کوئی نیا دین ہے۔ اس کا تو دعویٰ ہی یہ ہے کہ وہ تمام صدائیں جو شروع سے حضرات انبیائے کرامؑ کی وساطت سے انسانوں تک آتی رہی ہیں اور جنہیں انسانوں نے مسخ کر دیا یہ ان کا مجموعہ ہے۔ اس تعلیم خداوندی کو ایک مرکزی حیثیت سے حضرت ابراہیمؑ نے پیش کیا۔ اس لئے قرآن کریم نے اس دین کا نام بھی ملتِ ابراہیمی رکھ دیا۔ اس کے بعد یہ بتانا کہ اسلام کی فلاں تعلیم کا سراخ فلاں فرقتے کے یہاں ملتا ہے، اسلام کے دعوے کی تائید ہے نہ کہ تردید۔ سابقہ تعلیم کے اوراق پریشاں (اپنی مسخ شدہ حالت میں) مختلف مذاہب میں ملیں گے۔ لیکن قرآن میں وہ تمام قوانین خداوندی اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہیں۔ لہذا قرآن اب تمام نوعِ انسانی کے لئے دینِ خداوندی کا داد و مکمل ضابطہ ہے جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی۔

ہوں اور) جو ہر طرف سے ہٹ کر صرف اللہ ہی کا ہو رہنا ہے اور یقیناً ابراہیمؑ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔

اسلام کیا ہے؟ یہ مسلک کیا ہے؟ اپنے ہر فیصلے کے لئے قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرنا۔ اس سے بہتر مسلک اور کون سا ہو سکتا ہے؟ شرح اس اجمال کی

کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو اسلام کا نقطہء ماسکہ یہی مسلک ہے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ
وَاشْتَبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۗ وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ
خَلِيلًا ۝ (۴/۱۲۵)

اور (بتلاؤ) اس آدمی سے بہتر دین رکھنے والا کون ہو سکتا ہے جس نے قوانینِ خداوندی کے آگے سیراطِ امت جھکا دیا اور حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی اور اس طرح اُس نے ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کی جو صرف خدا ہی کے لئے ہو رہا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست مخلص بنا لیا تھا (جس سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے)۔

یہی وہ راہِ ہدایت و سعادت ہے جس کی اقتدا کا حکم قرآنِ کریم نے دیا ہے (دیکھئے ۹۴-۹۷/۸۴)۔ جو دین ان حضراتِ انبیاءِ کرامؑ کی وساطت سے وقتاً فوقتاً آتا رہا، اس کے متعلق یوں سمجھئے کہ ایک ہی شمع ہے جس کی مختلف کرنیں ہیں، ایک ہی لڑی ہے جس کے مختلف ہوتی ہیں، ایک ہی چشمہ ہے جس کی مختلف ندیاں ہیں، ایک ہی ابرو رحمت ہے جس کے مختلف قطرات ہیں۔ ان میں 'تخالف و تبائن' انسانی قطع و برید نے پیدا کر دیا۔ ان اختلافات کو مٹانے اور ملتے ابراہیمیؑ کو اس کی اصلی شکل میں اجاگر کرنے کے لئے حضورِ خاتم النبیینؐ تشریف لائے (۱۶۱-۱۶۲/۴) یعنی وہی توحیدِ ابراہیمیؑ اپنے حقیقی

نام بھی وہی مسلم رنگ میں 'وہی' شرابِ طہور "مرویز زمانہ سے تندہی اور تیزی میں اور بھی بڑھی ہوئی، حتیٰ کہ لیبیل بھی وہی پُرانا کہ "جعلی اور اصلی" مال کے پہچاننے

میں کسی کو وقت نہ ہو یعنی "مسلم" (۲۲/۸۸)۔ اب دنیا میں اسلام (دینِ حقیقی) قرآنِ کریم کے باہر اور کہیں نہیں۔ اس لئے کہ حضرت ابراہیمؑ (بلکہ حضرت نوحؑ) سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک، تمام انبیائے کرامؑ کی تعلیم یا تو حوادثِ ارضی و سماوی سے ضائع ہو چکی ہے اور یا انسانی تحریفات سے مسخ۔ ان تمام

حضرات کی حقیقی اور اصلی تعلیم اب قرآن کے اندر محفوظ و مصنون ہے۔ اس لئے یہی اسلام ہے، یہی اللہ کا متعین فرمودہ دین ہے۔ سورۃ آل عمران میں اس حقیقت باہرہ کو نہایت دل نشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْتَغُونَ وَ لَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَ
الْأَرْضِ طَوْعًا وَ كَرْهًا وَ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۝ (۳/۸۳)

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین تلاش کر لیں! حالانکہ آسمان و زمین میں جو کوئی بھی موجود ہے طوعاً و کرہاً مگر سب اسی کے حکم کا فرماں بردار ہے اور ہر ایک کا قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہے۔

اسلام کے متعلق ایک اصولی نکتہ | یہاں ایک اصولی حقیقت کو بیان فرمایا کہ جب کائنات کی ہر شے ایک متعینہ نظام کے تابع چل رہی ہے تو کیا انسان کے لئے ضروری نہیں کہ وہ بھی اللہ کے نظام (دین اللہ) کے تابع چلے؟ وہ دین اللہ کیا ہے؟

قُلْ أَمَّا بِاللهِ وَ مَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَ مَا أُنزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ
وَ إسماعِيلَ وَ إسحاقَ وَ يعقوبَ وَ آلِ سَباطِ وَ مَا أُوتِيَ مُوسَىٰ
وَ عِيسَىٰ وَ الَّذِينَ مِنْ رَبِّهِمْ ۝ وَ لَفَرَّقَ بَيْنَ أَحِبِّهِمْ
وَ غَنُّ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ (۳/۸۴)

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو (ہماری راہ تو یہ ہے کہ) ہم اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور جو کچھ ہم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ ابراہیم، اسمعیل، اسحاق، یعقوب اور یعقوب کی اولاد پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیز جو کچھ موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور خدا کے دیگر تمام نبیوں کو خدا کی طرف سے ملا ہے اُس سب پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ ہم ان رسولوں میں سے کسی ایک کی بھی تفریق نہیں کرتے۔ ہم خدا کے فرماں بردار ہیں۔

صرف قرآن کے اندر | تمام انبیائے سابقہ کی خالص تعلیم جو اب مَا أُنزِلَ عَلَيْنَا (قرآن مجید) کے دفتین میں محفوظ ہے، یہ ہے اسلام۔ اس کے علاوہ کسی اور

مسلك کا اتباع خدا کے ہاں قبول نہیں۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۗ وَهُوَ فِي
الْآخِرَةِ مِنَ الْخَسِرِينَ ۝ (۳/۸۵)

اور (دیکھو) جو کوئی اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کا خواہشمند ہوگا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا
اور آخر الامر اس کی جگہ ان لوگوں میں ہوگی جو تباہ و نامراد ہوں گے!

اب اس کے بعد وہ عظیم اصول ہمارے سامنے آتا ہے جس کی رو سے حضرت ابراہیمؑ نے ملتِ حنیفہ کی
تاسیس فرمائی۔ حضرت نوحؑ کے تذکرہ جلیلہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ جن انسانی
حدود و قیود کی بنا پر دنیا میں انسانوں کی تقسیم عمل میں لائی جا رہی ہے، یہ
قومیت اور اسلام سب طاغوتی تقسیمات ہیں۔ اللہ کا متعین فرمودہ دین (اسلام) نسل، رنگ،
زبان، وطن کی تمام حدود کو مٹا کر صرف ایک معیارِ تقسیم باقی رکھتا ہے اور وہ معیار ہے اللہ اور غیر اللہ کا۔ دنیا
کے تمام انسان جو قوانینِ الہیہ کے تابع زندگی بسر کرنے کا عہد کر لیں (مومنین) وہ ایک قوم اور جو انسانوں
کے خود ساختہ قوانین کی محکومیت میں زندگی بسر کریں وہ دوسری قوم۔ یہ ہے وہ اصل الاصول جس کی رو
سے ملتِ اسلامیہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس اساسی تقسیم کی رو سے اپنے اور بیگانے کا امتیاز اٹھ جاتا ہے۔
ہر وہ بیگانہ، جو حکومتِ الہیہ کے شامیانے کے نیچے آجائے بیگانہ ہو جاتا ہے اور ہر وہ بیگانہ جو اپنے آپ کو
اس کے سامنے سے باہر رکھے گا بے گانہ بن جاتا ہے۔ حضرت نوحؑ سے جب کہا گیا کہ تمہارا بیٹا تمہارے اہل
سے نہیں اس لئے کہ وہ غیر اللہ کی غلامی اختیار کئے ہے تو یہ اسی تقسیمِ الہیہ کی بنیاد پر تھا۔ اس حکمِ بنیاد نے
حضرت ابراہیمؑ کے اسوہ مقدسہ سے ایک بلند و بالا عمارت کی صورت اختیار کر لی جس کی تکمیل حضورِ قائمِ البیتینؑ
کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہ درخشندہ اصول اپنے اعزہ اور قوم کے سامنے پیش کیا کہ
فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۚ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ كَافِرٌ بَدِيعٌ ۗ (۱۳)

تو جو میرے پیچھے چلا وہ میرا ہوا۔ جس نے میرے طریقے سے نافرمانی کی (اس سے میرا کوئی رشتہ
نہیں) اور تو "غفور الرحیم" ہے۔

فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۚ وہ حکمِ بنیاد ہے جس پر ملتِ اسلامیہ کی پوری عمارت قائم ہے۔ اس

اصول کے ماتحت حضرت ابراہیم نے سب سے پہلے اپنے باپ اور اس کے بعد اپنی پوری کی پوری نوا سے اعلان بیزاری کر دیا اور ان سے یکسر قطع تعلق کر لیا۔

وَ اعْتَزِلْكُمْ وَ مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ذَاذْعُوا رَبِّي نَحْلَةً عَلَيَّ
أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا ۝ (۱۹/۷۸)۔

میں نے تم سب کو چھوڑا اور انہیں بھی، جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، میں اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں۔ امید ہے کہ اپنے پروردگار کو پکارنے میں محروم ثابت نہیں ہوں گا۔

پھر وطن کو چھوڑا تو اس انقلاب آفریں اصول کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا کہ اگر کبھی دین اور وطن میں آویزش ہو جائے تو ایک مرد مومن کا دامن وطن کی گرد سے کبھی آلودہ نہیں ہوگا۔ وہ اپنا دامن جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوگا اور سب **وطنیت اور اسلام** کچھ چھوڑ کر کسی ایسی فضا میں چلا جائے گا جو قیام حکومت خداوندی کے لئے سازگار ہو اور اسے اپنا مرکز قرار دے کر اس حکومت کی حدود کو وسیع سے وسیع تر کرتا چلا جائے گا۔ وہاں پہنچ کر اس کی ایک نئی قوم ہوگی، نئے رشتے ہوں گے، نئے تعلقات ہوں گے اور ان سب میں وجہ جامعیت اللہ کی حکومت کا رشتہ حکم ہوگا۔ کفر و اسلام کی اس تفریق کے باب میں حضرت ابراہیم نے ایک ایسا کھلا اور واضح مسلک اختیار فرمایا جسے اللہ تعالیٰ نے پیرانِ ملت ابراہیمی کے لئے اسوہ حسنہ (بہترین نمونہ) قرار دے دیا۔ پہلے سورہ متحنہ کی ان تمہیدی آیات پر غور کیجئے۔ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ
..... كُنْ تَنْفَعَكُمْ أَنهَامُكُمْ وَ لَا أَوْلَادُكُمْ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ نَجْفِصِلُ
بَيْنَكُمْ وَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ (۴۰/۳-۱)

اے پیرانِ دعوت ایمانی! میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ کہ ان سے دوستی کا برتاؤ کرنے لگو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ جو کچھ حق تمہارے پاس آچکا ہے وہ اس کے ساتھ کفر کا برتاؤ کرتے ہیں۔ انہوں نے (محض اس جرم کی پاداش میں) کہ تم اپنے پروردگار خدا پر ایمان لے آئے ہو، رسول کو اور خود تمہیں بھی شہر بدر کر دیا۔ (سو اگر تم واقعی) میرے راستہ میں جہاد کرنے اور میری مرضی طلب کرنے کے لئے اپنے گھر بار کو چھوڑ کر نکلے ہو تو کیا پھر چپکے چپکے

ان سے دوستی بھی کرتے ہو؟ (بڑی حیرت ناک بات ہے) جو کچھ تم علانیہ کرتے ہو یا جو کچھ تم خفیہ کرتے ہو، میں سب کچھ جانتا ہوں۔ (یاد رکھو) جو کوئی تم میں سے ایسا کرے گا وہ سیدھے راستہ سے کھو گیا۔ (ان کی حالت یہ ہے کہ بظاہر تمہارے دوست بن جاتے ہیں لیکن اگر انہیں تم پر دسترس حاصل ہو جائے تو وہ (کھلم کھلا) تمہارے دشمن بن جائیں گے اور برائی کے ساتھ تم پر دست درازی اور زبان درازی کرنے لگیں گے۔ اور وہ تو اس کے مستحق ہیں کہ کاش تم (بھی ان کی طرح) کفر کا شیوہ اختیار کر لو۔) تو ان کی چکنی چپڑی باتوں میں ہرگز نہ آنا۔ اور یاد رکھو) انقلابِ خداوندی کے وقت تمہاری رشتہ داریاں اور تمہاری اولاد ہرگز تمہارے کام نہ آئے گی۔ (اُس وقت) خدا تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گا اور جو کچھ تم کر رہے ہو خدا اُسے دیکھ رہا ہے۔

اس اصول کی تین کے بعد فرمایا۔

اُسُوۃٌ حَسَنَةٌ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسُوۃً حَسَنَةً فِیْ اِبْرٰہِیْمَ وَاٰلِہٖٖنَا مَعَهُ

..... حَسْبٰی تُوْمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَحَدّٰی كَآءِیۡنًا (۹۰/۴)

تمہارے لئے ابراہیم اور اس کے رفقاء میں ایک بہتر نمونہ موجود ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے (صاف صاف) کہہ دیا تھا کہ ہم تم سے اور تمہارے اُن (معبودوں) سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کر رہے ہو (قطعاً) بیزار ہیں۔ ہم (تمہارے ساتھ تعلقات رکھنے سے یکسر) انکار کرتے ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور دشمنی ہمیشہ کے لئے واضح ہو چکی ہے، تاآنکہ تم بھی (ہماری طرح) خدا کے یگانہ و یکتا پر ایمان لے آؤ۔ ذرا غور فرمائیے! کس قدر نکھرے ہوئے انداز میں مومن اور غیر مومن کے تعلقات میں امتیاز کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ایک مومن کا مسلک زندگی یہ ہے کہ ع

ہمیں بھلا اُن سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا ہے؟

حَسْبٰی تُوْمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَحَدّٰی كَآءِیۡنًا وہ خدا کے واحد پر ایمان لا کر ہماری ملت میں شامل نہ ہو جائیں۔ یہ ہیں ملتِ حنیفہ کے قائدِ اولین کے وہ نقوشِ قدم جنہیں اُنے والوں کے لئے اسوۃ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ اسوۃ حسنہ ہے کس کے لئے؟ صرف اُس کے لئے جو اللہ اور اُس کے قانونِ مکافات پر

ایمان رکھتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَ
الْيَوْمَ الْآخِرَ ۗ وَ مَن يَتَوَكَّلْ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (۲۰/۲۱)
حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کی زندگی میں تمہارے لئے یعنی ان کے لئے جو اللہ (کے سامنے حاضر
ہونے) اور قانونِ مکافات کی صداقت کو اپنے سامنے رکھتے ہیں ایک حسین نمونہ ہے اور جو (اس
نمونہ سے) روگردانی کرے تو اللہ (کا نظام) ایسے لوگوں سے بے نیاز اور درخور ستائش ہے۔

یعنی جو اس اصول سے مُنہ موڑے اور قومیتوں کی تشکیل نسل یا وطن کی رُو سے کرے تو نظامِ خداوندی کا
اس سے کیا بگڑتا ہے؟ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ۔

اسوۂ ابراہیمیؑ نے ہمارے سامنے جو اصول پیش کیا ہے، اس کی دل آویز وضاحت علامہ اقبالؒ نے

ان الفاظ میں کی ہے۔

ملتِ مارا اساسِ دیگر است این اساس اندر دلِ ماضی است
قوم تو از رنگِ دخولِ بالاتر است قیمتِ یک اسودش صد احمر است
اسی اصول کو ایک دل نشین مثال کی رُو سے یوں سمجھئے کہ ہے

نکتہ اے ہمدمِ فدائے ہیں شہد را در خانہ بائے لائے ہیں
قطرہ از لالہِ حمراستے قطرہ از زنگسِ شہلاستے
این نمی گوید کہ من از جہتِ شرم آن نمی گوید من از نیلِ فہم

اس مثال کے پیش نظر ہے

ملتِ ماشانِ ابراہیمی است
شہدِ مایمانِ ابراہیمی است

لہذا ہے

نیست از روم و عرب پیوندِ ما نیست پابندِ نسبِ پیوندِ ما

لے لائے، شہد کا چھتہ، ے جہرہ، زنگس، لے شان، شہد کا چھتہ۔

دل بہ محبوبِ حجازی بستہ ایم ذریں جہت با یکدگر پیوستہ ایم
رشتہ مایک تو لائیش بس است چشم ہمارا کیف مہباش بس است

باز بخوشتن نگر! یہ ہے وہ اسلوبِ حیات جو اسوۂ ابراہیمیؑ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر ذرا یہ بھی سوچئے کہ آج خود ملتِ ابراہیمیؑ کے مدعیان کی حالت کیا ہے؟

چہ گوئمت ز مسلمان ناسمانے

جز ایں کہ پویدِ خلیل است و آذری داند (اقبالؑ)

اسوۂ ابراہیمیؑ نے سب سے پہلے ہمارے سامنے توحید کی ایسی عملی تعلیم پیش کی ہے جس سے
لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا صحیح مفہوم وجہ تہابانی قلب و نگاہ بن جاتا ہے۔ یہ ہمیں اسوۂ ابراہیمیؑ ہی نے
بتایا ہے کہ

انتہائے کارِ عالم لَا إِلَهَ

لَا إِلَهَ جَزَمِيخ بَلْ زَهَارِيست

لَا إِلَهَ ضَرَبَتْ وَأَضْرَبَتْ كَارِيست

(اقبالؑ)

نقطۂ ادوارِ عالم لَا إِلَهَ

ایں دو حرفِ لَا إِلَهَ گفتار نیست

زیستن با سوزِ اوقباری است

یہی وہ ضربِ لَا إِلَهَ تھی جس سے اس علمبردارِ توحید نے مرئی اور غیر مرئی ہر قسم کے بتوں کو پاش پاش کر کے
رکھ دیا! لیکن اُس بُت شکن کے نام لیواؤں کی آج کیا حالت ہے؟

می تراشد فکر ما ہر دم خد اوند دگر

رست از یک بند تا افتاد در بست دگر

ہر بڑی چوکھٹ پر سجدہ ریز — مسلمان! اپنے قلب و دماغ کو بت کہہ بنائے ہوئے — مسلمان!!!

پس خلیل اور نمک پروردہ نمارید — مسلمان!!!

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بواجبی است

اور اس پر خود فریبی کا یہ عالم کہ

پس رکفت پیرے خرقة بازے ترایں نکتہ باید حرزِ جہاں کرد
بہ نمرودان این دور آشنا باش ز فیض شاں براہی تو ان کرد

فرقہ بندیوں کا شرک | دوسری چیز ہمیں اسوۂ ابراہیمی نے یہ بتائی کہ ملتِ عظیمہ دنیا میں صرف
مسلم کے نام سے پہچانی جائے گی۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی اور نام نہیں
ہوگا۔ فرقہ بندی اور گروہ سازی قرآن کی رو سے شرک ہے۔

مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَ اتَّقُوهُ وَاَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ
الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۗ كُلُّ
حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (۳۱-۳۲/۳۰)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے (قرآن کا اتباع کرو اور اسی سے
ڈرو اور صلوٰۃ کے نظام کو قائم کرو اور شرک کرنے والوں میں سے نہ بن جاؤ۔ یعنی) ان لوگوں میں
سے نہ بن جاؤ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ اندازی کی اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ پھر ہر گروہ
اپنے اعتقادات پر خوش ہے جنہیں وہ لئے بیٹھا ہے۔

لیکن آج ساری دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈتے شیعہ، سُنی، حنفی، شافعی، مقلد، غیر مقلد سب ملیں گے۔
لیکن جو فقط مُسْلِم کے نام سے اپنا تعارف کراتے شاید ہی کہیں ملے اور اگر کوئی کہے بھی کہ میں مسلمان
تو فوراً سوال ہوتا ہے کون مُسلمان؟ گویا فقط مسلمان تعارف کے لئے کافی نہیں۔ یہود و نصاریٰ
نے بھی حضرت ابراہیمؑ کو انہی گروہ بازیوں میں جکڑنا چاہا تھا لیکن قرآن نے یہ کہہ کر ان تمام ہندوسلاسل
کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے کہ

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنزِلَتِ التَّوْرَةُ
وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (۳/۶۵)

اے اہل کتاب! تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو کہ ان کا طریقہ یہودیت کا طریقہ
تھا یا نصاریت کا طریقہ تھا (حالانکہ تورات اور انجیل (جن کے نام پر یہ گروہ بندیاں قائم کی
گئی ہیں) نازل نہیں ہوئی ہیں مگر اس کے بہت بعد (پس ظاہر ہے کہ جس وقت اس گروہ بندی

کا وجود ہی نہ تھا، وہ کیونکر اس کا پیرو ہو سکتا ہے؟ کیا (اسی موٹی سی بات بھی) تم نہیں سمجھ سکتے؟

یعنی جن نسبتوں سے تم حضرت ابراہیم کو خالص "مسلم" کے بجائے یہود و نصاریٰ کے نام سے متعارف کرانا چاہتے ہو وہ نسبتیں تو حضرت ابراہیم کے بعد پیدا ہوئیں۔ اس لئے انہیں ان نسبتوں سے کس طرح موسوم کر سکتے ہو! ہم پوچھتے ہیں کہ کیا یہ شیعہ، سُنی، حنفی اور مالکی (وغیرہ) کی نسبتیں نبی اکرمؐ کے بعد کی پیدا شدہ نہیں ہیں؟ حضرت ابراہیمؑ نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ فقط مسلم تھے۔ اسی طرح نبی اکرمؐ نہ شیعہ تھے نہ سُنی، فقط مسلم تھے۔ پھر یہ تعارفی حد بندیاں کیسی ہیں!

لیکن یہ پوچھنا تو آج جُبریمِ عظیم ہے۔ اس لئے کہ ان نسبتوں کی محبت مسلمانوں کی رگ و پے میں کچھ اس طرح حلول کر گئی ہے کہ اسے خالی "مسلم" کہلانے میں لذت ہی نہیں ملتی۔ ہم اس کے سوا اور کیا کہیں کہے

لے کہ شناسیِ خفی را از جلی ہشیار باش

لے گرفتار ابو بکر و علی ہشیار باش

نسل اور وطن کے بُت کدے | تیسری چیز سوۃ ابراہیمی نے ملتِ اسلامیہ کی تشکیل کا اصول اسی پیش کیا کہ ہر قطرہ جو سمندر

میں آ ملا سمندر ہو گیا۔ اس کی انفرادی شخصیت اجتماعی زندگی میں مدغم ہو گئی۔ لیکن ذرا روئے زمین کے مسلمانوں کی حالت پر نظر ڈالنے اور دیکھنے کہ وہ نسل اور وطن کے بند و سلاسل میں کس بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ ع

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی

اوپھر اس جغرافیائی حدود کی تقسیم پر ہی اکتفا نہیں، سید، پٹھان، قریش، مرزا کی نسلی تفریق! اور یہ سب ملتِ ابراہیمی کی نسبت کے دعویٰ دار! اس سے بڑا جھوٹ بھی کہیں سنا گیا ہے؟ قرآن کریم نے جب "مِلَّتِ اِبْرٰہِیْمُ" فرمایا تھا تو اس کے مخاطب فقط قریش نہ تھے جن سے حضرت ابراہیمؑ کی نسبت، نسبتِ سببِ بختی، بلکہ اس میں دنیا کے تمام مسلمان شامل تھے۔ لہذا یہ رشتہ ابویتِ اسلامی

تھا۔ تمام مسلمان توحید کے فرزند اور ایک اللہ کے غلام، سب نسبتیں اس ایک نسبت کے اندر مدغم، تمام رشتے اس ایک رشتے میں جذب۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے بھی وہی کچھ کیا جو اوروں نے کیا تھا۔ اب اس کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جائے جو پہلے کہا جا چکا ہے کہ

چہ گو مت ز مسلمان نامسلمانے
جزایں کہ پور غلیل است و آندی داند

ذُریتِ ابراہیمی | یہ ہے اسوۂ حسنہ حضرت ابراہیمؑ کا جنہیں اللہ تعالیٰ نے شرفِ انسانیّت کے مقامِ بلند پر فائز المرام فرما کر ان پر گونا گوں نعمتوں کا اتمام کیا (۱۲/۶۱) ان نعمتے خداوندی کی ازانی صرف آپ کی ذات تک ہی محدود نہ رہی بلکہ آپ کی ذریت میں بھی اس کا سلسلہ جاری رہا (۱۹/۵۸)۔

ملکِ عظیم بھی | آلِ ابراہیمؑ کو نبوت کے ساتھ ملکِ عظیم بھی عطا فرمایا۔
وَ اتَيْنَهُمْ مَلَكًا عَظِيمًا ۝ (۴/۵۴)

ہم نے خاندانِ ابراہیمؑ کو کتاب اور حکمت دی تھی اور ساتھ ہی عظیم الشان سلطنت بھی عطا فرمائی تھی۔

اس لئے کہ

ایں دو قوت حافظِ یکفِ دیگر اند

کائناتِ زندگی را محور اند

انہیں اقوامِ عالم پر فضیلت عطا فرمائی (۳/۳۳۱) اور ان کی قیادت و امامت ان کے سپرد کی۔

وَ جَعَلْنَاهُمْ اٰيٰمَةً يَّتَّبِعُوْنَ يَا مَعْرِبٰ (۲۱/۲۱)

ہم نے انہیں نوعِ انسانی کی امامت عطا فرمائی اس لئے کہ وہ

ہمارے حکم کے مطابق راہ دکھاتے تھے۔

دنیا میں بھی سرفرازی اور عاقبت میں بھی سرفرازی۔

وَ اتَيْنَاهُ اجْرًا فِي الدُّنْيَا ۚ وَ اِنَّهُ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ
الضَّالِّينَ ۝ (۲۹/۲۷)

اور اس (کی خوش کرداری) کا اجر دنیا میں بھی دے دیا کہ نوح انسانی کا اسے امام
بنادیا اور بلاشبہ آخرت میں تو وہ نیک کردار لوگوں میں سے ہے ہی وہاں بھی اس کا اجر
ضائع نہ ہوگا۔

خدا کی غلامی | سورہ انبیاء کی آیات (۷۲ — ۲۱/۷۳) پر پھر غور کیجئے۔ ساری دنیا کے امام
اور پیشوا لیکن اللہ کے غلام (وَ كُنَّا اَوْلٰٓءًا لِّمَا كُنَّا عَلَيْهِمْ) حقیقت یہ

ہے کہ یہ امامت اور قیادت حاصل ہی خدا کی عبودیت سے ہوتی ہے۔ ایک اللہ کے محکوم اور ساری
دنیا کے حاکم اور یہ حکومت کس لئے؟ تاکہ دنیا کو اللہ کی محکومیت سکھائی جائے۔ اسی کی وجہ سے آل ابراہیم
کو اقوام عالم پر برتری اور فوقیت حاصل تھی اور انہیں عظیم الشان حکومت (ملک عظیم) عطا ہوئی تھی لیکن
اس نبوت اور حکومت میں (معاذ اللہ) برہمنیت اور ملوکیت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ اس کا سلسلہ اگر ذریت
ابراہیم (آپ کی نسل) میں قائم رہا تو موروثی حق کی بنا پر نہیں بلکہ جو ہر ذاتی کی
موروثیت نہیں بنا پر تھا۔ اس لئے، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، جب حضرت ابراہیم نے اپنی

ذریت (نسل) کے متعلق دریافت کیا تو آپ سے واضح طور کہہ دیا گیا کہ لَا يَمَالُ عَهْدُ
الظَّالِمِينَ (۲/۱۲۴) ”میرے عہد میں ظالمین کا کوئی حصہ نہیں“ یعنی یہ عہد مشروط ہے ایمان اور
اعمال صالح سے۔ وراثت کا اس میں کچھ دخل نہیں۔ ملت ابراہیمی کے اتباع کے مدعی اس حقیقت
کبریٰ کو سامنے رکھیں اور پھر سوچیں کہ ان کی روش زندگی کیا ہے۔ آج ”دنیا نے کفر“ کی یہ حالت
ہے کہ قریباً ہر قوم نے وراثتی ملوکیت اور برہمنیت کو چھوڑ دیا ہے۔ لیکن قیامت ہے کہ وراثتی ملوکیت
اور برہمنیت اگر کہیں ہے تو مسلمانوں میں۔ سنجیدگی سے غور کرنے والوں کے نزدیک کیا اس سے
زیادہ الم انجیز حقیقت کوئی اور بھی ہو سکتی ہے کہ خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہو جانے کے حادثہ فاجعہ
کو مسلمان اپنے ہر سانس میں مستوجب ہزار لعنت قرار دیتا ہے اور ملوکیت کی لعنت کو اس
طرح اپنے سینہ سے لگائے لگائے پھرتا ہے کہ تیرہ سو سال سے مسلمانوں کے ہر ملک اور ہر قوم
میں ملوکیت جاری ہے اور آج جب کہ (قریب قریب) ساری دنیا اس لعنت کو دور کر چکی اور کڑی

ہے مسلمانوں میں یہ لعنت بدستور قائم ہے۔ جو قوم زندگی کے حقائق کا اسی طرح مذاق اڑائے اُس کا انجام ذلت و خواری کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهٖمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝ (۲/۱۵) ”جو لوگ قوانینِ الہیہ سے تمسخر کرتے ہیں اللہ کا قانون ان کی زندگی کا تمسخر اڑاتا ہے۔“

باقی رہی برہمنیت (یعنی روحانی ملوکیت) سوا اس کے لئے بھی دیکھ لیجئے کہ آج خالقِ ہاں اور اُن کی موروٹی خلافتیں کس قوم کے دماغ پر برف کی سلیں بن کر اُن کے قوائے عملیہ کو مفلوج کئے ہوئے ہیں اور مُلازم کی اکاس بیل کس کے شجرِ طیب کو خزاں کا نشیمن بنائے ہوئے ہے!

احیائے قوم کا سنگین مرحلہ | دنیا میں خدائی انقلاب کی طرف دعوت دینے والوں اور لوگوں کو انسانوں کے خود ساختہ قوانین سے مُنہ

موڑ کر فقط ایک اللہ کے قوانین کی اطاعت سکھانے والوں کی مشکلات پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کا کام ”مردوں کو از سر نو زندگی بخشنے“ سے کم دشوار اور سنگین نہیں ہوتا۔ وہ ان کی اصلاح اور صحت بخشی کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں لیکن اُدھر سے جمود اور بے حسی یا سرکشی اور مخالفت کے سوا کوئی ردِ عمل نہیں ہوتا۔ یہی ہے وہ کیفیت جس کے اظہار کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں بار بار یہ سوال اُٹھتا تھا کہ اے موت و حیات کے مالک! اس قسم کے مردوں میں زندگی کس طریق سے پیدا ہوگی؟

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتٰى ۝ (۲/۲۶۰)

جب ابراہیم نے کہا اے پروردگار! مجھے دکھا دے کہ تو کس طرح مردوں کو زندہ کر دے گا۔

جواب ملا۔

قَالَ اَوْ لَمْ تُؤْمِنْ ۝ (۲/۲۶۰)

ارشاد ہوا کیا تیرا اس پر ایمان نہیں کہ اس پیغام سے مردوں کو زندگی مل سکتی ہے؟

قَالَ بَلَىٰ وَ لَكِن لَّيَطْمَنَّ قَلْبِي ۝ (۲/۲۶۰)

عرض کیا کہ ایساں کیوں نہیں؟ لیکن اس سوال سے مقصود
اطمینانِ قلب ہے۔

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ موت اور حیات (زندوں اور مردوں) سے وہی مراد ہے جو اوپر
بیان کی گئی ہے اور دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کس بات کا اطمینان چاہتے تھے۔

پہلے سوال کے متعلق واضح ہے کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر، ان لوگوں کو جو پیغامِ خداوندی
پر کان نہ دھر کر، خلافِ شرفِ انسانیت راستوں پر گامزن رہتے ہیں، اندھے اور بہرے اور مردے کہا گیا
ہے (دیکھئے ۸۰ - ۸۱/۲۶ - ۵۲ - ۵۳/۱۳۰)۔ خود نبی اکرمؐ کی دعوت کے متعلق کہا گیا ہے کہ ”تم خدا
اور رسولؐ کی آواز پر لبیک کہو اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ“ (۸/۲۴) ”جب وہ تمہیں اس چیز کی
طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرے“ ظاہر ہے کہ یہاں ”زندگ“ سے مراد طبعی حیات نہیں،
انسانیت کی زندگی ہے۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ قرآن کا پیغام اُسے فائدہ دے سکتا ہے مَن
كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰) ”جس میں زندگی کی رمتی باقی ہو“ ان (اور ان جیسے دیگر مقامات) سے واضح ہے
کہ حضرت ابراہیمؑ نے جن مردوں کو زندگی عطا ہونے کی بابت سوال کیا تھا، اُن سے مراد ان کی وہ قوم تھی جو
حیاتِ انسانیت سے عاری ہو چکی تھی۔

دوسرے سوال کے متعلق یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ آپ نے پوچھا یہ تھا کہ كَيْفَ تَحْيِي الْمَوْتِي ۝
(۲/۲۶۰) ”تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے؟“ اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تو مردوں
کو زندہ کر سکتا ہے یا نہیں! پوچھا یہ گیا ہے کہ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کون سا طریقہ اختیار کیا جائے جس
سے ان مردوں کو زندگی عطا ہو جائے، یعنی آپ نے یہ کہا تھا کہ مجھے اس کا تو یقین ہے کہ اس پیغام میں
اس کی صلاحیت ہے کہ یہ مردوں کو زندہ کر دے۔ لیکن مجھے اس کا اطمینان نہیں کہ اس مقصد کے لئے میں
جو طریقہ اختیار کر رہا ہوں وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اس لئے مجھے یہ بتا دے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے صحیح
طریقہ کیا ہے۔ اَكَيْفَ سے یہی مراد ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے پوچھا تھا کہ یہ لوگ جو دعوتِ حق و صداقت سے اس قدر متوحش ہوتے ہیں کہ
اس کے قریب تک نہیں آتے یہ اس سے کس طرح مانوس ہوں گے؟ اس کا جواب ایک مثال کے

ذریعہ سمجھایا گیا۔ ارشاد ہوا۔

قَالَ فَخُذْ أَدْبَعَةَ مِنَ الظَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَى
كُلِّ جَبَلٍ مِنْهُنَّ جُزْءًا لَّئِمًّا اذْهَبْنَ يَا بَيْنِكَ سَعِيًا وَ اعْلَمْ
أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (۲/۲۶۰)

ارشاد الہی ہوا، اچھا، یوں کرو کہ جنگل میں سے چار پرندے پکڑ لو اور انہیں اپنے پاس رکھ کر اپنے ساتھ بلاؤ (یعنی اس طرح ان کی تربیت کرو کہ وہ اچھی طرح تم سے ہل جائیں)۔ پھر ان میں سے ہر ایک کو (اپنے سے دور) ایک ایک پہاڑ پر بٹھا دو۔ پھر انہیں بلاؤ وہ (آواز سنتے ہی) تمہاری طرف اڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔ اللہ سب پر غالب اور اپنے کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔

یعنی جب پرندوں تک کی یہ حالت ہے (جو انسان کے سایہ تک سے بدک جاتے ہیں) کہ اگر انہیں کچھ دنوں تک اپنے ساتھ مانوس کر لیا جائے تو اس کے بعد خواہ انہیں کیسا ہی آزاد کیوں نہ چھوڑ دیا جائے ایک آواز دینے پر وہ لبتیک، لبتیک، لبتیک کہتے ہوئے دوڑ آتے ہیں، تو کیا یہ ناممکن ہے کہ انسان (بشرطیکہ ان میں صلاحیت باقی ہو) مسلسل تربیت سے دعوتِ حق و صداقت سے مانوس نہ ہو جائیں اور ان میں یہ تبدیلی پیدا نہ ہو جائے کہ وہ بھی ایک آواز پر جمع ہو جائیں۔ لیکن اس کے لئے اتنے ہی استقلال استقامت (PATIENCE) کی ضرورت ہے جتنی ایک وحشی پرند کو بلانے اور سدھانے کے لئے درکار ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ کون سی قوم تھی جس کے متعلق حضرت ابراہیمؑ نے ان تاثرات کا اظہار فرمایا تھا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ ان کی کلدانی زندگی کے بعد کا واقعہ ہے۔ اس لئے کہ اس میں ”مردوں کی زندگی“ کا یقین دلایا گیا اور طریقہ بتایا گیا ہے۔ لہذا جس قوم کے متعلق ان تاثرات کا اظہار ہوا ہے وہ بالآخر رام ہو کر حضرت ابراہیمؑ کے گرو ضرور جمع ہوئی ہوگی۔ یہی وہ قوم تھی جس میں حضرت ابراہیمؑ نے نظامِ خداوندی کو قائم فرمایا تھا۔

بعض لوگ اس واقعہ کو اس کے ظاہری الفاظ پر محمول کرتے ہیں، یعنی ان کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ سوال کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ حشر کے روز مردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ اس کے جواب

میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ ”چار پرندوں کو لے کر اپنے ساتھ بلاؤ (پھر انہیں ذبح کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو) ان کا ایک ایک حصہ چار پہاڑوں پر رکھ دو۔ پھر انہیں بلاؤ تو وہ دوڑتے ہوئے تیری طرف آجائیں گے۔“ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اللہ تعالیٰ ذبح شدہ پرندوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ جب ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو مرنے کے بعد بھی زندگی عطا کرتا ہے تو اس کے لئے مردہ پرندوں کو زندہ کر دینا کیوں مستبعد ہو؟ لیکن قرآن کریم سے اس تفسیر کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔ اول تو یہ کہ اس کے لئے مندرجہ صدر ترجمہ میں قوسین کی عبارت کا اپنی طرف سے اضافہ کرنا ہوگا، یعنی پرندوں کو ذبح کر کے قیمہ قیمہ کرنے کا واقعہ قرآن کریم میں نہیں۔ اسے اپنی طرف سے بڑھانا ہوگا۔ ثانیاً یہ کہ ایک مرد مومن کے لئے اللہ اور آخرت پر ایمان، نقطہ آغاز ہے۔ اس کی زندگی کی تمام عمارت اسی بنیاد پر اٹھتی ہے۔ اس لئے وہ حیات بعد الموت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا تقاضا نہیں کر سکتا۔ ثالثاً یہ کہ دو ہی آیات بیشتر بادشاہ کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مباحثہ کا ذکر ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ نے ذاتِ خداوندی کے متعلق سب سے پہلی دلیل یہ پیش کی ہے کہ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیِیْ وَ یُمِیْتُ (۲/۲۵۸) ”میرا رب وہ ہے جو زندگی عطا کرتا ہے اور مارتا ہے۔ اس لئے آپ کا اللہ تعالیٰ سے یہ کہنا کہ میں طمانیتِ قلب کے لئے یہ کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں، قرینہ سے ٹھیک معلوم نہیں ہوتا اور بالبعاء اگر اللہ تعالیٰ نے یہی دکھلانا تھا کہ ہم یوں مردوں کو زندہ کریں گے تو اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ ایک پرندہ کو ذبح کر کے ڈال دیا جاتا اور جب اس میں زندگی کے آثار ختم ہو جاتے تو وہ اڑنے لگ جاتا۔ اس کے لئے چار پرندوں کا قیمہ کر کے انہیں الگ الگ پہاڑوں پر رکھنا طولانی سا عمل نظر آتا ہے۔ بنا بریں اس واقعہ کا جو مفہوم ہم نے شروع میں لکھا ہے وہی قرآنی مفہوم معلوم ہوتا ہے فَصْرَهُنَّ رَیْنٰکَ (انہیں بلا کر اپنے ساتھ مانوس کر لو) کا ٹکڑا اس مفہوم کو واضح کر دیتا ہے۔

بہر حال، ان میں سے کوئی مفہوم بھی یقیناً ایک حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے، یعنی یہ چیز تو کبھی

حضرت ابراہیمؑ کو کسی قسم کا شک نہیں تھا

اللہ تعالیٰ کے مردوں کے زندہ کرنے کے سلسلہ میں شک کا کوئی شائبہ تک بھی تھا۔ انسانوں کی کفر و لہ اس کے لئے ایک مرتبہ پھر اس واقعہ کو شروع سے پڑھ جائیے اور جو کچھ ابتدا میں لکھا گیا ہے اسے نگاہوں کے

ضلالت کی روحانی موت کے بعد ہدایت و سعادت کی حیاتِ نو یا حشرِ اجساد، دونوں باتوں پر آپ کا یقین ایک غیر متزلزل ایمان کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس استحکام و یقین کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کارگہ ارض و سموات میں اپنی قدرت و ملکوت کے نظارے دکھلائے تھے۔

وَ كَذَلِكَ نُبْرِي آٰبْرٰهِيْمَ مَمْلُوكًا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنٰ
مِنَ الْمُؤَقِنِيْنَ ۝ (۶/۷۵)

اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت کے جلوے دکھا دیئے تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائے۔

یوں بھی، اگر ایک رسول کے دل میں بھی اپنے مشن کی آخری کامیابی (یا دوسرے مفہوم کی رُو سے حیاتِ اُخروی) کے متعلق شبہ گزرنے لگے تو پھر ہم دنیا میں ایمان کہاں تلاش کریں؟ حضراتِ انبیائے کرام کا ایمان اس شک و ارتیاب کی طوفانی دنیا میں، روشنی کے بلند مینار کی طرح مستحکم ہوتا ہے جو ہر ڈمگالے والی کشتی کے مسافروں کے لئے دلیلِ راہ اور وجہ استقامت قرار پاتا ہے۔ دیگر مذاہب کی مبینہ "آسمانی کتابوں" کے محرف ہونے کی ایک کھلی ہوئی دلیل یہ بھی ہے کہ ان میں حضراتِ انبیائے کرام کے متعلق ایسے ایسے افسانے موجود ہیں جو برگزان کی علوشان کے مناسب نہیں۔ قرآنِ کریم نے ان حضرات سے متعلق اس قسم کی تمام لغویات و خرافات کو الگ کر کے ان کی برگزیدہ سیرتوں کو نہایت مقدس انداز میں پیش کیا ہے جس سے ان کی رفعتِ مرتبت کی صحیح صحیح صورت قلب و نگاہ میں منقوش ہو جاتی ہے لیکن کس قدر تاسف کا مقام ہے کہ شومی قسمت سے ہمارے اسلامی لٹریچر میں متعدد راہوں سے ایسی ایسی چیزیں اندر گھس آئی ہیں جنہیں ان حضرات کی طرف منسوب کرتے ہوئے روحِ کانپ اٹھتی ہے۔ اسی واقعہ زیرِ نظر کو لیجئے بخاری شریف کی روایت ہے :-

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال

گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ، سامنے لے آئیے۔ پھر واضح ہو جائے گا کہ اس میں شک و شبہ کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے قوم کی شقاوت کو دیکھ کر اپنی ہجرت کا اظہار کیا تھا کہ یا اللہ! ایسی مُردہ قوم کے زندہ ہو جانے کی کونسی شکل ہوگی؟

نَحْنُ اِحْقَ بِاللشكِّ مِنْ اِبْرَاهِيمَ اِذْ قَالَ رَبِّ اَرِنِي كَيْفَ

تُنحَى الْمَوْتَى۔ (بخاری کتاب التفسیر ص ۶۸ جلد ۳)

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم شک کرنے میں

ابراہیم سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں جب انہوں نے کہا کہ اے میرے پروردگار مجھے دکھا کہ تو

مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے!

اس روایت سے ظاہر ہے کہ خدا کے ایک جلیل القدر نبی (حضرت ابراہیمؑ) نے (معاذ اللہ) اس باب میں

شک کیا اور دوسرے عظیم المرتبت نبی (حضور ختمی مرتبتؐ) نے کہا کہ ہم ان سے بھی زیادہ شک کرنے کا حق

رکھتے ہیں! اس روایت کی تشریح میں فتح الباری میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت

ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) دوسرے شیطانی سے ایسا کہا تھا:

قال ابن عباس هذا لما يعرض في الصدور دوسون

به الشيطان۔

آپ خود فرمائیے کہ یہ روایت کسی طرح بھی حضور نبی اکرمؐ کا ارشاد ہو سکتا ہے؟

اور صرف اس ایک روایت پر ہی کیا موقوف ہے حضرت ابراہیمؑ

کی متعلق کئی ایک اور روایات بھی موجود ہیں جو ہرگز ہرگز خدا

کے ایک رسول کے شایان شان نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے حضرت اسمعیلؑ کو صحرائے فاران (مکہ) میں

بسا دینے کا واقعہ درج کیا جا چکا ہے جس سے یہ واضح ہے کہ کس طرح حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ

کی مشیت کے پروگرام کے ماتحت حضرت اسمعیلؑ کو اپنے وطن (فلسطین) سے دور حجاز کے علاقے میں

آن بسایا تھا کہ یہ بنجر سرزمین جو بیرونی حملہ آوروں کی تاخت و تاراج سے مامون اور اس لئے حضرت

کی زہر آلود تہذیب و تمدن سے محفوظ رہنے والی تھی، نبی اسرائیلؑ کی تباہی اور ویرانی کے بعد امانتِ ابراہیمی

کی حامل ہو سکے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اس وقت حضرت اسماعیلؑ سن رشد کو پہنچ

چکے تھے۔ ان کی عمر کم از کم ۱۳-۱۴ سال کی تھی جو ایک بیابان کی کھلی ہوا میں پرورش یافتہ بچے کے لئے

طفولیت کا زمانہ نہیں، جوانی کی عمر ہوتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ تورات

اس واقعہ کی وجہ یہ بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ سب کچھ حضرت سارہؑ کے کہنے پر کیا جو رشک و

حسد کی بنا پر چاہتی تھیں کہ حضرت ہاجرہؓ اور ان کے ”شیر خوار“ بچے کو ”دیس نکالا“ دے دیا جائے۔ اس
توجیہ سے اس عظیم واقعہ کی جو حقیقت رہ جاتی ہے اور حضرت ابراہیمؑ کا جو کیر کٹر (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ)
سامنے آتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ لیکن دیکھئے کہ خود ہمارے ہاں کی کتب روایات میں کیا کچھ موجود ہے۔
بخاری شریف کتاب الانبیاء میں موجود ہے۔

قال ابن عباس اول ما اتخذ النساء المنطق من قبل ام
اسماعيل اتخذت منطلقا لتعني اثرها على سارة ثم جاء بها ابراهيم
وبأبها اسمعيل وهي ترضعه حتى وضعها عند البيت عند درجته
فوق زمزم في اعلى المسجد وليس بمكة يومئذ احد وليس
بها ماء فوضعها هنالك ووضع عندها جرابا فيه تمر وستاء
فيه ماء ثم قفى ابراهيم منطلقا فتبعته ام اسمعيل فقالت يا
ابراهيم اين تذهب وتتركنا بهذا الوادي الذي ليس فيه انس
ولا شئ فقالت له ذلك مرارا وجعل لا يلتفت اليها فقالت له الله
الذي امرك بهذا قال نعم قالت اذا لا يضيعنا۔

(کتاب الانبیاء، صحیح بخاری، جلد دوم، صفحہ ۱۲۶)

ابن عباس کہتے ہیں کہ اول اول جس عورت نے گھاگرہ پہنا وہ والدہ اسمعیل ہیں انہوں
نے گھاگرہ اس لئے پہنا کہ ان کے نشان پا کا سارہ کو پتہ نہ لگے۔ پھر ابراہیم علیہ السلام انہیں
اور ان کے بیٹے اسمعیل کو لے نکلے اور وہ اس کو دودھ پلاتی تھیں۔ حتیٰ کہ ان دونوں (ماں بیٹے)
کو خانہ کعبہ کے نزدیک ایک ایک بڑے درخت کے پاس زمزم (کی جگہ) کے بالائی طرف
کے اوپر کی جانب چھوڑ گئے۔ اور اس وقت مقام مکہ میں کوئی شخص نہ تھا اور نہ ہی وہاں پانی تھا۔
پس وہ وہاں ان دونوں کو چھوڑ گئے اور ان کو ایک ایک تھیلی کھجوروں اور ایک مشک
پانی کی دے گئے۔ پھر ابراہیم پیچھے کو چل پڑے اور والدہ اسمعیل ان کے پیچھے پیچھے چلیں اور
کہنے لگیں کہ اے ابراہیم! آپ ہم کو اس وادی میں چھوڑ کر کہاں جاتے ہیں جس میں نہ کوئی غنما
انسان ہے اور نہ کوئی چیز۔ اس نے بار بار ان کو یہ کہا، لیکن وہ کچھ التفات نہ کرتے تھے آخر کار

انہوں نے کہا کہ کیا وہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا ہاں، اس پر انہوں نے کہا تو اللہ ہم کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ تورات میں مذکور ہے کہ (معاذ اللہ) حضرت ہاجرہ حضرت سارہ کے سلوک سے تنگ آ کر ایک مرتبہ گھر سے نکل گئی تھیں۔ مندرجہ بالا روایت میں نقوش پامٹانے کے لئے گھاگرہ پہننے سے غالباً اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد بخاری کی روایت میں مزید تفصیل درج ہے کہ حضرت اسمعیلؑ کس طرح پیاس سے بے چین ہوئے اور آپ کی والدہ پانی کی تلاش میں کس طرح پریشان و سرگرداں وادی کے اندر اور پہاڑیوں کے اوپر چڑھتی اُترتی رہیں (یعنی قریب قریب وہی واقعہ جو تورات میں مندرج ہے) حضرت ابراہیمؑ نے ایسا کیوں کیا تھا اس کی وجہ بخاری کی محلہ صدر روایت کی تشریح (فتح الباری) میں یوں لکھی ہے۔

وكان السبب في ذلك ان سارة كانت وهبت هاجرة لابراهيم
فحملت منه باسمعيل فلما ولدته غارت منها فحلفت لتقطعن
منها ثلاثة اعضاء فاتخذت هاجر منطقة فشدت بها وسطها و
هربت وحرت فيها لتخفي اثرها على سارة ويقال ان ابراهيم شفا
فيها وقال لسارة حللي بينك بان تنقبي اذيتها وتحققها ويقال
ان سارة اشتدت بها الفيرة فخرج ابراهيم باسمعيل و أمه الى
مكة لذلك.

اور اس کا سبب یہ تھا کہ سارہ نے ہاجرہ ابراہیمؑ کو بخش دی تھی اور اس کو اس سے اسمعیلؑ کا حمل ہو گیا پھر جب وہ بیٹا جنی تو (سارہ کو) اس کا بہت رشک و حسد آیا اور اس نے قسم کھائی کہ میں ضرور اس کے تین اعضا کاٹ ڈالوں گی (ناک اور دو کان)۔ پس ہاجرہ نے ایک گھاگرہ لیا اور کس کر اس کو اپنی کمر میں باندھ لیا اور بھاگ نکلی اور اس کا دامن گھسیٹی گئی تاکہ اس کے آثار پا کا سارہ کو پتہ نہ لگے اور کہتے ہیں کہ ابراہیمؑ نے اس بارے میں اس سے سفارش کی اور سارہ کو کہا کہ تو اپنی قسم کو اس طرح پورا کر کہ اس کے ناک کان چیر دے۔ کہا جاتا ہے کہ سارہ کو اس کے ساتھ نہایت ہی سخت رشک ہوا پس اسی وجہ سے ابراہیمؑ

اور اس کی ماں کو منگو کی طرف لے نکلے۔

بخاری کی روایت میں یہ بھی ہے کہ فلما ادا س ك ذوجوه الخ یعنی جب حضرت اسمعیلؑ نے شادی کر لی اور ان کی والدہ فوت ہو گئیں تو ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کے ہاں گئے لیکن حضرت اسمعیلؑ انہیں گھر پر نہ ملے تو آپ ان کی بیوی سے کچھ بات چیت کر کے واپس تشریف لے گئے اس کی شرح میں فتح الباری میں لکھا ہے کہ:-

وكان في حديث عطاء ابن السائب نحوه فقالت انزل رحمة الله
فاطعم واشرب قال اني لا استطيع النزول قالت فاني اراك اشعت افلا
اغسل راسك وادهنك قال بلى ان شئت فجانته بالمقام وهو يومئذ
ابيض مثل لهأة وكان في بيت اسمعيل ملقى فوضع قدمه اليمنى و قدم
اليها شق راسه وهو على دابة فغلبت شق راسه الايمن فلما فرغ
حولت له المقام حتى وضع قدمه اليسرى و قدم اليها براسه فغسلت
شق راسه الايسر فالاشرا الذي في المقام من ذلك ظاهر فيه موضع
العقب والا صبح عن ابن عباس ان سارة داخلها غيره فقال لها
ابرهيم لا انزل حتى ارجع اليك ونحوه في رواية عطاء ابن السائب-

اور عطاء بن سائب کی حدیث میں ایسا ذکر ہے کہ اس (اسمعیل علیہ السلام کی بیوی) نے
(ابراہیم علیہ السلام سے) کہا اللہ آپ پر رحمت کرے اترتیے، کچھ کھاپی لیجئے۔ انہوں نے
جواب دیا کہ میں اتر نہیں سکتا۔ اُس نے جواب دیا کہ آپ کے بال بہت اُلجھے ہوئے ہیں کیا
میں آپ کا سر دھو کر تیل نہ لگا دوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اچھا تیری مرضی۔ پس وہ ایک پتھر
لے آئی اور اُس دن وہ بالکل سفید تھا اور اسمعیل علیہ السلام کے گھر میں پڑا ہوا تھا۔ پس آپ نے
اپنا دایاں قدم اس پر رکھا اور اپنے سر کا ایک جانب اس کی طرف جھکا دیا اور آپ سواری پر ہی
رہے۔ اس نے آپ کے سر کا دایاں طرف دھو دیا۔ پھر جب وہ فارغ ہوئے تو وہ پتھر اٹھا کر
دوسری طرف لے گئی اور آپ نے اپنا بائیں قدم اُس پر رکھا اور اپنا سر اُس کی طرف جھکا دیا۔
پس اُس نے بائیں جانب ان کے سر کا دھو دیا اور اس پتھر میں ایڑی اور انگلیوں کا جو نشان

موجود ہے وہ اسی وجہ سے ہے..... ابن عباس سے روایت ہے کہ سارا پر رشک و حسد نے بہت غلبہ کیا تو ابراہیم نے کہا میں سواری سے نہیں اتروں گا جب تک تیرے پاس واپس آجاؤں۔ عطا بن سائب کی روایت میں بھی ایسا ہی آیا ہے۔

فتح الباری میں (سعید بن جبیر کی روایت سے) یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنی بیوی حضرت سارہ سے حلیہ وعدہ کیا تھا کہ وہ جب تک ان (حضرت سارہ) کے پاس واپس لوٹ نہیں آئیں گے سواری سے نہیں اتریں گے۔ اسی لئے سواری پر بیٹھے بیٹھے سر دھلانا پڑا۔ یہ چیزیں کسی تبصرے کی محتاج نہیں۔

حضرت ابراہیم پر بہتانِ کذب | لیکن ابھی ایک بات اور باقی ہے جسے بصد تامل و توقف کرائم کی طرف اس قسم کی چیزوں کی نسبت کس طرح گوارا کی جائے؟ تو رات میں ہے:-

اور اس ملک میں کال پڑا اور ابرام (ابراہیم) مصر میں گیا کہ وہاں ٹھہرے۔ کیونکہ ملک میں بڑا کال پڑا تھا ۵ اور جب مصر کے نزدیک پہنچا تو اس نے اپنی جوڑو ساری کو کہا کہ دیکھ میں جانتا ہوں کہ تو دیکھنے میں خوبصورت عورت ہے ۵ اور یوں ہو گا کہ مصری تجھے دیکھ کر کہیں گے کہ یہ اس کی جوڑو ہے۔ سو مجھ کو مار ڈالیں گے اور تجھے جیتی رکھیں گے۔ تو کیونکہ میں اس کی بہن ہوں تاکہ تیرے سبب سے میری خیر ہو اور میری جان تیرے وسیلے سے سلامت رہے۔

سو جب ابرام (ابراہیم علیہ السلام) مصر میں پہنچا۔ مصریوں نے اس عورت کو دیکھا کہ وہ نہایت خوبصورت ہے ۵ اور فرعون کے امیروں نے بھی اسے دیکھا اور فرعون کے صحنوں میں اس کی تعریف کی اور اس عورت کو فرعون کے گھر میں لے گئے ۵ اور اس نے اس کے سبب ابرام پر احسان کیا کہ اس کو بھیڑ بکری اور گائے بیل اور گدھے اور غلام اور لونڈی اور گدھیاں اور اونٹ ملے ۵ پر خداوند نے فرعون اور اس کے خاندان کو ابرام کی جوڑو ساری کے سبب بڑی ملامت ۵ تب فرعون نے ابراہیم کو بلا کر اسے کہا کہ تو نے مجھ سے یہ کیا کیا؟ کیوں نہ جتنا یا کہ میری جوڑو ہے؟ تو نے کیوں کہا کہ وہ میری بہن ہے؟ یہاں تک کہ میں نے اسے اپنی جوڑو بنانے کو لیا۔ دیکھ یہ تیری جوڑو حاضر ہے اس کو لے اور چلا جا اور فرعون نے

اس کے حق میں لوگوں کو حکم کیا تب انہوں نے اسے اور اس کی جود کو اور جو کچھ اس کا حقار و انکی

(پیدائش ۱۰-۱۲/۲۰)

یہاں حضرت ابراہیمؑ کی طرف (خاکم بدین، توبہ توبہ) دروغ گوئی منسوب کی گئی ہے۔ تورات کے متبعین اسے جس طرح جی چاہے گوارا کریں، لیکن قرآن کریم پر ایمان رکھنے والے اسے سُننا بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ ذرا غور فرمائیے۔ دین کی بنیاد رسول کی صداقت کے ایمان پر ہے۔ ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ وہ اللہ کا کلام ہے جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ آپ نہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دریافت کر سکتے ہیں کہ یہ واقعی تیرا کلام ہے، نہ جبریل امین سے اس امر کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ یہ پیغام واقعی خدا کا فرستادہ ہے۔ اس دعوے کی صداقت کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ آپ کا یہ ایمان ہو کہ مدعی کبھی جھوٹ نہیں بولتا، ہمیشہ سچ کہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص براہ راست اس پیغام کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہو سکتا اور یوں اس کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان لے آتے۔ لیکن اس صورت میں بھی یہ درحقیقت رسول کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے۔ بلکہ وہ رسول کے اس دعوے کی تصدیق علیٰ وجہ البصیرت کرتا ہے۔ لہذا حقیقت یہی ہے کہ دین کی بنیاد رسول کی سچائی کے ایمان پر ہے اس لئے رسول کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ سچائی کا محض اور صداقت کا پیکر ہوتا ہے۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ کذب کا شائبہ تک اس کے پاس پھٹک نہیں سکتا۔ اس کا قول، فعل، ارادہ، تدبیر، ہر عمل اور ہر حرکت سچائی کی نظیر اور صداقت کا جیتا جاگتا نمونہ ہوتی ہے۔ اگر کبھی یہ تصور کر لیا جائے کہ رسول بھی (معاذ اللہ) جھوٹ بول سکتا ہے تو دین کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے اس لئے کہ اس کے ایک جھوٹ سے اس کے پیغام کی صداقت میں شبہ کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے اور جہاں پیغام خداوندی کی صداقت میں شک پیدا ہو جائے وہاں دین کا استحکام ناممکن ہے۔ تورات کی مندرجہ صدر روایت میں حضرت ابراہیمؑ کی طرف (معاذ اللہ) ایک جھوٹ منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن بخاری کی ایک حدیث میں آپ کی طرف (معاذ اللہ، معاذ اللہ) تین جھوٹ منسوب کئے گئے ہیں۔ روایت یوں شروع ہوتی ہے:-

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال لمریکن ب ابراہیم علیہ السلام
الا ثلاث کن بات ثنتین منہن فی ذات اللہ عزوجل قولہ انی

سقیم و قوله بل فعلہ کبیر ہم ہذا و قال بینا ہوذات یوم و سارۃ
اذ آتی علی جبار من الجبابرة فقیل لہ ان ہمنا رجلا معہ امرأۃ من احسن
الناس فأرسل الیہ فسألہ عنہا فقال من ہذا قال أختی۔

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ (رسول اللہ نے فرمایا) حضرت ابراہیم نے صرف تین جھوٹ بولے
تھے جن میں سے دو تو حق تعالیٰ عزوجل کی ذات کے بارہ میں تھے۔ (۱) ان کا یہ کہنا کہ میں بیمار ہوں
(۲) ان کا یہ کہنا کہ نہیں بلکہ یہ ان کے بڑے بُرت نے کیا ہو گا اور آپ نے فرمایا کہ ایک بار حضرت
ابراہیم ایک جابر بادشاہ کے (ملک کی طرف گزر رہے تھے اور حضرت سارہ ہمراہ تھیں اس بادشاہ
سے لوگوں نے کہا کہ اس شخص کے ساتھ ایک حسین ترین عورت ہے۔ اس نے آپ کو بلایا اور حضرت
سارہ کے متعلق پوچھا آپ نے فرمایا کہ وہ میری بہن ہے۔۔۔۔ الخ

ان میں سے پہلے دو واقعات (یعنی ستاروں کے متعلق بات چیت اور بُرت شکنی کے واقعہ کے بعد قوم
سے مکالمہ، قرآن کریم نے بیان کئے ہیں اور ان کا تفصیلی ذکر سابقہ صفحات میں گزر چکا ہے)۔ کیا
ان میں کسی قسم کے جھوٹ کا کوئی شائبہ بھی ہے؟ اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ تیسرا واقعہ تورات سے مستعار
لے لیا گیا ہے۔ قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ اس طرح تین جھوٹ خدا کے ایک برگزیدہ رسول کی طرف
منسوب کر دیئے گئے ہیں اور رسول اللہ کو (معاذ اللہ) ان کذبات کی تصدیق کرنے والا بتایا گیا ہے۔ کیا آپ
ایک ثانیہ کے لئے بھی تصور کر سکتے ہیں کہ یہ حدیث سچ مچ رسول اللہ کی ہو سکتی ہے؟ لیکن ذرا ان حضرات
سے پوچھئے جو ان روایات کو دین سمجھتے ہیں۔ وہ ان کی صحت میں شبہ کرنے والے کو "منکر حدیث" قرار دے کر
دائرہ اسلام سے خارج کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں!

لے راقم الحروف نے ایک مرتبہ اپنے ایک مضمون میں اس قسم کی روایات کے متعلق لکھا کہ بجائے اس کے کہ ہم اس بات
پر مضحکوں کہ یہ سب حدیثیں رسول اللہ کی ہیں؛ چاہیے یہ کہ ہم اپنے مجموعہ روایات کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھ لیں اور
جو چیزیں معاندین نے قرآن حکیم کے خلاف ان مجموعوں میں داخل کر دی ہیں انہیں الگ کر دیں۔ اس پر (جیسا کہ ظاہر ہے)
مخالفت کا ایک طوفان برپا کر دیا گیا۔ فتاویٰ شائع کئے گئے کہ یہ شخص "بے دین و ملحد ہے"۔۔۔ کہ "اعادیرش مقدمہ کو صحیح
نہیں مانتا۔ ایک محدث صاحب نے جوشِ رواۃ پرستی میں یہاں تک لکھ دیا کہ "معرض کو حضرت ابراہیم کے تین
(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اس اسلامی لٹریچر میں معاندین اسلام نے چپکے ہی چپکے اتنا کچھ ملا دیا ہے کہ اسلام جیسا دینِ خالص اس قسم کی افسوسناک شکل اختیار کر گیا ہے اور اس سے کہیں زیادہ تاسف انگیز یہ حقیقت ہے کہ ہزار برس سے یہ سب کچھ ہماری کتابوں میں متواتر چلا آ رہا ہے اور کسی میں اتنی جرات نہیں کہ اسلام کے دامن کو ان بد نما دھتوں سے پاک کر دے۔ اس لئے کہ ان چیزوں کے ساتھ اسلافِ کبریٰ کی عقیدت اس قدر گہرے طور پر وابستہ ہو چکی ہے کہ ان کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنا جہرمِ عظیم قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ بات بالکل واضح ہے۔ ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے۔ وہ جھوٹ اور سچ اور حق و باطل میں تفریق کرنے والی ہے۔ ان کتب و روایات کو قرآنی کسوٹی پر کس کر دیکھ لو۔ جو قرآن کے خلاف جائے اسے غلط سمجھو۔ لیکن ایسا کہنے والے کو "منکر حدیث" کہہ کر نکتہ بنا دیا جاتا ہے۔ اسی حدیثِ زیرِ نظر کو لیجئے۔ کیا قرآنی معیار کے مطابق اسے ایک ثانیہ کے لئے بھی صحیح تصور کیا جاسکتا ہے؟ لیکن چونکہ یہ بخاری شریف کی حدیث ہے اور اسنادِ روایات کے متعلق جو معیار ان حضرات نے مقرر کر رکھے ہیں ان کے مطابق صحیح قرار پائے گی ہے، اس لئے اسے کبھی غلط نہیں کہا جاسکتا خواہ یہ قرآن سے علانیہ بغاوت کیوں نہ کر رہی ہو۔ اس کی مدافعت میں ایک اور حدیث بیان کر دی جاتی ہے کہ مَا فِيهَا كَذِبٌ اَلَا مَا حَلَّ بِهَا عَن دِينِ اللّٰهِ (یعنی

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) جھوٹوں پر تعجب آ رہا ہے جو احادیث میں مذکور ہیں حالانکہ قرآن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پانچ جھوٹ ثابت ہیں: (۱) استغفر اللہ ربی! (۲) ان پانچ جھوٹوں کی تفصیل محدث صاحب کے نزدیک یہ تھی: (۱) بُت شکنی کا واقعہ۔ (۲) انبیٰ سفیر کا واقعہ اور (۳-۴-۵) تین مرتبہ ستارہ چاند اور سورج کو خدا کہنے کا واقعہ۔

ناطقہ سرنگریاں کہ اسے کیا کہئے

ان حضرات کے نزدیک دین یہ ہے کہ امام بخاری یا ان کے راویوں پر کوئی اعتراض نہ پڑ جائے، خواہ ان کی مدافعت میں خدا اور اس کا رسول بھی (حاکم بدین) پیٹ میں کیوں نہ آجائیں۔ ان حضرات کا مذہب یہ ہے کہ جامعینِ احادیث اور رواۃ حضرات منزه عن الخطا اور معصوم ثابت کر دیئے جائیں خواہ ایسا کرنے میں (معاذ اللہ) خدا جھوٹ کا بیان کرنے والا، نبی اکرم جھوٹ کی شہادت دینے والے اور حضرت ابراہیمؑ جھوٹ بولنے والے کیوں نہ قرار پائیں۔ اور جو شخص حضرت انبیائے کرامؑ کے احترام اور ان کی عظمتِ سیرت کے پیش نظر ان کے مسلک سے اختلاف کی جرات کرے تو اسے کافر و ذلیل قرار دیا جائے۔

رسول اللہ نے فرمایا "ابراہیم کے ان تینوں جھوٹوں میں سے ہر ایک اللہ کے دین کی مدافعت و حمایت ہی کے لئے بولا گیا ہے" دیکھا آپ نے! ایک غلطی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کس قدر اور غلطیاں کرنی پڑتی ہیں۔ پہلے ایک غلط بات نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر دی گئی کہ حضرت ابراہیمؑ نے جھوٹ بولا تھا۔ اس کے بعد جب دیکھا کہ اس سے اپنے آپ پر زور پڑتی ہے تو ایک اور روایت حضورؐ کی طرف منسوب کر دی گئی کہ دین کی بھلائی کے لئے اس قسم کا جھوٹ بول دینا کوئی بُری بات نہیں۔ لیکن خود بخاری میں یہ حدیث بھی موجود ہے،

میدانِ حشر میں سب مخلوقِ آدم، نوح علیہما السلام اور دوسرے انبیاء سے شفاعت کے لئے کہہ چکی تو حضرت ابراہیمؑ کے پاس پہنچی اور ان سے کہا کہ آپ خلیل اللہ ہیں آپ ہماری سفارش بارگاہِ الہی میں کیجئے کہ جلد فیصلہ ہو تو انہوں نے کہا کہ مجھ کو شرم آتی ہے۔ اس لئے کہ میں نے تین جھوٹ باتیں کہی تھیں۔ (بخاری تفسیر سورۃ بقرہ)

اگر یہ جھوٹ دین کی بھلائی کے لئے بولے گئے تھے اور یہ کوئی معیوب بات نہیں تھی تو پھر اس پر ایسی ندامت کیوں جس سے قیامت میں نگاہیں جھکی رہیں!! اور یہ کذب کس کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے؟ ان حضرت ابراہیمؑ کی طرف جن کے متعلق خود خدا کی گواہی موجود ہے کہ اِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا (۱۹/۴۱)۔ کہ وہ مجسم سچائی تھا اور اللہ کا نبی۔ "صدیق" بہت زیادہ سچ بولنے والا، بالکل سچا۔ قرآن یہ کہتا ہے اور بخاری کی احادیث آپ (حضرت ابراہیمؑ) کو ایسا جھوٹا بتا رہی ہیں کہ جس کی وجہ سے آپ قیامت کے دن خدا کے حضور جانے کی جرأت نہ کر سکیں (پناہ بخدا۔ پناہ بخدا) اور اس پر بخاری شریف کی یہ حدیثیں بالکل "سچی" اور ان سے انکار کرنے والا ٹھوہلے دین! ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بولا لہجہی است

لیکن زمانہ اب رفتہ رفتہ خود قرآن کریم کی طرف آرہا ہے۔ جس طرح قرآن کریم نے سابقہ کتبِ سماوی کے ان حصوں کو صاف کر دیا جن میں حضراتِ انبیاء کرامؑ اور ان کی آسمانی تعلیم کے متعلق ذہنِ انسانی نے تصرفات کر رکھے تھے اسی طرح وہ تمام باتیں بھی جو عجیبی تصورات اور معاندین اسلام کی تزویر و تلبیس کی بنا پر اسلامی لٹریچر میں حلول کر چکی ہیں قرآن کریم کی روشنی میں صاف صاف نظر آجائیں گی ادویوں حتی و باطل میں کھلی کھلی تفریق ہو جائے گی کہ قرآن کریم نے اپنے آپ کو حتی و باطل میں تمیز کرنے والا (الْفَرِّقَان) بتایا ہے۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس کی زندہ کتاب ہمارے پاس اس کی اصلی شکل میں محفوظ و مصون چلی آرہی ہے اور

قیامت تک کے لئے اسی طرح چلی جائے گی۔ اس پیغام خداوندی میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے کہ وہ باطل کو نکھار کر الگ کر دے۔ اربابِ فکر و نظر کے لئے کرنے کا کام فقط اتنا ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ کو قرآنِ کریم کی طرف ملتفت کرائیں۔ جب حق آجاتا ہے تو باطل از خود فنا ہو جاتا ہے جیسے چراغ آجانے سے اندھیرا کافور ہو جاتا ہے۔ "إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا" (۱۷۸/۱) اندھیر کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ روشنی سے فنا ہو جاتے۔ بلکہ یوں کہیے کہ اندھیر اپنا وجود رکھتا ہی نہیں۔ روشنی کی عدم موجودگی کا نام تاریکی ہے۔ اس لئے جب روشنی آجائے تو تاریکی باقی ہی کہاں رہ سکتی ہے۔ تم تک بجاتاب اللہ کے بعد تبلیغِ حق و باطل کا کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ ۷

زمانہ کہنہ بیتاں را ہزار بار آراست

من از حرم نگذشتم کہ پختہ بنیاد است

بہر حال، یہ تھا تذکرہ جلیلہ جناب خلیلِ اکبر حضرت ابراہیمؑ کا جو ملتِ حنیفہ کے مورثِ اعلیٰ اور

مسلکِ توحید کے عظیم الشان مبلغ تھے۔



حَضْرَت

اِسْمَاعِيلُ - اِسْحٰقُ - اِبْرٰهِيْمُ

عَلَيْهِمُ السَّلَامُ

حضرت ابراہیمؑ کے فرزند اکبر حضرت اسمعیلؑ، فرزند اصغر حضرت اسحاقؑ اور ان کے بیٹے حضرت یعقوبؑ (علیہم السلام) کا ضمنی تذکرہ خود حضرت ابراہیمؑ کے تذکارِ جلیلہ کے ساتھ آچکا ہے۔ ان حضرات کا اس سے زیادہ تفصیلی ذکر قرآن کریم میں نہیں۔ قرآن کریم ان سب کو اللہ کے برگزیدہ نبی قرار دیتا ہے۔ وہ کتاب ہے:

وَ اذْکُرْ عِبْرٰتَنَا اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ اُولٰٓئِیْنِ
وَ الْاَبْصَارِ ۝ وَ اذْکُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ ذَا الْكِفْلِ ۝ وَ
کُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ۝

(۲۵۱ - ۲۸/۲۸)

اور (اے پیغمبرِ اسلام!) ہمارے (نیک بندوں) ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کا ذکر کرو جو ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے (یعنی قوت اور توانائی کے مالک اور حقائق پر نظر رکھنے والے تھے۔ وہ ہر معاملہ میں مستقبل کی زندگی کو پیش نظر رکھتے تھے اور اسی بنا پر ہم نے انہیں ایک مخصوص جہات کے افراد بنا دیا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ ہمارے حضور میں برگزیدہ اور سب سے اچھے لوگوں میں سے تھے۔ اور (ساتھ ہی) اسمعیل، یسع اور ذاکفل کو یاد کرو۔ ان میں سے بھی ہر ایک بہت اچھے لوگوں میں سے تھا۔

ان پر جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا اس پر ایمان لانا ہمارے لئے ضروری ہے (اس لئے کہ یہ سب اللہ کے رسول تھے)۔

قَوْلًا اٰمَنًا بِاللّٰهِ وَ مَا اُنزِلَ اِلَيْنَا وَ مَا اُنزِلَ اِلٰی اِبْرٰهِيْمَ

وَ اسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبٰطَ وَ مَا اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عَلِیْیَ
وَ مَا اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ لَوْ نَفَرْتُمْ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ لَظَنَ
وَ عَنُّ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (۲/۱۳۶) نیز (۳/۸۳)

اسے پیرانِ دعوتِ قرآنی! تم کہو، ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو ہم پر نازل ہوا ہے اور ان تمام تعلیموں پر ایمان لائے ہیں جو ابراہیم کو اسمعیل کو اسحق کو یعقوب اور اولادِ یعقوب کو دی گئی تھیں۔ نیز ان کتابوں پر جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دی گئی تھیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان تمام تعلیموں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو دنیا کے تمام نبیوں کو ان کے پروردگار سے ملی ہیں۔ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کرتے۔ ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔

یہ بھی ارشاد فرمایا کہ یہ حضرات یہود و نصاریٰ کی گروہ بندیوں کے بانی نہ تھے بلکہ صرف مسلم تھے اور اسلام ہی کی تعلیم دیتے تھے۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبٰطَ
کَاُوْلَا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ؕ اَنْتُمْ اَعْلَمُوْا اَمْرِ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ
اَظْلَمُ مِمَّنْ کَتَمَ شَہَادٰتَہٗ عِنْدَکَ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۲/۱۳۰)

یا پھر تمہارا (یعنی یہود و نصاریٰ کا) دعویٰ یہ ہے کہ ابراہیم، اسمعیل، اسحق، یعقوب اور اولادِ یعقوب بھی یہودی اور نصرائی تھے؟ (اگر تم جہل و نادانی کی ایسی بات کہہ سکتے ہو تو افسوس تمہاری عقلوں پر) اسے پیغمبر! ان سے کہو تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ ہے؟ پھر بتلاؤ اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جس کے پاس اللہ کی ایک شہادت موجود ہو اور وہ اسے چھپائے (اور محض اپنی بات کی بیچ کے لئے سچائی کا اعلان نہ کرے؟) یاد رکھو جو کچھ بھی تم کہہ رہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم نے یہی حکم اپنی اولاد کو دیا اور اس کا اعادہ حضرت یعقوب نے فرمایا۔

وَ وَضٰی بِہَا اِبْرٰهٖمُ بَیْنَہٗ وَ یَعْقُوْبَ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ الْہٰکَ
وَ اِلٰہَ اٰبَاہِکَ اِبْرٰهٖمَ وَ اسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ الْہٰکَ وَ اِحٰدًا جَمِیْعًا

تَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۵ (۱۳۲-۱۳۳/۲)

پھر اسی طریقہ کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور (اس کے پوتے) یعقوب نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا "اے میرے بیٹو! خدا نے تمہارے لئے اس دین حقیقی کی راہ پسند فرمائی ہے تو دیکھو دنیا سے نہ جانا مگر اس حالت میں کہ تم مسلم ہو (یعنی فرمانبردار ہو)۔ پھر کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کے سرہانے موت آکھڑی ہوئی تھی اور اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے پوچھا تھا "میرے بعد تم کس کی محکومیت اختیار کرو گے؟" اور انہوں نے جواب دیا "اسی خدائے واحد کی جس کی تو نے محکومیت اختیار کی ہے اور تیرے بزرگوں ابراہیم، اسمعیل اور اسحق نے کی ہے اور ہم اس کے حکموں کے فرماں بردار ہیں!"

حضرت اسمعیلؑ کے متعلق فرمایا کہ

وَ اذْکُرْ فِی الْکِتَابِ اِسْمٰعِیْلَ اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ کَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا ۝ (۱۹/۵۴)

اور (اے پیغمبر! کتاب میں یعنی قرآن میں) اسمعیل کا ذکر کر۔ بلاشبہ وہ اپنے قول کا سچا تھا اور (اللہ کا) فرستادہ نبی تھا۔

اِسْمٰعِیْل اسمعیل عبرانی لفظ "شماع" (سماع، سننا) اور ایل (اللہ) سے مرکب ہے۔ چونکہ آپ کی پیدائش حضرت ابراہیم کی دعاؤں کا نتیجہ تھی اس لئے آپ کا نام "خدا کا سننا" (اسمعیل) رکھا گیا۔ حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل (مرد خدا) تھا۔

چونکہ یہود اور نصاریٰ دونوں کو چڑھا ہے کہ جس شاخ اقدس کے گل سرسبد حضورِ نعتی مرتبت حضرت محمد رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ہیں اُسے (غاکم بدہن) کسی خیر و برکت کا حامل نہ قرار دیا جاسکے اس لئے ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ حضرت اسمعیلؑ کو حضرت اسحقؑ کے مقابلہ میں بہت گھٹا کر پیش کریں۔ چنانچہ اس ضمن میں ان کی یہ کوشش بھی شامل ہے کہ حضرت اسمعیلؑ کے بجائے حضرت اسحقؑ کو ذبح اللہ قرار دیا جائے۔ ایک مسلمان کے ذہن میں اس قسم کی تحقیر و تنکیر (بلکہ ایسے تقابل) کا تصور بھی نہیں آسکتا۔ اس لئے کہ ہمارا ایمان ہے کہ یہ دونوں حضرات اللہ کے برگزیدہ رسول تھے اور اَوْ نَفْسِیۡۤ بَیۡنَ اَیۡدِیۡنَا مِّنۡ دُوۡنِہُمَا (۲۸۵) ہم اللہ کے رسولوں میں کسی میں تفریق نہیں کرتے، لیکن واقعات سے

انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان حضرات کی ضد نے یہاں تک جرات پیدا کر دی کہ انہوں نے توریت میں تحریف
 کھر کے ذبیحہ اللہ کے لئے حضرت اسحقؑ کا نام تک بھی لکھ دیا **ذبیحہ اللہ کون ہے؟** لیکن نام بدلتے وقت یہ یاد نہ رہا کہ اس کے تضمنات میں بھی اسی
 نسبت سے تبدیلی کرنی چاہیے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ جس باب میں یہ واقعہ درج ہے اس میں ایک ایسی
 چیز باقی رہ گئی جس سے ان کی تحریف بالکل بے نقاب ہو گئی۔ کتاب پیدائش کے بائیسویں باب میں یہ
 واقعہ درج ہے اور اس کی دوسری آیت میں یہ فقرہ ابھی تک موجود ہے:-

تب اس نے کہا کہ تو اپنے بیٹے، ہاں اپنے اکلوتے بیٹے کو جسے تو پیارا کرتا ہے، اسحق کو لے۔ (۲۲/۲)
 یہاں یہ بالکل واضح ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جس بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے لے گئے تھے وہ اکلوتا
 (THE ONLY SON) تھا اور خود تورات کا بیان ہے کہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش حضرت اسمعیلؑ کے
 پیدا ہونے کے تیرہ چودہ برس بعد ہوئی۔ اس لئے یہ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب حضرت ابراہیمؑ
 کے ہاں صرف ایک ہی بیٹا تھا، یعنی یہ واقعہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش سے پہلے کا ہے اور اس وقت صرف
 حضرت اسمعیلؑ موجود تھے۔ لہذا ظاہر ہے کہ کتاب پیدائش کے بائیسویں باب کی دوسری آیت میں حضرت اسحاقؑ
 کا نام بعد کا اضافہ ہے اور اس تحریف کا نتیجہ جو اس کتاب میں کھلے بندوں کی گئی ہے۔

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے سے پوچھا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے
 کہ میں تمہیں خدا کی راہ میں قربان کر رہا ہوں۔ کہو! تمہارا کیا خیال ہے؟ اس پر بیٹے نے عرض کیا کہ ابا جان! جو
 کچھ آپ کو اشارہ ملا ہے، بلا تامل اس کی تعمیل کیجئے۔ آپ انشاء اللہ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔ اس سے ظاہر
 ہے کہ بیٹا خود ذبح ہونے کے لئے تیار تھا اور اللہ کی راہ میں اپنی جان کی قربانی بطیب خاطر کر رہا تھا۔ لیکن
 تورات میں ہے:-

تب اسحاق نے اپنے باپ ابراہام سے کہا کہ اے میرے باپ! اس نے خواب دیا کہ اے میرے
 بیٹے! میں حاضر ہوں۔ اُس نے کہا دیکھ آگ اور بکڑیاں تو ہیں پر سوختنی قربانی کے لئے ترہ کہاں
 ابراہام نے کہا کہ اے میرے بیٹے! خدا آپ ہی اپنے واسطے سوختنی قربانی کے لئے ترہ کی تدبیر
 کرے گا۔ سو وہ دونوں ساتھ ساتھ چلے ۵ اور وہ اس مقام پر جس کی بابت خدا نے اس سے کہا
 تھا پہنچے۔ تب ابراہام نے وہاں ایک قربان گاہ بنائی اور بکڑیاں چنیں اور اپنے بیٹے اسحاق کو

باندھا اور اسے قربان گاہ میں لکڑیوں کے ادھر دھردیا۔ (پیدائش ۷-۲۲/۹)

یعنی ذبح ہونے والے بیٹے کو علم تک نہ تھا کہ قربانی کس کی دی جائے گی پھر جائے کہ وہ اپنی خوشی سے ذبح ہونے کے لئے آیا ہو اور اس کے پوچھنے پر آپ نے بھی نہیں بتایا کہ کون ذبح ہوگا۔ اس کے بعد تورات میں مذکور ہے کہ:-

پھر اس نے کہا کہ تو اپنا ہاتھ لڑکے پر مت بڑھا اور اسے کچھ مت کر کہ اب میں نے جانا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے اس لئے کہ تو اپنے بیٹے، ہاں اپنے اکلوتے کو مجھ سے دریغ نہ کیا۔ تب ابراہام نے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے تھے۔ تب ابراہام نے جا کر اس مینڈھے کو لیا اور اس کو اپنے بیٹے کے بدلے میں سوختی قربانی کے طور پر چڑھایا اور ابراہام نے اس مقام کا نام یہوواہ یری رکھا۔ چنانچہ یہ آج تک کہا جاتا ہے کہ خداوند کے پہاڑ پر ہبیا کیا جائے۔ (پیدائش ۱۲-۲۲/۱۳)

دیکھتے یہاں پر اکلوتا بیٹا کہا گیا ہے۔

تورات میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت اسحقؑ کے بڑے بیٹے عیسو (جو بعد میں اووم کے نام سے مشہور ہوئے) کی شادی حضرت اسمعیلؑ کی صاحبزادی سے ہوئی اور وہ (اووم) انہیں کے پاس آکر سکونت پذیر ہو گئے۔ حضرت اسمعیلؑ کے بارہ بیٹے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی وسعت اور خوشحالی عطا فرما رکھی تھی۔ ان کے قافلے شام اور مصر تک تجارت کرتے تھے۔ فلسطین میں حضرت اسحاقؑ کی اولاد بھی بہت بڑھی اور پھولی۔ تاریخ کے اوراق میں ان دو شاخوں (اسمعیلی اور اسرائیلی) کے باہمی مخالفانہ الجھاؤ اور تصادم و تجارت کے واقعات بھی درج ہیں۔

حضرت اسحاقؑ کے دو بیٹے (عیسو اور یعقوب) تو ام پیدا ہوئے تھے (پیدائش ۲۶-۲۵/۲۵)۔ ان میں سے عیسو بڑا تھا اور اس زمانہ کے قانون کی رو سے باپ کی سرداری کا وارث بڑا بیٹا

حضرت یعقوبؑ ہوتا تھا۔ تورات میں (حسب معمول) ایک عجیب قصہ مذکور ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے (معاذ اللہ) ایک چال چل کر اپنے بڑے بھائی سے حق وراثت اور اپنے والد (حضرت اسحقؑ) سے دعائے برکت حاصل کر لی۔ اس میں لکھا ہے کہ

اور ہوا یوں کہ جب اسحق بوڑھا ہوا اور اس کی آنکھیں ایسی دھندلا گئیں کہ وہ دیکھ نہ سکتا تھا تو اس نے اپنے بڑے بیٹے عیسو کو بلایا اور کہا کہ اے میرے بیٹے! وہ بولا دیکھ میں حاضر ہوں ۵ تب اس نے کہا کہ اب دیکھ میں بوڑھا ہوا اور میں اپنے مرنے کا دن نہیں جانتا ۵ سو اب میں تجھ سے منت کرتا ہوں کہ اپنا ہتھیار اور اپنا ترکش اور اپنی کمان لے اور جنگل کو جا اور میرے لئے شکار کر ۵ اور میرے لئے لذیذ کھانا جیسا کہ میں چاہتا ہوں تیار کر اور میرے آگے لاکہ میں کھاؤں تاکہ میں جی سے اپنے مرنے کے آگے تجھے برکت بخشوں ۵ اور جب اسحق اپنے بیٹے عیسو سے باتیں کرتا تھا تب ربقہ نے سنا اور عیسو جنگل کو گیا تھا کہ شکار مارے اور لے آئے۔

تب ربقہ نے اپنے بیٹے یعقوب سے ہمکلام ہو کے کہا کہ دیکھ میں نے تیرے باپ کی سنی کہ تیرے بھائی عیسو سے ہمکلام ہو کے کہا ۵ میرے لئے شکار لا اور میرے واسطے لذیذ خوراک تیار کر تاکہ میں کھاؤں اور مرنے سے پیشتر خداوند کے آگے تجھے برکت بخشوں ۵ سو اب اے میرے بیٹے! اس حکم کے موافق جو میں تجھے دیتی ہوں میری بات کو مان ۵ اب تجھے میں جا کے وہاں سے بھری کے دو اچھے اچھے بچے میرے پاس لا اور میں تیرے باپ کے لئے ان سے لذیذ کھانا جیسا کہ وہ چاہتا ہے بچواؤں گی ۵ اور تو اسے اپنے باپ کے آگے لائو تاکہ وہ کھائے اور اپنے مرنے سے پیشتر تجھے برکت بخشے ۵ تب یعقوب نے اپنی ماں ربقہ سے کہا۔ دیکھو میرے بھائی عیسو کے بدن پر بال ہیں اور میرا بدن صاف ہے ۵ شاید میرا باپ مجھے چھوٹے اور میں اس پر دغا باز ٹھہروں اور برکت نہیں بلکہ لعنت اپنے اوپر لاؤں ۵ اس کی ماں نے اسے کہا کہ تیری لعنت مجھ پر ہو اے میرے بیٹے۔ تو صرف میری بات مان اور جگے میرے لئے انہیں لا ۵ تب وہ گیا اور انہیں اپنی ماں پاس لے آیا اور اس کی ماں نے لذیذ کھانا جیسا کہ اس کا باپ چاہتا تھا بچوا یا ۵ اور ربقہ نے اپنے بڑے بیٹے عیسو کی نفیس پوشاکیں جو گھر میں اس پاس تھیں لیں اور اپنے چھوٹے بیٹے یعقوب کو پہنائیں ۵ اور بحری کے بچوں کی کھال اس کے ہاتھوں اور اس گردن پر جہاں بال نہ تھے لپیٹی ۵ اور وہ لذیذ کھانا اور روٹی جو اُس نے تیار کی تھی اپنے بیٹے یعقوب کے ہاتھ دی۔

۵ تب اس نے اپنے باپ پاس آ کے کہا کہ اے میرے باپ۔ وہ بولا دیکھ میں یہاں ہوں۔ تو کون ہے میرے بیٹے ۵ یعقوب اپنے باپ سے بولا کہ میں عیسو ہوں تیرا پلوٹھا (پہلوٹھا) جیسا تو

نے مجھ سے کہا میں نے ویسا ہی کیا۔ اٹھ بیٹھے اور میرے شکار میں سے کچھ کھائیے تاکہ توجہ سے مجھے برکت بخشے ۵ تب اسحاق نے اپنے بیٹے سے کہا کہ یہ کیونکر ہوگا کہ تو نے ایسا جلد پایا ہے اسے میرے بیٹے؟ وہ بولا اس لئے کہ خداوند تیرا خدا میرے آگے لایا ۵ تب اسحاق نے یعقوب کو کہا اسے میرے بیٹے نزدیک آ کہ میں تجھے چھوؤں کہ تو میرا وہی بیٹا عیسو ہے کہ نہیں اور یعقوب اپنے باپ اسحاق کے پاس گیا اور اُس نے اسے چھو کے کہا کہ آواز تو یعقوب کی ہے پر ہاتھ عیسو کے ہیں ۵ اور اس نے اسے نہ پہچانا اس لئے کہ اس کے ہاتھوں پر اس کے بھائی عیسو کے ہاتھوں کی طرح بال تھے سو اُس نے اسے برکت دی ۵ اور کہا کہ تو میرا وہی بیٹا عیسو ہے؟ وہ بولا کہ میں وہی ہوں ۵ تب اُس نے کہا کہ تو کھانا میرے پاس لاکہ میں اپنے بیٹے کے شکار سے کچھ کھاؤں تاکہ جی سے تجھے برکت دوں۔ سو وہ اس پاس لایا اور اس نے کھایا۔ اور وہ اس کے لئے منے لایا اور اُس نے پی۔ پھر اس کے باپ اسحق نے اُسے کہا کہ اے بیٹے! اب نزدیک آ اور مجھے چوم ۵ وہ نزدیک گیا اور اسے چوسا۔ تب اس نے اس کے لباس کی باس پائی اور اسے برکت دی اور کہا کہ دیکھ! میرے بیٹے کی ریح اس کھیت کی ریح کی مانند ہے جس میں خداوند نے برکت بخشی ہے ۵ خدا آسمان کی اوس اور زمین کی چکنائی اور اناج اور منے کی زیادتی تجھے بخشے ۵ تو میں تیری خدمت کریں گردہیں تیرے آگے جھکیں۔ تو اپنے بھائیوں کا سردار ہو اور تیری ماں کے بیٹے تیرے آگے جھکیں۔ ہر ایک تجھ پر لعنت کرے ملعون ہو مگر وہ تو تیرے لئے برکت چاہے مبارک ہو۔

۵ اور یوں ہوا کہ جوں اسحاق یعقوب کو برکت دے چکا اور یعقوب اپنے باپ اسحاق کے حضور سے باہر چلا وہیں (اتنے ہی میں) اس کا بھائی عیسو اپنے شکار سے پھر آیا ۵ اس نے بھی لذیذ کھانا پکایا تھا اور اُسے اپنے باپ پاس لایا اور اپنے باپ سے کہا کہ میرے باپ اٹھئے اور اپنے بیٹے کا شکار کھائیے تاکہ آپ جی سے مجھے برکت دیں ۵ اس کے باپ اسحاق نے اس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ وہ بولا کہ میں عیسو تیرا پہلو ہٹا بیٹا عیسو ہوں ۵ تب اسحاق بشتت کا نپا اور بولا وہ کون تھا اور کہاں ہے جو شکار کر کے میرے پاس لایا اور میں نے سب میں سے تھوڑا تھوڑا تیرے آنے کے لئے کھا لیا اور اسے برکت دی۔ ہاں وہ مبارک ہوگا ۵ عیسو اپنے باپ کی باتیں سنتے ہوئے شدت سے چلا اٹھا اور پھوٹ پھوٹ کر دیا اور اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ! مجھے ہاں مجھے بھی۔

برکت دیکھئے وہ لولا تیرا بھائی دغا سے آیا اور تیری برکت لے گیا۔ تب اُس نے کہا کہ کیا اس کا نام یعقوب ٹھیک نہیں؟ کہ اُس نے دوبارہ مجھے اڑنکا مارا۔ اس نے میرے پلوٹھے ہونے کا حق لے لیا اور دیکھو اب اُس نے میری برکت لے لی۔ پھر اس نے کہا کیا تو نے میرے لئے کوئی برکت نہیں رکھ چھوڑی؟

(پیدائش ۱۔ ۲۷/۳۶)

کیا یہ باتیں کسی برگزیدہ انسان کے شایان شان ہو سکتی ہیں؟ اللہ کی سچی کتاب اور محرف کتب سابقہ کا فرق قدم قدم پر نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ لیکن مذہبی تعصب عجیب جذبہ ہے کہ انسان کی چشم بھیرت پر ہمیشہ ہٹی باندھے رکھتا ہے۔

مباحثہ خلاصہ چونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط ایک ہی سلسلہ کی متصل کڑیاں ہیں اس لئے تسلسل بیان کے پیش نظر یہی مناسب سمجھا گیا ہے کہ اس داستان زرتیں کا خلاصہ حضرت لوط کے عنوان کے اخیر پر درج کیا جائے۔

استدراک سابقہ صفحات پر حضرت ابراہیم کی بُت شکنی کا واقعہ درج ہے۔ سورۃ انبیاء کی جن آیات (۲۱/۶۳-۶۲) میں وہ واقعہ مذکور ہے ان کا ایک مفہوم تو وہی ہے جسے وہاں درج کیا گیا ہے لیکن ان کا ایک اور مفہوم بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم نے پیاروں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں تمہارے بتوں کے خلاف کچھ کرنے والا ہوں۔ لہذا جب انہوں نے مجدد کے ٹوٹے ہوئے بتوں کو دیکھا تو انہیں اس کے باور کرنے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ (حضرت) ابراہیم ہی کا کام ہے۔ لیکن وہ چونکہ معاملہ کو آگے بڑھانا اور مجرم کو سخت ترین سزا دینا چاہتے تھے اس لئے ضروری تھا کہ وہ متعین طور پر معلوم کر لیتے کہ بتوں کو خود (حضرت) ابراہیم نے توڑا ہے یا ان کی جماعت کے کسی اور فرو نے۔ اگر انہیں ان کی جماعت کے کسی اور فرو نے توڑا ہو تو اس کے خلاف بُت شکنی کا جرم عائد ہو گا اور حضرت ابراہیم کے خلاف اسے اس جرم کے ارتکاب پر آمادہ کرنے اور اشتعال دلانے کا جرم۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے حضرت ابراہیم سے پوچھا کہ

ءَاَذْنَتْ فَعَلْتَ هَذَا يَا لَهْتَ يَا اِبْرَاهِيمَ (۲۱/۶۲)

اے ابراہیم! ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کیا تو نے خود کی ہے؟ (یا تمہارے متبعین میں سے کسی نے ایسا

کیا ہے) اس صورت میں قوسین کے اندر کے الفاظ کو محذوف ماننا ہوگا۔ اس کے جواب میں حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ یہ کام جماعتِ مومنین کے کسی عام فرو نے نہیں کیا بَلْ فَعَلَهُ قَوْمٌ كَبِيرُهُمْ هَذَا اِٰلَٰهِنَا اِنَّهُمْ لَكٰفِرُوْنَ (ہاں!) تمہارے سامنے کھڑا ہے، خود ایسا کیا ہے۔ اس سے حضرت ابراہیمؑ نے سچی بات بیان کر کے پورے جرم کو اپنے اوپر لے لیا اور اپنی جماعت کو اس جرم کے شبہ میں بھی مبتلائے بلا نہ ہونے دیا۔

اس کے ساتھ ہی حضرت ابراہیمؑ نے اُن کے ذہن کا رخ صحیح سمت کی طرف موڑنے کے لئے کہا کہ میری گنج میں یہ بات نہیں آئی کہ تم اس امر کی تحقیق اِدھر اِدھر سے کیوں کر رہے ہو اور مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو کہ ان بتوں کے ساتھ یہ کاروائی کس نے کی ہے تم ان بتوں کو کائنات کے سرار و رموز تک سے باخبر مانتے ہو تمہارا ایمان یہ ہے کہ یہ انسانوں کے دل کے اندر چھپی ہوئی باتوں سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر تم مجھ سے پوچھنے کی بجائے کہ یہ کچھ میں نے کیا ہے یا میری جماعت کے کسی فرو نے تم انہی بتوں سے کیوں نہیں پوچھتے کہ تم سے یہ کچھ کس نے کیا ہے؟

فَسْئَلُوهُمْ اِنْ كَاٰوَا يَنْطِقُوْنَ ۝ (۲۱/۴۳)

ان سے پوچھو اگر یہ بول سکتے ہیں تو تمہیں جواب دیں گے اور اصلی مُسِرِم کا پتہ نشان بتا دیں گے۔ (باقی واقعہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے)۔



وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِينَ بَوَّأْنَاهُمُ
الْبَيْتَ الْعَمَلَةَ (۷۶)

قَوْمٌ
وَوَط

کوئی پوپچھے حکیم یورپ سے
ہندو یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال؟
مرد بے کار و زن تہی آنکوش!

حضرت لوط علیہ السلام

شق ۲۲۰ ق-۲

حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ جمیلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ کلدانیوں کے ظلمت کردہ میں آپ کے برادر زادہ (حضرت لوطؑ) آپ پر ایمان لائے۔ (قَامَنَ لَهُ لُوطٌ ۲۹/۲۶۱) ”ابراہیمؑ پر لوط ایمان لایا۔“ اور پھر آپ کے ساتھ فلسطین کی طرف ہجرت بھی کی۔

وَجَعَلْنَاهُ دَلِيلًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ ۵ (۲۱/۴۱)

ہم نے اسے اور (اس کے بھتیجے) لوط کو (دشمنوں سے) نجات دلا کر ایک ایسے ملک میں پہنچا دیا جسے قوموں کے لئے (بڑا ہی) بابرکت ملک بنایا ہے (یعنی سرزمین کنعان)۔

ظاہر ہے کہ اس وقت تک حضرت لوطؑ شرفِ نبوت سے بہرہ یاب نہیں فرمائے گئے تھے۔ جب حضرت ابراہیمؑ اس ارضِ مبارک میں متمکن ہو گئے اور مشیتِ ایزدی نے چاہا کہ اس مشعلِ رشد و ہدایت کی کرنیں دُور دُور تک ضیاء پاش ہوں تو حضرت لوطؑ کو سدوم کی طرف جانے کے لئے ارشاد ہوا۔ یمن سے بحرِ احمر (RED SEA) کے کنارے کنارے ایک قدیمی تجارتی قافلوں کی سڑک حجاز و مدین سے گزر کر عقبہ وغیرہ تک چلی گئی ہے۔ سدوم کی بستی اسی شاہراہ پر واقع تھی (قرآن کریم نے اس شاہراہ کو اَمَّاكُم مَّبِينٍؑ

کہا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا، قیاس یہ ہے کہ یہ علاقہ بحرِ میت (DEAD SEA) کے قریب تھا۔ زلزلوں کی وجہ سے اس کا بہت ساحقہ سمندر کے نیچے آ گیا۔ حضرت لوط کو اسی علاقہ میں بسنے والی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ (وَإِنَّا لَوُطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ (۳۴/۱۳۳) اور بلاشبہ لوط (ہمارے پیغمبروں میں سے تھا)۔ انہوں نے اگر اصولی طور پر اسی پیغامِ خداوندی کی طرف دعوت دی جس کی طرف اس سے پیشتر حضرات انبیاء کرام دعوت دیتے چلے آ رہے تھے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ۖ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطُ أَلَا تَتَّقُونَ ۚ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَاطِيعُونَ ۚ

(۱۶۰ — ۲۶/۱۶۳)

(اوردیکھو) قوم لوط نے (بھی) رسولوں (کی تعلیمات) کو جھٹلایا۔ (یاد کرو) جب ان کے بھائی بند لوط نے ان سے کہا کہ کیا تم قوانینِ خداوندی کی ننگداشت نہیں کرتے؟ بلاشبہ میں تمہارے لئے خدا کا امانت دار پیغمبر ہوں۔ تو (تمہیں چاہیے کہ) خدا کے قوانین کی ننگداشت کرو اور (مرکزِ نظامِ خداوندی کی حیثیت سے) میری اطاعت کرو (کہ میری یا مرکز کی اطاعت، میری اطاعت نہیں بلکہ دراصل خدا کی اطاعت ہے)۔

دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت لوط اس قوم میں پہلے رسول نہ تھے بلکہ یہ قوم آپ سے پیشتر اور رسولوں کی بھی تکذیب کر چکی تھی اسی لئے كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ۚ فرمایا۔ دوسرے یہ کہ حضرت لوط کو اس قوم کا بھائی (أَخُوهُمْ) کہا گیا ہے۔ اسی صورت میں حضرت نوح، ہود اور صالح (عَلَيْهِمُ السَّلَام) کا ذکر بھی انہی الفاظ میں کیا گیا ہے۔ لیکن ان کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ چونکہ انہی قبائل میں تھے جن کی طرف وہ مبعوث کئے گئے تھے اس لئے قبیلہ کی نسبت سے ان کے بھائی تھے۔ لیکن حضرت لوط تو باہر سے تشریف لے گئے تھے اس لئے قومِ سدوم سے کسی قبائلی نسبت کی بنا پر رشتہِ اخوت نہ تھا، بلکہ ان میں رہنے بسنے کی وجہ سے ایسا کہا گیا ہے۔

اللہ کی طرف دعوت دی اور ساتھ ہی وہ عظیم الشان اعلان بھی فرمادیا جو داعیانِ الٰہی الحق کا امتیازی

وصف چلا آ رہا ہے، یعنی

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنِ اجْتَبَىٰ إِلَّا عَلَىٰ

رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۲۶/۱۶۴)

اور (دیکھو) میں اپنی اس (دعوت و تبلیغ کی) خدمت پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو صرف پروردگارِ عالم ہی کے ذمہ ہے۔

یوں تو حضراتِ انبیائے کرامؑ جس قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے وہ قوم بالعموم کفر و شرک، فسق و فجور، معصیت کوشی اور بدکرداری، سرکشی و تمرد اور سلب و نہب کی لعنتوں میں گرفتار ہوتی تھی اور ان حضرات کی بعثت کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ ان راہ گم کردہ لوگوں کو ان کے اعمال کے ہلاکت انگیز نتائج سے آگاہ کریں۔ لیکن قوم سدوم جس شرم انگیز فحاشی میں مبتلا تھی وہ دنیا جہاں سے نرالی تھی۔ یہ **شرمناکہ فحاشی** بد بخت، اپنی شہوانی خواہشات کی تسکین کے لئے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس فعلِ شنیع کی ابتدا بھی اسی قوم سے ہوئی۔ لفظ لواطت (تلوط) خود اس پر شاہد ہے کہ اس کی نسبت قوم لوط سے ہے۔ انگریزی میں (SODOMY) سدوم (SODOM) کی نسبت سے ہے۔

وَ لُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ ۝ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُونِ النِّسَاءِ ۝ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ۝

(۸۰-۷۹)

اور لوط کا واقعہ یاد کرو، جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا، ”کیا تم ایسی بے حیائی کا کام کرنا پسند کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا؟ تم عورتوں کو چھوڑ کر نفسانی خواہش سے مردوں پر رائل ہوتے ہو۔ یقیناً تم ایک ایسی قوم ہو گئے ہو جو (اپنی نفس پرستیوں میں) بالکل مدود فراوش ہے۔

أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ۝ وَ تَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَرْوَاحِكُمْ ۝ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ۝ (۱۶۵-۱۶۴)

(اور دیکھو، لوط نے اپنی قوم سے کہا) کیا تم (اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کے لئے) دنیا

میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو اور تمہارے پروردگار نے (اس مقصد کے لئے) جو تمہارے لئے تمہاری بیویاں پیدا کی ہیں، انہیں چھوڑ دیتے ہو، (یہی نہیں) تم قوانینِ فطرت کے حدود سے تجاوز کرنے والے لوگ ہو۔

سورۃ اعراف میں مُسْرِفُونَ اور سورۃ شعراء میں غُلُون کی جامعیت پر غور فرمائیے، حدودِ فطرت سے تجاوز کی طرف کس مبلغِ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۃ نمل میں فرمایا:

وَلَوْطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ
أَيُّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِنْ دُونِ النِّسَاءِ ۗ بَلْ أَنْتُمْ
قَوْمٌ مُّجْرِمُونَ ۝ (۲۴/۵۵-۵۴)

اور لوط کا واقعہ یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا، "کیا تم ایسی بے حیائی کا کام جانتے بوجھتے کرنا پسند کرتے ہو؟ کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر نفسانی خواہش سے مردوں پر مائل ہوتے ہو۔

یقیناً تم ایک ایسی قوم ہو گئے ہو جو جہالت کے کام کرتی ہے۔

وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ یعنی دیدہ و دانستہ، جانتے بوجھتے، اس حیا سوز فعلِ قبیح کے مرتکب ہوتے ہو۔ اس سے بڑی جہالت کچھ اور بھی ہو سکتی ہے؟ (أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّجْرِمُونَ) سورۃ عنکبوت میں ہے کہ وہ لوگ اس درجہ بے غیرت اور آبرو باختہ ہو چکے تھے کہ کھلی مجالس میں بے حیائی کی باتیں کیا کرتے تھے اور اس سے ذرا شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان حیا سوز فحاشیوں کے خلاف ان کے دل میں کوئی کھٹک تک بھی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان ایسی کھلی ہوئی معصیت کو شہی کی زندگی پر اتر آئے تو پھر شرم اور حیا کبھی باقی نہیں رہتی! آج بھی دنیا کی ان اقوام پر نگاہ ڈالئے جو

جذباتِ پرستی اور فحش کاری کے سیلاب میں بہے جا رہی ہیں۔ ان میں غیرت اور حیا

رہزنی بھی کہیں نام کو نہیں ہوتی۔ اس بے غیرتی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یوں تو انگلستان بلکہ

لہ بُبْصِرُونَ اور مُّجْرِمُونَ کے تقابلیں پر غور فرمائیے۔ یعنی وہ لوگ فہم و بصیرت رکھتے ہوئے بدترین جہالت میں مبتلا تھے۔ لہذا وہ علم جو سیرتِ انسانی کی صحیح تشکیل یعنی افکار و اعمال کی تطہیر نہیں کر سکتا، علم نہیں جہالت ہے، شہی نہیں تاریکی ہے، آج سے چار ہزار سال پیش تر بھی اور آج بھی۔

یورپ کے دیگر ممالک میں بھی) لواطت ایک عرصہ سے چلی آرہی تھی۔ لیکن سال گذشتہ ۱۹۶۷ء میں اسے انگلستان میں قانوناً جائز قرار دے دیا گیا ہے! سچ کہا تھا قرآن نے کہ جب انسان بستی کی طرف گرتا ہے تو حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ ہم جنس سے جنسی اختلاط (لواطت) حیوانات کے تصور میں بھی نہیں آسکتی!

قوم لوط، رہزنی بھی کرتی تھی۔

وَ لُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ إِنَّكُمْ لَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ ذَٰ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ هَٰ أَتَيْتُمْ لَأْتُونَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُونَ السَّبِيلَ هَٰ وَ تَأْتُونَ فِي نَادِيكُمْ الْمُنْكَرَ (۲۸-۲۹/۲۹)

اور لوط کا داقہ یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا، کیا تم ایسی بے حیائی کا کام پسند کرتے ہو جو تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا؟ تم تو عورتوں کو چھوڑ کر نفسانی خواہش سے (مردوں پر مائل ہوتے ہو اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں علانہ، برائیوں کے مرتکب ہوتے ہو؟

(تم پر حیف ہے۔)

تَقْطَعُونَ السَّبِيلَ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ تم اس طرح (عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف مائل ہونے سے) اس راستے کو منقطع کرتے ہو جسے فطرت نے افزائش نسل انسانی کے لئے وضع کیا ہے۔

تذکر موعظت کا جواب یہ تھی وہ قوم جس کی طرف حضرت لوط مبعوث ہوئے، جب آپ نے انہیں ان کی بدکرداریوں سے منع کیا تو ان کی طرف سے جو جواب ملا وہ انکی فطرتِ جبینہ کا صحیح آئینہ دار ہے۔

وَ مَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أَنَاسٌ يَّتَطَهَّرُونَ هَٰ (۸۲/۴؛ ۵۶/۲۴)

لوط کی قوم کے پاس اگر اس کا پھر جواب تھا تو یہ کہ آپس میں کہنے لگے، "ان لوگوں کو اپنی بستی سے

نکال باہر کر دو۔ یہ لوگ بڑے پاک صاف بننا چاہتے ہیں۔"

فطرتِ ابلیسی کی کیسی صحیح تصویر ہے، آج بھی کسی بدکردار کو اس کی جیسا سوز حرکات سے منع کرنے کی کوشش

کیجئے تو یہی جواب ملے گا۔ جب آپ نے زیادہ زور دیا تو یہ لوگ اس حربے پر اتر آئے جو شہ قوت کی بدستی کا خاصہ ہوتا ہے۔

قَالُوا لَكُنْ لَمْ تَنْتَهَ يَلُوطُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (۳۶/۱۴۶)

تو وہ کہنے لگے، "اے لوط! اگر تو باز نہ آیا، تو یاد رکھ تو لا محالہ (یہاں سے) نکال دیا جائے گا۔ انہوں نے یہ دھمکی دی اور آپ نے نہایت سکوت و سکون سے یہ جواب دے دیا کہ ان دھمکیوں سے تمہارے اعمال کے خلاف میرے دل کی نفرت کم بھٹوڑی ہو جائے گی؟

قَالَ اِنِّي لَعَمْرِكُمْ مِنَ الْغٰلِيْنَ ۝ (۳۶/۱۴۸)

لوط نے کہا (اس کے باوجود) میں تمہاری بدکرداریوں کو اتہائی
نفرت کی نگاہ سے دیکھنے والوں میں سے ہوں۔

یہ سلسلہ جاری رہا۔ ادھر سے تذکیر و تنذیر اور ادھر سے ضد اور انکار برابر بڑھتا گیا۔ جب حضرت لوط ان سے کہتے کہ اللہ کے عذاب سے ڈرو اور اس نے جو تمہیں بہلت وے رکھی ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ، تو وہ اس کا بھی مذاق اڑاتے اور کہتے کہ جاؤ! وہ عذاب لے آؤ جس کی یوں دھمکی دے رہے ہو!

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِۦ اِلَّا اَنْ قَالُوْا اَنْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ

كُنْتُمْ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۲۹/۲۹)

لوط کی قوم کے پاس اگر اس کا کچھ جواب تھا تو یہی کہ وہ کہنے لگے، اگر ایسے ہی سچے ہو تو وہ اللہ کا عذاب ہم پر لے آؤنا! (جس کی روز دھمکیاں دیا کرتے ہو)۔

دوسرے مقام پر ہے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنٰهُمْ بِطُغْيٰنِنَا فَمَا زُوْا بِاللَّذٰرِ ۝ (۵۲/۳۶)

اور (دیکھو) لوط نے انہیں ہماری گرفت سے آگاہ کر دیا تھا مگر انہوں نے (الٹا) اس

سے جھگڑا مول لیا۔

جب حضرت لوط ان راہ گم کردہ بد بختوں کے انکار و جھوٹ اور سرکش و تمرد کی ان حدود فراموشیوں کو دیکھتے تو اللہ سے دعائیں مانگتے کہ وہ انہیں اور ان کے متبعین کو اس انسانیت فروش قوم کے اعمال بد

کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رکھے۔

رَبِّ نَجِّنِي وَ أَهْلِي مِمَّا يَعْمَلُونَ ۝ (۲۶/۱۷۹)

(لوط نے ہماری بارگاہ میں عرض کیا) اے پروردگار! مجھے اور میرے متبعین کو ان (بد اعمالیوں کے نتائج) سے محفوظ رکھ جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

اور ان پر غلبہ و نصرت عطا فرمائے۔

قَالَ رَبِّ انصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمَفْسِدِينَ ۝ (۲۹/۳۰)

(اور دیکھو، لوط نے ہماری بارگاہ میں عرض کیا کہ) اے میرے پروردگار! مجھے (یعنی میرے

مشن کو) فساد انگیز لوگوں پر (غلبہ و) نصرت عطا فرما!

یہ مہلت کا عرصہ یونہی گذرنا گیا حتیٰ کہ وہ وقت آپہنچا جب قانونِ مکافات کے مطابق ان کے اعمال کی کھیتی پک گئی اور ظہورِ نتائج کا زمانہ آگیا۔ خدا کے فرستادہ اس قوم کی طرف آئے تاکہ آخری حجت

کا بھی اتمام ہو جائے۔ یہ راستہ میں پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس گئے اور انہیں حضرت اسحقؑ کی خوشخبری دی (تفصیل سابقہ

ظہورِ نتائج کا وقت

عنوان میں گذر چکی ہے)۔ جب حضرت ابراہیمؑ کو معلوم ہوا کہ قوم لوط پر تباہی اور بربادی کا عذاب آنے والا ہے تو ان کی رقیقِ قلبی نے بہت چاہا کہ کسی طرح انہیں ہملت کا مزید موقع مل جائے جس سے وہ شاید اپنی حرکاتِ قلبیہ سے باز آجائیں۔ لیکن مشیتِ ایزدی کے علم میں تھا کہ وہ قوم رجعت و انابت کی حد سے کہیں آگے بڑھ چکی ہے۔ ان کی باز آفرینی کی کوئی صورت باقی نہیں۔ ان کے اعمال کے ہلاکت آمیز نتائج مرتب ہو چکے ہیں۔ سورہ ہود میں ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرُّدْعُ وَ جَاءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا
فِي قَوْمِ لُوٓطٍ ۝ وَ اِنَّهُمْ اَتٰهُمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ۝ (۱۱-۱۲)

پھر جب ابراہیمؑ کے دل سے اندیشہ دور ہو گیا اور اسے خوشخبری ملی، تو قوم لوط کے بارے میں ہم سے جھگڑنے لگا (یعنی ہمارے فرستادوں سے بار بار سوال و جواب کرنے لگا کہ آنے والی

لے يُجَادِلُنَا کی مزید تشریح کے لئے چند صفحہات کا انتظار کیجئے۔

بلا ٹل جاتے) حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم بڑا ہی بڑا بار، بڑا ہی نرم دل اور (ہر حال میں) اللہ کی طرف رجوع ہو کر رہنے والا تھا! (ہمارے فرستادوں نے کہا) کہ اے ابراہیم! اب اس بات کا خیال چھوڑ دے۔ تیرے پروردگار کی (پھرائی ہوئی) بات جو تھی، وہ آہنچی اور ان لوگوں پر عذاب آ رہا ہے جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا۔

خدا کے فرستادہ | اس کے بعد وہ حضرت لوط کے ہاں پہنچے۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کا آخری حصہ اور یہ پدبخت ان پر پل پڑتے ہیں۔

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِئِئًا بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا
..... وَ إِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نَزِیْدُ ۝ (۷۷-۷۹/۱۱)

اور پھر جب ایسا ہوا کہ ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے، تو وہ ان کے آنے سے خوش نہیں ہوا۔ ان کی موجودگی نے اسے پریشان کر دیا۔ وہ بولا کہ آج کا دن تو بڑی مصیبت کا دن ہے اور اس کی قوم کے لوگ (اجنبیوں کے آنے کی خبر سن کر) دوڑتے ہوئے آتے۔ وہ پہلے سے بڑے کاموں کے عادی ہو رہے تھے۔ لوط نے ان سے کہا تو گویا یہ میری بیٹیاں ہیں (یعنی ان کی بیویاں جنہیں وہ اپنی بیٹیوں کی جگہ سمجھتا تھا اور جنہیں لوگوں نے چھوڑ رکھا تھا)۔ یہ تمہارے لئے جائز اور پاک ہیں۔ پس ان کی طرف مٹفت ہو، دوسری بات کا قصد نہ کرو۔ اور اللہ سے ڈرو، میرے مہاؤں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں؟ ان لوگوں نے کہا ”تجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تیری ان بیٹیوں سے ہمیں کوئی سوا کار نہیں۔ اور تو اچھی طرح جانتا ہے ہم کیا کرنا چاہتے ہیں“

اس واقعہ کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے۔ (۵۷-۶۰/۱۵؛ ۶۷-۷۲/۱۵؛ ۳۲-۳۳/۲۹)۔

حضرت لوط کا اضطراب | غرضیکہ اُدھر سرکشی و تمرد اور قوت و استیلا کے اندھے نشے کا ایک پھرا ہوا طوفان تھا جو چاروں طرف سے دیوار و در کی تیز بھلائے احاطہ کرتا تھا اور اُدھر خدا کا ایک تنہا بندہ ان نوار و مسافروں کی حفاظت کے لئے سینہ

پڑکھڑا تھا۔ پریشانی تھی تو صرف ان بہانوں کے لئے۔
 قَالَ لَوْ أَنِّي رَأَيْتُ بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِيَّ إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ ۝

(۱۱/۸۰)

لوط نے کہا "کاش تمہارے مقابلہ کی مجھے طاقت ہوتی یا کوئی سہارا ہوتا جس کا سہارا پڑ سکتا۔
 جب بہانوں نے حضرت لوط کی اس گھبراہٹ کو دیکھا تو انہیں تسلی دی کہ مت گھبراؤ یہ ہم تک دست درازی
 نہیں کر سکتے۔

قَالُوا يَلُوطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ نَصِلُونَكَ إِنَّ مَوْعِدَهُمُ
 الصُّبْحُ ۖ أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ ۝ (۱۱/۸۱)

تب بہانوں نے کہا "اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ اگھرانے کی
 کوئی بات نہیں، یہ لوگ تجھ پر قابو نہ پاسکیں گے (کہ تجھے رسوا کر کے ہم تک دست اندازی
 کر سکیں) تو یوں کر کہ جب رات کا ایک حصہ گزر جائے تو اپنے آدمیوں کو ساتھ لے کر نکل
 چل اور اس طرح یہاں سے دامن جھاڑ کر نکل جا کہ پھر تم میں سے کوئی بھی اس سرزمین کی
 طرف مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ یہ بھی سمجھ لے کہ تیری بیوی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ وہ پیچھے رہ
 جائے گی اور جو کچھ ان لوگوں پر گزرنا ہے وہ اس پر بھی گزرے گا۔ ان لوگوں کے لئے عذاب
 کا وقت صبح کا ہے اور صبح کے آنے میں کچھ دیر نہیں۔"

نیز دیکھیے۔ (۶۱ - ۱۵/۶۶ ز ۲۹/۳۴)۔

عذاب کی نوعیت | قوم سدوم کا علاقہ آتش فشاں پہاڑوں اور گندھک کی کانوں سے
 پٹا پڑا تھا۔ آتش فشاں پہاڑوں کا اشتقاق بڑا ہلاکت انگیز عذاب ہوتا
 ہے۔ کبھی تو آتش فشاں سیال مادہ (لاوا) کی شکل میں ایک بہتا ہوا جہنم بن کر گرد و پیش کے علاقوں کو
 دہکتے ہوئے انکاروں کی بھٹی بنا دیتا ہے۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہاڑ کے دہانے سے راکھ اور پتھر
 کا مینہ برستا ہے جس کی بوجھاڑ دور دور تک جاتی ہے۔ پیمپانی کی تباہی اسی قسم کی "بارش" سے
 ہوتی تھی اور کہا جاتا ہے کہ ان پتھروں کی زد سینکڑوں میل تک تھی۔ قوم لوط کی تباہی کے وقت بھی ایسا معلوم
 ہوتا ہے کہ پہلے اسی قسم کی سنگ باری ہوئی۔ گندھک کی کانوں میں آگ بھڑک اٹھی اور پھر ایسے زلزلے

آئے کہ زمین نیچے دھنس گئی اور جھیل (DEAD SEA) کا پانی اوپر آ گیا۔ یہ علاقہ آج بھی بالکل کھینگر ہے اور بھر میت کے پانی میں اس قدر تیزابی مادوں کی آمیزش ہے کہ وہ خود ایک آتش سیال ہے۔ قرآن کریم نے اسی حقیقت کو مختلف پیرایوں میں بیان فرمایا ہے۔ سورہ اعراف میں فقط اتنا بیان فرمایا کہ

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا ۙ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ۝

ہم نے ان پر (پتھروں کا) مینہ برسایا تھا۔ سو دیکھو، مجرموں کا انجام کیا ہوا؛

یہ مینہ جلے ہوئے پتھروں (کھینگروں) کا تھا۔

فَلَمَّا جَاءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا ۙ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا
مِحْرًا ۙ مِّنْ سِجِّيلٍ ۙ مُّنْضُودٍ ۙ مُّسَوِّمَةٍ ۙ عِنْدَ رَبِّكَ ۙ وَمَا
هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ بِبَعِيْبٍ ۙ

پھر جب ہماری (پھرائی ہوئی) بات کا وقت آپہنچا تو (اے پیغمبر!) ہم نے اس بستی کی تمام بلندیاں بستی میں بدل دیں اور اس میں آگ میں پکے ہوئے پتھر لگاتار برسائے کہ تیرے پروردگار کے حضور (اس غرض سے) نشان کئے ہوئے تھے یہ (بستی) ان ظالموں (یعنی اشرار) کے مکہ سے کچھ دور نہیں ہے (یہ اپنی سیروسیاحت میں وہاں سے گذرتے رہتے ہیں اور اگر چاہیں، تو اس سے ہجرت کر سکتے ہیں)۔

یہاں پتھروں کی بارش کی تصریح کے ساتھ زلزلہ کا عبرت انگیز نتیجہ بھی بیان فرمادیا جس سے بڑی بڑی بلند عمارات پستیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ بلکہ وہ اتنا نیچے دھنس گئیں کہ پانی سطح ارض کے اوپر چڑھ آیا۔ دوسری جگہ انہی کو مَوْ تَفَكَّتْ (وہ جن کی بستیاں الٹ دی گئی تھیں) سے تعبیر کیا گیا ہے (دیکھئے ۹۶/۱۱)۔ سورہ حجر میں ان دونوں چیزوں کے ساتھ "صَيْفَةٌ" (ایک ہولناک آواز) کا اضافہ فرمادیا گیا، جس سے اس ماجرے کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ (دیکھئے ۳، ۴۳، ۴۹/۱۵)۔ آیت (۱۵/۲۸) میں قوم سدوم کے ساتھ اصحاب الایکہ کا بھی ذکر آ گیا ہے، کیونکہ ان کا علاقہ ان سے ملحق تھا۔ (اس کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی)۔ یہاں یہ چیز مزید غور طلب ہے کہ قوم سدوم کے اس تباہ علاقہ کے متعلق فرمایا کہ یہ ایک ایسی شاہراہ (اِمَامٌ مُّبِينٌ) پر واقع ہے جو نزولِ قرآن تک قائم (سبیلِ مقیم) تھی۔ یہ وہی بخاری سڑک ہے جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے۔ قریش کے قافلے

اس سڑک پر سے گزرتے تو ان تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔ اسی لئے (سورۃ لوط) میں یہ فرمادیا گیا کہ **وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ بِبَعِيدٍ** کہ یہ علاقہ ان ظالمین سے کہیں دُور نہیں۔ اس پر تو یہ اکثر گزرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ تکذیب و انکار کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے؟

سورۃ شعراء میں اس عذاب کے متعلق فرمایا کہ حضرت لوط اور ان کے متبعین کو تو بچالیا گیا اور دوسروں کو تباہ کر دیا۔

لَمَّا دَمَرْنَا الْآخِرِينَ ۚ وَ أَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا ۖ فَسَاءَ
مَطَرُ الْمُنْذِرِينَ ۝ (۱۷۲-۱۷۳/۲۶) نیز (۱۳۶/۳۷)۔

پھر (خاندان لوط اور اس کے متبعین کو بچا کر) ہم نے اوروں کو بُری طرح ہلاک کر دیا اور ہم نے ان پر (پتھروں کی) خوب بارش کر ڈالی۔ تو (دیکھو، ان بد اعمالیوں کے نتائج سے ڈرانے ہوؤں کی بارش کیسی بُری رہی!

نیز دیکھئے۔ (۲۷/۵۰) (۳۳-۵۱/۳۳ ; ۵۲/۳۲ ; ۵۳/۲۸)۔

اہل سے مراد! گذشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ قوم لوط کی تباہی کے ضمن میں یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ حضرت لوط اور ان کے اہل اور آل کو بچالیا گیا۔ البتہ ان کی بیویاں ان میں شامل نہیں تھی۔ اہل اور آل سے کیا مراد ہے؟ اس کی تفسیر سورۃ ذریت میں ان الفاظ میں فرمادی۔

فَأَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۚ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا
عَذْرًا بَدِيَّتٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۚ (۳۵-۵۱/۳۶)

چنانچہ ہم نے اس بستی میں سے جتنے ایمان والے تھے ان کو نکال لیا۔ مگر ہم نے اس بستی میں مطیع و فرمانبردار بندوں کے صرف ایک گھر کے علاوہ (کوئی دوسرا مکان) نہیں پایا۔

یعنی حضرت لوط کے اہل سے مراد ”گھروالے“ اور آل سے مفہوم ”ان کی اولاد“ نہ تھی بلکہ اس سے مراد جماعت مومنین تھی۔ معیار خداوندی کے مطابق ”اپنوں اور بیگانوں“ کی تمیز و تفریق کے متعلق سابقہ عنوانات میں کئی

ایک جگہ ذکر آچکا ہے، بالخصوص تذکرہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیمؑ میں اسی سلسلہ میں اس کڑی کو بھی شامل کر لیجئے۔ قرآن کریم کی رو سے اپنے "اہل اور آل" وہ ہیں جو ایمان کے رشتہ سے منسلک ہیں۔ جو اس رشتہ سے مربوط نہیں وہ بیٹا ہو یا باپ، بیوی ہو یا بھائی، "اپنوں" میں سے نہیں ہو سکتا۔ ان تمام رشتوں میں بیوی اور خاوند کا رشتہ چولی اور دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے میاں اور بیوی کو ایک دوسرے کا لباس بتایا ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ط (۲/۱۸۷)

وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔

لیکن ایمان کا رشتہ ایسا قومی ہے کہ وہ چولی کو دامن سے اور لباس کو جسم سے الگ کر دیتا ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے دو مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ سورہ تحریم میں ہے۔

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتٍ زُوجِ وَاْمْرَأَتٍ
لُّوٓطٍ ط..... وَبِخَتْنِي مِّنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ ؕ (۱۱-۱۰/۷۶)

(اور دیکھو) اللہ نے نافرمانی کرنے والوں کے لئے نوح اور لوط کی بیویوں کی مثال بیان کی ہے۔ یہ دونوں کی دونوں ہمارے بندوں میں سے دو (بہت ہی) نیک بندوں (پیغمبروں) کے نکاح میں تھیں۔ مگر انہوں نے ان دونوں (نیک بندوں) کی حق تلفی کی۔ پس خدا کے مقابلہ میں وہ دونوں ان کے کچھ بھی کام نہ آسکے۔ اور ان سے کہہ دیا گیا کہ تم بھی اور داخل ہونے والوں (کی طرح ان ہی) کے ساتھ جہنم میں داخل ہو جاؤ۔

اور (اس کے برعکس) اللہ نے ایمان لانے والوں کے لئے (بھی) فرعون کی بیوی کی مثال بیان کی ہے (جو ایک نہایت ہی سرکش اور نافرمان بندہ کے نکاح میں تھی، مگر مومن تھی)۔ جب اس نے اپنے پروردگار کے حضور عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میرے لئے اپنے ہاں جنت میں اندر ایک مکان بنا دے اور فرعون اور اس کے (بڑے) کردار سے مجھے نجات دے۔ (نہ صرف فرعون سے بلکہ ا مجھے (تمام) ظالم (اور سرکش) قوم سے ہی نجات عطا فرما!

دستانِ عبرت | یہ ہے قوم لوط کا واقعہ اور ان کا ایسا انجام جس میں ہر صاحبِ عقل و بصیرت کے لئے عبرت و مواعظت کی داستاںیں پوشیدہ ہیں! ان تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات اپنی ٹٹی ہوئی عظمتوں اور چھنی ہوئی ثروتوں کے زندہ مرثیے ہیں لیکن صرف ان کے لئے جو حیاتِ آخرت (یعنی قانونِ مکافاتِ عمل) پر ایمان رکھیں، ورنہ مٹی کے ڈھیر ہیں یا زیادہ سے زیادہ علمائے آثار و حضرات کی دلچسپیوں کا مرکز۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو سورہٴ نعلین میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُوطًا سِتْرًا لِّمَا ظَلَمَ ۗ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا مِّنْ قَوْمٍ مَّا تَبَعُواهُ يَكْفُرُونَ ۚ بَلْ كَانُوا لَا يَتَنَبَّأُونَ لَكُمْ سُرُورًا ۚ أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرْتَدَّوْنَ عَلَيْكُمْ ۚ

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ (یعنی مخالفین مکہ) اس بستی پر جس پر بڑی طرح پتھر برسائے گئے تھے (یعنی قوم لوط کی آبادی پر بار بار) گزر چکے ہیں۔ کیا یہ اس بستی کو (بار بار) دیکھ نہیں چکے ہیں؟ (یقیناً دیکھ چکے ہیں، مگر ان کے دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا)۔ بلکہ بات یہ ہے کہ وہ مکرر دوبارہ جی اٹھنے اور اپنے اعمال بد کا نتیجہ بھگتنے کی توقع ہی نہیں رکھتے۔

چونکہ ان لوگوں کا قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں، اس لئے ان ائمِ گذشتہ کے یہ نشانات ان کے لئے عبرت کا موجب نہیں بنتے۔

وَإِذَا رَأَوْكَ إِذْ يَتَخَيَّرُونَ ۚ لَوْ هُمْ شُرَكَاءُ فِي مَا عَصَوْا اللَّهَ ۚ لَأَسْرَبُوا ۚ أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرْتَدَّوْنَ عَلَيْكُمْ ۚ

(۲۵/۴۲ - ۴۱)

اور جب کبھی وہ تمہیں (اے پیغمبرِ اسلام!) دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق ہی بنا لیتے ہیں (اور انجام سے بالکل بے پروا ہو کر ایسے ایسے جملے چست کرتے ہیں کہ) "کیا یہی ہے وہ جسے خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ اگر تم مضبوطی سے قائم نہ رہے ہوتے تو اس نے ہمیں اپنے مہبودوں سے کھوی دیا ہوتا" (دیگرہ وغیرہ)۔

اس کے بعد فرمایا:-

وَسَوْفَ يَخْلُمُونَ جُنُوبَهُمْ ۚ إِنَّ الْعَذَابَ لَمُنِيعٌ ۚ

(۲۵/۴۲)

اور اے پیغمبرِ اسلام! تم گھبراؤ نہیں) انہیں تھوڑے ہی عرصہ میں معلوم ہو جائے گا جب وہ
(خدا کا) عذاب (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیں گے کہ (درحقیقت، صحیح راستہ سے کھویا ہوا
کون تھا؟) (وہ یا تم)۔

دیکھتے بوجھتے آنکھوں پر پردے اس لئے پڑ جاتے ہیں کہ انسان اپنی خواہشات کا محکوم و پرستار بن جاتا ہے۔
أَرَعَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ ۗ أَفَأَنْتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا
(۲۵/۲۳)

(اور اے پیغمبرِ اسلام! تم نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جنہوں نے اپنے جذبات ہی کو اپنا
خدا بنا رکھا ہے؟ کیا تم ان لوگوں پر نگران بن سکتے ہو؟) (ہرگز نہیں)۔
اور یہاں پہنچ کر اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ فہم و بصیرت کی تمام قوتیں اور سمجھنے بوجھنے کی تمام صلاحیتیں
رکھنے کے باوجود اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے اور یوں شرفِ انسانیت کھو کر حیوان بلکہ ان سے بھی گیا گزرا ہو
جاتا ہے۔

أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ ۗ إِنْ هُمْ إِلَّا
كَآلُ نَعَامٍ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا ۗ (۲۵/۲۴)

(اے پیغمبر! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر افراد کچھ سنتے اور سمجھتے بھی ہیں) (بالکل نہیں) (وہ تو
محض چوپایوں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔) (وہ کم از کم اپنی جبلت
پر تو چلتے ہیں)۔

سورۃ شعراء میں قومِ لوط کی تباہی اور ہلاکت کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

إِن رَفِي ذَلِكَ لَأَيُّةٌ ۗ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ۗ (۲۶/۱۴)

بلاشبہ اس میں ایک (زبردست) نشانی تھی۔ مگر (انہی کے لئے جو کچھ بصیرت رکھتے ہوں) ان

میں تو اکثر ایسے ہی ہیں جو ایمان والے (صاحبِ بصیرت) نہیں۔

وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ نے پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ قصص و وقائع ان لوگوں کے لئے
آئے ہیں کہ یہ سب سے نہیں بنتے کہ یہ لوگ اللہ کے قوانین پر ایمان نہیں رکھتے اور عقل و بصیرت سے کام نہیں
لیتے۔

وَلَقَدْ تَرَكْنَا مِنْهَا آيَةً بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ (۱۳۸/۳۵)

اور (دیکھو) ہم نے اس (تباہ شدہ) بستی میں سے (کچھ نہ کچھ) واضح نشانات چھوڑ دیئے (مگر ہر ایک کے لئے نہیں) صرف ان لوگوں کے لئے جو کچھ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔

اور اللہ کی ان نشانیوں سے آنکھیں بند کئے گذر جاتے ہیں۔

وَإِنَّمَا لَكُمْ لَلْمُرُودِنَ عَلَيْهِمْ مَّضْهِينَ ۖ وَبِالْآيِطِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۚ (۱۳۸-۱۳۷)

اور اے منکرینِ دعوتِ ایمانی! (حقیقت یہ ہے کہ تم ان (تباہ شدہ) بستیوں پر صبح (دن) کے وقت اور رات کے وقت (ہمیشہ ہی) گذرتے ہو) اور ان کی تباہی کے نمونے تمہاری آنکھوں کے سامنے آتے ہی رہتے ہیں (کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے؟)

اور قانونِ مکافات کی حکم گرفت سے نہیں ڈرتے۔

وَشَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ۗ (۱۳۷/۳۴)

اور (دیکھو) ہم نے ان لوگوں کے لئے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں اس بستی (یعنی قوم لوط کی آبادی) میں نشانیاں چھوڑ دی ہیں۔

یعنی صحیح علم و بصیرت اور عقل و فکر کا یہ تقاضا ہے کہ ان واقعات سے استقرانی طور پر اس نتیجہ پر پہنچا جائے کہ ان اقوامِ گذشتہ نے یہ کچھ کیا تو ان کا انجام یہ ہوا۔ اگر ہم بھی وہی کچھ کریں گے تو ہمارا بھی انجام ایسا ہی ہوگا۔ اس لئے کہ جس طرح فطرت کے اٹل قوانین دیگر اشیائے فطرت میں کار فرما ہیں، اسی طرح انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بھی قوانینِ خداوندی جاری و ساری ہیں۔ اگر پانی آج بھی اسی طرح نشیب کی طرف بہتا ہے جس طرح قوم لوط و عاد و ثمود کے زمانہ میں بہتا تھا تو آج غلط روش کے نتائج بھی وہی ہوں گے جو اس زمانہ میں ہوتے تھے۔ وَ كُنْ تَحَدًا لِّسُنَّةِ اللَّهِ تَتَّبِعِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۚ (۱۳۷/۳۳)

یہ ایک عام حقیقت ہے جس کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ اور ارسطو کے ذہن کی ضرورت نہیں۔ قانونِ فطرت کا ایک کھلا ہوا اور نہایت واضح گوشہ ہے جو ہر سلیم بالطبع انسان کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ اسی لئے سورہ قمر میں اُممِ گذشتہ کے احوال و ظروف اور ان کے اعمال کے نتائج و عواقب بیان کرتے ہوئے ہر کڑی کے بعد فرمایا کہ

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ ۚ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ ۗ (۱۳۷/۳۳)

اور حقیقت یہ ہے کہ نصیحت حاصل کرنے کے لئے ہم نے قرآن کو (بہت ہی) آسان کر دیا ہے۔
 تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟ (جو اس سے نصیحت حاصل کر لے)۔

یہ ہے تذکرہ جلیلہ حضرت لوط کا جنہیں اللہ نے حکم و علم عطا فرمایا۔
 وَ لُوطًا اَتَيْنَاهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّ جَعَلْنَاهُ مِنَ الْقَرَبِيِّ اَلَّتِي كَانَتْ
 تَعْمَلُ الْفَحْشٰى اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا سُوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۝ (۲۱/۷۴)
 اور (اسی طرح) لوط کو بھی ہم نے (احکام حق دینے کا) منصب اور (نبوت کا) علم عطا فرمایا۔ ہم
 نے اس بستی سے اسے نجات دیدی جس کے باشندے بڑے ہی گندے کام کیا کرتے تھے اور
 کچھ شک نہیں، بڑے ہی بد راہ، حد سے گزرے ہوئے لوگ تھے۔

اور ان کا شمار اپنے منتخب بندوں میں کیا۔ (۲۴/۵۹)

لیکن اس کے برعکس ذرا تورات کو اٹھا کر دیکھتے اور پھر غور کیجئے کہ اللہ کے ان
تورات کا بیان | برگزیدہ رسولوں کی سیرت کو کس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب پیدائش باب ۱۱

آیت ۲۳ میں حضرت لوط کو نیچو کار کہا گیا ہے۔ لیکن چار ہی قدم آگے چل کر یہ قصہ بھی مذکور ہے۔
 اور لوط ضنغر سے اپنی دو بیٹیوں سمیت نکل کر پہاڑ پر جا رہا۔ کیونکہ ضنغر میں رہنے سے اسے دشمنیت
 ہوئی اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگیں۔ تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ
 ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو تمام جہان کے دستور کے موافق ہمارے پاس
 اندر آئے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مٹے پلائیں اور اس سے ہمبستر ہوں تاکہ اپنے باپ سے نسل
 باقی رکھیں۔ سو انہوں نے اسی رات اپنے باپ کو مٹے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے
 ہمبستر ہوئی۔ پر اُس نے اس کے لیٹتے اور اُٹھتے وقت اسے نہ پہچانا۔ اور دوسرے روز ایسا ہوا
 کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہمبستر ہوئی۔ آج رات بھی اس کو
 مٹے پلائیں اور تو بھی جا کے اس سے ہمبستر ہو کہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اس رات
 کو بھی انہوں نے اپنے باپ کو مٹے پلائی اور چھوٹی اُٹھ کے اس سے ہمبستر ہوئی اور اس نے
 اس کے لیٹتے اور اُٹھتے وقت اُسے نہ پہچانا۔ سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ

ہوتیں اور بڑی ایک بیٹا جنی اس کا نام ہوا آب رکھا اور قبی مو آبیوں کا جواب تک میں باپ ہوا اور چھوٹی بھی ایک بیٹا جنی اور اس کا نام بن عتی رکھا۔ وہ بنی عمون کا جواب تک میں باپ ہوا۔

(پیدائش ۳۰-۳۸/۱۹)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی خرافات کا نقل کرنا بھی قارئین کے ذوقِ سلیم کے منافی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ے لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا
اس قسم کے تقابل کے بغیر یہ حقیقت اجاگر ہو نہیں سکتی کہ سابقہ ”کتبِ آسمانی“ کی موجودگی میں خدا کی طرف سے ایک ”نئی کتاب“ (قرآن مجید) کی کیا ضرورت تھی؟ سابقہ ”کتبِ آسمانی“ کے ان بیانات سے محرف اور خالص پیغامِ خداوندی کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔

بیٹیوں سے مراد | قرآنِ کریم میں قومِ لوط کی عبرت انگیز داستان اتنی ہی مذکور ہے لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر دو ایک مقامات پر خود کرنا ضروری ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ

جب بستی کے لوگوں نے ضیوفِ حضرت لوط کو آن گھیرا ہے تو حضرت لوط نے ان سے کہا کہ
يَقَوْمِ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ
فِي صَيْغِي ۝ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَسِيْدٌ ۝ (۱۱/۷۸)

لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں! یہ تمہارے لئے جائز اور پاک ہیں۔ پس ان کی طرف تلفت ہو۔
(دوسری بات کا قصہ کرواوا) اللہ سے ڈرو۔ میرے بہانوں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں؟

دیگر مقامات میں بھی یہی الفاظ آتے ہیں۔ (۱۱/۷۹؛ ۱۵/۷۱)۔

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت لوط نے انہیں اپنی بیٹیوں کی طرف کیوں متوجہ کیا؟ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنی بیویوں کو چھوڑ رکھا تھا۔

وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ (۲/۵۵؛ ۴/۸۱؛ ۲۶/۱۶۶)

(تم پر حیف ہے کہ تم یہ بد عملی کی راہ اختیار کرتے ہو) اور تمہارے پروردگار نے جو تمہارے لئے تمہاری

بیویاں پیدا کی ہیں انہیں چھوڑ دیتے ہو۔

اور خواہشاتِ نفس کی تسکین کے لئے مردوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ حضرت لوط انہیں اس غلامِ فطرت خبیثانہ فعل سے روکتے تھے اور فطرت کی صحیح راہوں کی طرف ان کی توجہ ملتفت کراتے تھے۔ اس خاص مقام پر بھی آپ نے اپنی اس دعوت کو دہرایا اور ان سے کہا کہ اس حماقت سے کیا حاصل! تمہارے لئے تمہاری بیویاں (بستی کی عورتیں) پاک و صاف موجود ہیں۔ ان کی طرف رجوع کیوں نہیں کرتے؟

بستی کی عورتوں کو آپ نے بیٹیاں کہا۔ ایک مرد بزرگ و پاک باز کے نزدیک بستی کی عورتیں بمنزلہ بیٹیوں کے ہوتی ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ باوجودیکہ حضرت لوط اس قوم میں ایک اجنبی کی حیثیت رکھتے تھے، قرآن کریم نے انہیں قوم لوط کا بھائی [اَخُوهُم] = ان کا بھائی (۲۶/۱۶۱) کہا ہے اور اس برباد ہونے والی قوم کو لوطیوں کو (۵۰/۱۳) کہہ کر پکارا ہے۔ اسی نسبت سے حضرت لوط نے بستی کی عورتوں کو جنہیں ان بد بختوں نے چھوڑ رکھا تھا، اپنی بیٹیاں کہہ کر پکارا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن کے نزدیک (اپنی بیوی کو چھوڑ کر) دنیا کی تمام عورتیں اپنی بیٹیوں، بہنوں اور ماؤں کے برابر ہوتی ہیں۔

یہ مہمان کون تھے؟ دوسرا غور طلب مقام یہ ہے کہ حضرت لوط کے مہمان (بلکہ یوں کہیے کہ ضیوفِ ابراہیمی) کون تھے؟ قرآن کریم نے انہیں اللہ کے فرستادہ (مرسلین) کہہ کر پکارا ہے اور اس کی کہیں تصریح نہیں کہ وہ فرشتے تھے۔ لیکن جس انداز سے قرآن کریم نے مختلف مقامات پر ان کا ذکر کیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ بارگاہِ ایزدی میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ مثلاً سورہ ہود میں کہا کہ

وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا اِبْرٰهٖمَ بِالْبٰشِرٰی (۱۱/۴۹)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے بھیجے ہوئے (قاصد) ابراہیم کے پاس خوشخبری

لے کر آئے تھے۔

یہی کچھ سورہ عنکبوت (۲۹/۳۱) میں آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ خدا کے فرستادہ تھے جو حضرت

ابراہیمؑ کے پاس بیٹے کی پیدائش کی بشارت لے کر آئے تھے۔ سورۃ ہود میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کو ہم نے بشارت دی۔

وَأَمْرَاتُهُ قَائِمَةٌ فَضِحَّكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ ۗ وَمِنْ وَرَآءِ
إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ ۝ (۱۱/۴۱)

اور اس کی بیوی (سارہ) بھی (خیمہ میں) کھڑی (سُن رہی) تھی۔ وہ ہنس پڑی (یعنی اندیشے کے دور ہو جانے سے خوش ہو گئی)۔ پس ہم نے اسے (اپنے فرستادوں کے ذریعہ) اسحاق (کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی اور اس کی کہ اسحاق کے بعد یعقوب کا ظہور ہوگا۔

اور دوسرے مقامات پر ہے کہ ان فرستادگانِ بارگاہِ ایزدی نے کہا کہ ہم تمہیں بشارت دیتے ہیں۔

قَالُوا لَا تَخَفْ ۗ وَبَشِّرْ ذَكَرًا بِعِلْمٍ عَلَيْهِ (۱۱/۴۱)

انہوں نے کہا "ڈرو مت۔ ہم تو تمہیں ایک علم والے فرزند کی پیدائش کی خبر سناتے ہیں۔"

ان مقامات میں تطبیق مشکل نہیں۔ بشارت ان فرستادگان کی زبان سے دی گئی تھی اس لئے اسے ان کی طرف منسوب کیا گیا۔ لیکن چونکہ یہ بشارت ان کی اپنی طرف سے نہیں تھی بلکہ یہ صرف اس کے پہنچانے والے تھے اس لئے (۱۱/۴۱) میں اس بشارت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر لیا۔

اسی طرح قومِ لوط پر عذابِ خداوندی کے متعلق بھی دونوں نسبتیں پائی جاتی ہیں۔ سورۃ حجر میں ہے

کہ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا۔

قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ ۗ وَإِنَّا لَنُؤْطِئُهُمْ إِنَّا
لَمُنَجِّوهُمْ أَجْمَعِينَ ۗ وَإِنَّا لَمُنَجِّوهُمْ أَجْمَعِينَ ۗ قَدْ زُكِيَ ۗ إِنَّهَا لَمِنَ
الْغَٰفِرِينَ ۗ (۱۵/۶۰-۵۸)

انہوں نے کہا "ہم ایک مجرم گروہ کی طرف بھیجے گئے ہیں (کہ ہلاک ہونے والا ہے) مگر (ہم) ایک خاندان (وہاں) لوط کا ہے اس کے تمام افراد کو ہم بچالیں گے۔ البتہ اس کی بیوی نہیں بچے گی۔ اس کے لئے ہمارا اندازہ ہو چکا کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں کا ساتھ دے گی۔"

پہلی آیت میں ہے کہ "ہم قومِ لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔" اس سے آگے ہے کہ "ہم آلِ لوط کو نجات دیں گے۔" اس سے اگلی آیت میں ہے کہ یہ "ہمارا اندازہ ہے کہ حضرت لوط کی بیوی تباہ ہونے

دلوں میں سے ہوگی۔ اسی طرح دیگر مقامات میں ہے (دیکھئے ۲۳-۳۲/۵۱؛ ۳۱-۳۲/۲۹؛ ۲۳-۲۴/۲۹)۔ ان تمام مقامات میں قوم لوط پر عذاب نازل کرنے اور متبعین حضرت لوط کو نجات دینے کی نسبت ان فرستادگان کی طرف کی گئی۔ لیکن دوسرے مقامات پر اس نسبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف بیان فرمایا ہے۔ مثلاً سورۃ اعراف میں فرمایا:-

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا ۙ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ۝ (۷۸۴)

ہم نے ان پر (پتھروں کا) مینہ برسایا تھا۔ سو دیکھو، مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟

نیز (۸۲/۱۱؛ ۲۴/۵۴؛ ۸۴/۶)۔

ان مقامات میں بھی کوئی الجھاؤ نہیں۔ قوم لوط پر عذاب اور جماعت مومنین کی اس سے رستگاری، دونوں اللہ کے قانونِ مکافات کے تابع تھے۔ لیکن یہ فرستادگان چونکہ اس مقصد کے لئے مامور تھے کہ ان کے ذریعے اس سرکش قوم پر تمام حجت ہو اور متبعین حضرت لوط اس عذاب سے محفوظ رکھے جائیں، اس لئے انہوں نے ان امور کو اپنی طرف منسوب کیا جیسے جب کوئی مامور من اللہ (رسول) اپنی قوم سے کہتا ہے کہ ”میری بات سنو، تو اس سے مقصود پیغامِ خداوندی ہوتا ہے یا وہ کہتا ہے کہ ”میری اطاعت کرو، تو اس سے مفہوم اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں سورۃ ہود کی ان آیات پر بھی غور کیجئے جن میں ذکر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب ان فرستادگان سے سنا کہ وہ قوم لوط کی تباہی کے لئے مامور ہو کر جا رہے ہیں تو آپ نے چاہا کہ کسی طرح اس قوم پر سے عذاب ٹل جائے اور انہیں مزید مہلت مل جائے تاکہ (شاید) وہ اس دوران اپنی اصلاح کر سکیں یہ سب باتیں ”فرستادگان“ سے ہو رہی تھیں اور انہوں نے بھی جواب میں کہا تھا کہ

يَا بُرْهِيْمُ اٰغْرِضْ عَنَّا هٰذَا ۙ اِنَّكَ قَدْ جِئْتَ اٰمْرًا رٰسِخًا ۙ (۱۱)

اے ابراہیم! اس بات کا خیال چھوڑ دے۔ تیرے پروردگار کا امر آ رہا ہے

لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی اس درخواست کے متعلق کہا ہے کہ

يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوٰطٍ ۙ (۱۱/۷۴)

اس نے قوم لوط کے بارے میں ہم سے سوال جواب شروع کئے۔

اس لئے کہ کسی مامور سے امر کے متعلق کچھ کہنا، دراصل صاحبِ امر سے کہنے کے مرادف ہے۔ مامور

تو پیغامبر ہوتا ہے۔ پیغام کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا وہ صاحب پیغام (جس کی طرف سے پیغام آیا ہے) سے ہی متعلق ہوگا۔ اللہ اور اس کے رسولوں کے اس باہمی تعلق کو پیش نظر رکھنے سے انسان بہت سی غلط فہمیوں سے بچ سکتا ہے۔

خلاصہ مباحث

آج سے قریب چار ہزار سال پہلے، جبکہ دنیا کا بیشتر حصہ، جہالت اور وحشت کی تاریکیوں کی چادر میں لپٹا ہوا تھا، سرزمین بابل اپنے مخصوص تمدن کی درخشندگی سے ہر دیکھنے والے کی نگاہوں میں چمکا چو نہ پیدا کر رہی تھی۔ تہذیب و تمدن کے عروج کا تو یہ عالم تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہر دیدہ بینا کے لئے وجہ صد استعجاب تھی کہ وہی سر جو اپنی ندرت کاریوں سے خاک کے ذروں کو آسمان کی بلندیوں تک لیجانا چاہتے تھے خود اجرام سماوی اور ان کی مٹی اور پتھر کی صورتوں کے سامنے سجدہ ریز تھے! یہ تضاد کچھ بابل اور نینوا ہی سے مخصوص نہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں جہاں جہاں تہذیب کی بنیادیں تنہا عقل انسانی پر استوار ہوئی ہیں، مادی ترقی اور زندگی کے حقائق سمجھنے میں ایسا ہی بُعد اور تضاد رہا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی قوم اپنے ہاتھوں سے تراشیدہ صورتوں (یا اپنے فکر کی کارگاہ میں ڈھلے ہوئے بتوں) ہی کو اپنا موجود سمجھ لے تو اسے دنیائے انسانیت میں سرفرازی کس طرح نصیب ہو سکتی ہے؟ چنانچہ اہل بابل اس شرک جلی کے ساتھ ساتھ لوکیت اور برہمنیت کے شرک نخی کی لعنتوں میں بھی گرفتار تھے۔

یہ تھا وہ ماحول جس میں اور کے ایک بڑے بچاری کے گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا جسے دنیا نے آگے چل کر ایک بہت بڑے توحید پرست اور بت شکن کی حیثیت سے پہچانا۔ ان کا ایم گرامی حضرت ابراہیم تھا۔ آپ نے اپنے اس علم حقیقی کی بنا پر جو سرچشمہ وحی سے عطا ہوا تھا اپنے گھرانے کے افراد، قوم کے اراکین، بت کدہ کے عمائدین اور خود مستبد بادشاہ وقت کو اجرام فلکی اور بتوں کی پرستش پر سرزنش کی اور انہیں ان کے برعکس، خدائے واحد کی عبودیت اختیار کرنے کی دعوت دی۔ چونکہ اپنے معبودان باطل کی عقیدت ان لوگوں کے خون کے ذرات تک میں حلول کر چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس روش کو اسلاف کی طرف سے سند موروثیت بھی حاصل ہو چکی تھی، اس لئے اپنے سریر گلانے، ہر ایک نے اس "انوکھی" تعلیم کی مخالفت کی۔

جوں جوں ان کی طرف سے مخالفت بڑھتی جاتی تھی یہ معلّم توحید اپنی دعوت کے پیش کرنے کے اسلوب و انداز بدلتا جاتا تھا، تاکہ اگر ایک پہلو سے نہیں تو کسی دوسرے پہلو سے، سی بات ان کی سمجھ میں آجائے۔ لیکن بات تو اس کی سمجھ میں آیا کرتی ہے جو بات سمجھنے کی کوشش کرے۔ جو بات کو اس مفروضہ کے ماتحت سننے کہ یہ ہے ہی غلط، بات کی صداقت اس کی سمجھ میں کس طرح آ سکتی ہے؟ لیکن آپ کے دلائل ایسے محکم اور انداز موعظت و تذکیر ایسا مسکت تھا کہ ان سے مقابلہ میں کوئی جواب نہ بن پڑتا اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی مستبد قوم لاجواب ہو جائے تو وہ کیا کیا کرتی ہے؟ انہوں نے یہ سب کچھ کیا لیکن یہ اپنے مقام سے ذرا بھی نہیں ہٹے۔ جب آپ نے یقینی طور پر سمجھ لیا کہ اس قوم میں قبولیتِ حق کی صلاحیت ہی نہیں تو آپ نے اس سرزمین کو چھوڑا، تاکہ کوئی اور ایسا خطہ تلاش کیا جائے جس میں حق و صداقت کی بار آوری کی استعداد موجود ہو۔ چنانچہ آپ نے اپنے برادر زادہ (حضرت ہوٹ کے ساتھ) جنہیں بعد میں اللہ نے مشرفِ نبوت سے نوازا تھا۔ اس ملک کو چھوڑا اور حالات کے مطالعہ اور معائنہ کے بعد سرزمینِ فلسطین میں متمکن ہو گئے۔ یہیں کبرئیی کے عالم میں مبدار فیض نے انہیں حضرت اسمعیلؑ جیسا فرزند عطا فرمایا جسے بعد میں اللہ نے تولیتِ کعبہ کی خدمتِ عظیمہ کے لئے مختص کر لیا۔ حجاز کی بے برگ و گیاہ زمین میں انہی باپ بیٹے نے ”اللہ کے گھر“ کی دیواریں بلند کیں۔ آپ نے حضرت اسمعیلؑ کو وہیں بسا دیا اور خود حضرت اسحاقؑ کے ساتھ فلسطین واپس تشریف لے آئے جہاں آپ کی اولاد ”بنی اسرائیل“ کے نام سے تاریخ کے صفحات پر ابھرے ہوئے نقوش کی صورت میں دنیا سے متعارف ہوئی۔

یوں تو دنیا میں ہر رسول کی بعثت کا مقصد دعوتِ توحید ہوتا ہے لیکن جس نامساعد ماحول میں حضرت ابراہیمؑ نے اس شد و مد سے اپنی دعوت کو پیش کیا اس کے پیش نظر قرآن نے آپ کی اس خصوصیت کبریٰ کو نمایاں طور پر اجاگر کیا ہے۔ کہیں ایجابی انداز سے یہ کہہ کر کہ وہ ملتِ موحدہ کے مورثِ اعلیٰ تھے اور کہیں اس اعتبار سے کہ (بقول بیگل) ”اشیاء اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں“ اس قسم کے سلبی انداز سے کہ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے اس حقیقت کو بھی نمایاں طور پر بیان کیا ہے کہ آپ ہی کا مسلک بنی اسرائیل کا سچا مذہب تھا اور اس کے بعد مُحَمَّدٌ عَرَبِيٌّ نے بھی اسی ملتِ ابراہیمیٰ کا احیاء اور اتباع کیا۔ اس اعتبار سے دنیا میں توحید کے جس انقلابِ عظیم کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ کے مقدّس ہاتھوں رکھی گئی تھی اس کی تکمیل نبی اکرمؐ کی باطل شکن دعوت سے ہوئی۔ قرآن کریم نے حضرت

ابراہیم کی انہی خصوصیات کو نمایاں طور پر پیش کیا ہے اور ان کی سیرت کے مختلف گوشوں کو اس حسین انداز سے سامنے لایا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ آج بھی ہمارے بزرگ خاندان کی حیثیت سے ہم میں چلتے پھرتے ہیں۔

اس کے برعکس تورات کو دیکھتے تو اس میں آپ کی حیثیت ایک قبیلہ کے سردار سے کچھ زیادہ نظر نہیں آتی۔ لیکن یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ دورِ حاضرہ کی تحقیقات اسی مقام ابراہیمی کی تصدیق کر رہی ہیں جسے قرآن نے پیش کیا تھا۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار "ابراہیم" کے عنوان کے ماتحت لکھتا ہے:

ایک خدائے عظیم جو عرش کی بلندیوں پر مستوی ہے جس کی عظمت کو برہمن اور میکہ کی دستا کے بغیر ثابت کیا جاسکتا ہے، خدائے مطلق محیطِ کل، وہ ذات جس تک ہر مومن کی رسائی ممکن ہے۔ یہ ہے ابراہیم کا خدا۔ (اور حقیقت یہ ہے کہ) روایات کی تفصیل کی بہ نسبت ہمارے نزدیک حضرت ابراہیم کا یہ کا نام زیادہ اہم ہے۔

یہ ہوتی ایک خصوصیت۔ دوسری خصوصیت۔

ابراہیم، اسرائیلیوں کی ملت (مذہب) کا مؤسس تھا۔

اور تیسری خصوصیت۔

(حضرت) محمدؐ کی طرح آپ سے دو ہزار سال قبل، سامی اقوام و قبائل میں (حضرت) ابراہیم بھی ایک عظیم الشان تحریک کے قائد تھے۔

یہ تھے حضرت ابراہیم (علیہ السلام)۔

خلاصہ مبحث (حضرت لوط)

جب حضرت ابراہیمؑ فلسطین میں متمکن ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت لوطؑ کو سدوم کے علاقہ کے لوگوں کی اصلاح کے لئے منتخب کیا اور آپ اُدھر تشریف لے گئے۔ یہ تو قرآن کا بیان ہے لیکن تورات، حسب دستور اس واقعہ کو بھی "قبائلی مناقشات" کے رنگ میں پیش کرتی ہے۔ چنانچہ کتاب پیدائش کے تیرھویں باب میں مذکور ہے:-

اور ابراہیم کے چرواہوں اور لوط کے چرواہوں میں جھگڑا ہوا..... تب ابراہیم نے لوط سے کہا کہ میرے اور تیرے درمیان اور میرے چرواہوں اور تیرے چرواہوں کے درمیان جھگڑانا نہ ہو اگر سے کہم چھاتی ہیں..... اپنے تئیں مجھ سے جدا کیجئے۔

(پیدائش ۷-۱۳/۹)

اسی طرح قرآن کریم میں ہے کہ چونکہ حضرت لوطؑ کی بیوی ایمان نہ لائی تھی اس لئے وہ بھی جماعت منکرین کے ساتھ ہلاک ہو گئی۔ لیکن تورات کا بیان ہے کہ آپ کی بیوی آپ کے ساتھ ہی اس بستی سے محفوظ نکل آئی تھی۔ لیکن آگے آکر

اس کی جورو نے اس کے پیچھے پھر کر دیکھا اور

وہ نمک کا کھبا بن گئی۔ (پیدائش، باب ۱۹، آیت ۲۶)

قوم لوط کی حیا سوز فحاشی دنیا میں بطور ضرب المثل مشہور ہے۔ تورات کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ وبا وہاں سے آگے بڑھی اور یہودیوں میں بھی پھیل گئی۔ چنانچہ اس کے خلاف حکم نافذ

کرنا پڑا۔ کتاب اجبار میں ہے۔

تو مرد کے ساتھ، جس طرح عورت کے ساتھ سوتا ہے مت

سو۔ یہ مکروہ ہے۔ (باب ۱۸، آیت ۲۲)

قرآن کریم نے قوم لوط کی جن بستیوں (سدوم اور عمارہ وغیرہ) کی بربادی کا ذکر کیا ہے وہ بھرمیت کے ارد گرد واقع تھیں۔ دورِ حاضرہ کے اثری اور تاریخی اکتشافات سے اس کی تصدیق ہوتی جا رہی ہے۔ تفصیل کے لئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجز اینڈ ایٹھکس میں سدوم (SODOM) اور بھرمیت (DEAD SEA) کے عنوانات دیکھئے۔



وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ (۱۲۶)

جمالِ یوسف

حسنِ سیرت کی رعنائیاں

نور و نہجرت کی داستانِ خموش!

حضرت یوسف علیہ السلام

گذشتہ ابواب میں حضرات انبیائے کرام کے جو احوال و کوائف ہمارے لئے وجہ نورانیت قلب و نظر ہوئے ہیں وہ قرآن کریم کے صفحات پر پر اگندہ موتیوں کی طرح بکھرے پڑے تھے جنہیں مختلف گوشوں سے چُن چُن کر ایک سلک گہوار میں پرویا گیا۔ لیکن نور و نجات کی جو مقدس داستان اس وقت ہمارے لئے جنتِ نگاہ بن رہی ہے، وہ اس صحیفہ آسمانی کے ایک ہی باب میں سلسلۃ الذب کی طرح مسلسل بیان ہوئی ہے۔ سابقہ انبیائے کرام کے تذکارِ جلیلہ، درحقیقت ان اقوام و ملل کے احوال و ظروف کے ساتھ منسلک تھے جو ان کی دعوتِ رشد و ہدایت کی مخاطب تھیں اور ان کے بیان کرنے سے مقصود یہ بتانا تھا کہ وہ اقوام، قوانین خداوندی کی تکذیب سے کس طرح تباہ و برباد ہو گئیں، موجودہ داستانِ زرین اس حقیقت کی مظہر ہے کہ ایک فرد کے جو ہر ذاتی یعنی اس کے حُسنِ عمل کی قوت اور سیرتِ اذکار کی فیصلت اسے کس طرح خاکِ نشینی سے اٹھا کر مدارج و مناصب کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیتے ہیں لیکن یہ راہِ صحنِ گلستان کی روش نہیں کہ جس میں انسان رنگینیِ بہار کے جھولے جھولتا، مچلتا لوٹتا، اٹھکھیلیاں کرتا بڑھتا چلا جائے۔ یہ وہ کٹھن راستہ ہے جہاں قدم قدم پر ایسی صبر آزما اور نظر فریب لغزش کی گھاٹیاں آتی ہیں کہ جہاں سے ذرا پاؤں پھسلا اور انسان سیدھا ذلت و خواری کے جہنم میں جاگرا۔ اس راستہ سے ہر کانٹے سے دامن بچاتے اور ہر گھاٹی سے قدم سنبھالتے مردانہ و صحیح سلامت آگے بڑھ جانا یقیناً من عزم الامور ہے۔ یہ ہے وہ راستہ جس میں ہر چشم بصیرت کو گوشے گوشے میں جمالِ یوسف کی رعنائیاں جلوہ باز نظر آتی ہیں اور وہ قدم قدم پر ان کے نقوشِ پاکے

متبتم ذرات کو دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھتی ہے کہ
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی!

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ و جلع و فرات کی شاداب (لیکن خزاں در آستیں)
واد یوں اور بابل و نینوا کی پُرشکوہ (لیکن فنا در آشوش) آبادیوں سے ہجرت کر کے فلسطین کے علاقے
میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، جہاں عام ذریعہ معاش گلہ بانی تھا۔ اس علاقے میں حضرت اسحقؑ نے
عمر بسر کی اور یہیں اُن کے بیٹے حضرت یعقوبؑ متمکن رہے۔ چوپانوں کے اسی مویشی چرانے والے
قبیلہ میں حضرت یوسفؑ کی پیدائش ہوئی جنہوں نے اپنی زندگی کے قریب سولہ سترہ برس اسی بیابان
میں بسر کئے۔

لورج جہیں میں مستقبل کا آئینہ لوگ اس بچے کو عام چرواہے سے زیادہ کچھ نہیں جانتے

تھے لیکن باپ (حضرت یعقوبؑ) کی حقیقت میں
نگاہیں بیٹے کی پیشانی میں کچھ اور ہی جھلکتا دیکھ رہی تھیں۔ وہ اس کی خداداد ذہانت و فطانت اور سنجیدگی
و متانت سے اس کی لورج جہیں پر کھلے کھلے الفاظ میں پڑھ رہے تھے کہ دایہ فطرت اُسے کس طرح
مویشیوں کی پاسبانی سے جہاں داری و جہاں بانی کے طور پر سیکھا رہی ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر
بیٹا باپ کی آنکھوں کا تارا بن رہا تھا۔ لیکن یہ چیز دوسرے بھائیوں کی آنکھ میں کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی یہیں
سے اس قصے کی ابتداء ہوتی ہے۔

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا
وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ۝ (۱۲/۴)

اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ یوسف نے اپنے باپ سے کہا "اے میرے باپ! میں
نے (خواب میں) دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند اور یہ سب میرے سامنے

لے تورات بتاتی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے (مختلف بیویوں سے) بارہ بیٹے تھے جن میں حضرت یوسفؑ
اور بن یامین حقیقی تھے اور یامین سب سے چھوٹے تھے۔ اس لئے حضرت یوسفؑ کی طرف باپ کا میلانِ خصوصی،
سو پیٹے بھائیوں کی آتشِ حسد و رقابت کا موجب بن گیا تھا۔

سجدہ ریز ہیں۔

قَالَ يَبْنَئِي رَوْ لَقَّصُصُ رُؤْيَاكَ عَلَيَّ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا
إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ (۱۲/۵)

(باپ نے کہا) "اے میرے بیٹے! اپنے اس خواب کا حال اپنے بھائیوں سے نہ کہہ دیجو کہ وہ تیرے خلاف کسی منصوبہ کی تدبیریں کرنے لگیں۔ یاد رکھو! شیطان (حد و عداوت کا جذبہ) انسان کا صریح دشمن ہے۔"

دیکھتے! بیٹوں کے حسد کو کس طرح "شیطان کی عداوت" کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔ یہاں سے "شیطانی" دسواس و مکائد کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے "ابلیس و آدم")۔ یہ تاکید کی اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ انھیں حضرت یوسفؑ کا مستقبل کس قدر درخشندہ نظر آ رہا تھا۔
فرمایا:

وَ كَذَلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ
وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَ عَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا أَتَمَّهَا عَلَىٰ
أَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَ إِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ
حَكِيمٌ ۝ (۱۲/۶)

اور (اے میرے بیٹے!) جس طرح تو نے دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور سورج چاند تیرے آگے جھکے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ خدا تجھے کسی عظیم مقصد کے لئے منتخب کرے گا اور تجھے اس قسم کی فراست و بصیرت عطا کرے گا جس سے تیری نگاہ معاملات کے انجام و نال تک پہنچ جائے۔ نیز جس طرح وہ اب سے پہلے تیرے بزرگوں، ابراہیم اور اسحاق پر اپنی نعمت پوری کر چکا ہے، اسی طرح تجھ پر اور یعقوب کے گھرانے پر بھی پوری کرے گا۔ بلاشبہ تیرا پروردگار (سب کچھ) جاننے والا اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت والا ہے۔

"تاویل الاحادیث" سے کیا مفہوم ہے؟ اس کی تشریح اخیر میں آئے گی۔ اس امر کی تصریح بھی اپنے موقع پر آجائے گی کہ حضرت یوسفؑ پر اتمام نعمت کس طرح ہوا۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں میں جو کچھ گزری اس کی تفصیل مذکور ہے، جس کے متعلق فرمایا کہ اس میں

ہر متجسس حقیقت اور جوہیائے صداقت کے لئے نشانیاں ہیں۔

لَقَدْ كَانَ رِيفِي يُوسُفَ وَ إِخْوَتِهِ اَيْتٌ لِّلسَّآءِلِيْنَ ۝ (۱۲/۷)
 جو لوگ (حقیقتِ حال) پوچھنے والے ہیں (اگر وہ سمجھیں تو ان کے لئے یوسف اور ان کے
 بھائیوں کے معاملہ میں) موعظت و عبرت کی بڑی ہی نشانیاں ہیں!

برادران یوسفؑ کی آتشِ حسد | حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے جذباتِ حسد و عداوت
 کو باپ سے جدا کر دیا جائے۔

اِذْ قَالُوا لِيُوسُفُ وَ اٰخُوهُ اَحَبُّ اِلٰى اٰبِنَا مِمَّا وَ تَحْتِ
 عَصِيْبَةٍ ۝ اِنَّ اٰبَانَا لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ نَقْتُلُوْا يُوسُفَ وَ اَوٰطِرُوْهُ
 اَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اٰبِيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْ بَعْدِهَا قَوْمًا
 صٰلِحِيْنَ ۝ (۱۲/۹ - ۸)

اور جب ایسا ہوا تھا کہ (یوسف کے بھائی آپس میں) کہنے لگے ”ہمارے باپ کو یوسف
 اور اس کا بھائی (بن یامین) ہم سب سے زیادہ پیارا ہے۔ حالانکہ ہم ایک پوری جماعت ہیں۔
 (یعنی ہماری اتنی بڑی تعداد ہے) اور یقیناً ہمارا باپ صریح غلطی پر ہے۔

پس (بہتر یہ ہے کہ) یوسف کو مار ڈالیں یا کسی جگہ پھینک آئیں، تاکہ ہمارے باپ کی
 توجہ ہماری ہی طرف رہے اور اس کے نکل جانے کے بعد ہمارے سارے کام سدھ جائیں اور
 یہ اونچ نیچ باقی نہ رہے۔

تورات میں ہے کہ ان میں سے ایک بھائی (روبن) نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو! اندھے کنویں میں ڈال
 دو۔ قرآن کریم میں ہے:

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيْبَتِ الْوَجْبِ
 يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّآرَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝ (۱۲/۱۰)

ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا ”بھئی، یوسف کو قتل مت کرو۔ اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے
 تو کسی اندھے کنویں میں ڈال دو۔ (گڈرنے والے قافلوں میں سے کوئی قافلہ اس پر سے

گذرے گا اور) اسے نکال لے گا۔

یہ تجویز طے پاگئی تو وہ سب باپ کے پاس آئے۔

سازش | قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلَىٰ يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُونَ

اُدْسِلُهُ مَعَنَا غَدًا يَتَزَنَعُ وَ يَلْعَبُ وَ اِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ (۱۱-۱۲/۱۲)

اور اس سے کہا "اے ہمارے باپ! کیوں آپ یوسف کے بارے میں ہمارا اعتبار نہیں

کرتے؟ اور ہمارے ساتھ کہیں آنے جانے نہیں دیتے؟ حالانکہ ہم تو اس کے دل سے خیر خواہ

ہیں۔ کل ہمارے ساتھ اُسے (جنگل میں) جانے دیجئے کہ کھائے پئے، کھیلے کودے۔ ہم اس کی

حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔"

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ کو تربیتِ خصوصی کے پیشِ نظر اپنے سے جدا نہیں کیا

کرتے تھے۔ لیکن ان کے دوسرے بیٹے اسے عدم اعتماد پر محمول کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ آپ

اس کے بارے میں ہم پر اعتماد کیوں نہیں کرتے؟ اس پر حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ تم پر بے اعتمادی نہیں بلکہ:

قَالَ اِنِّي لَيَخْشَىٰ نُبِيَّ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَاثُ اَنْ يَّاْكُلَهُ

الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ۝ (۱۲/۱۳)

مجھے خطر ہے کہ تم اسے اپنے ہمراہ لے جاؤ اور اسے بھڑیا کھالے اور تم اس سے غافل ہو۔

قرآن کریم نے اس کی تصریح نہیں کی کہ اُس وقت حضرت یوسفؑ کی عمر کیا تھی۔ اس حدیث سے اندازہ

ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی عمر اس وقت کچھ زیادہ نہ ہوگی۔ لیکن تورات کا بیان ہے کہ اس وقت آپ

کی عمر سترہ برس کی تھی۔

یعقوب کا احوال یہ ہے کہ یوسف سترہ برس کا ہو کے اپنے بھائیوں کے ساتھ گلہ چراتا تھا۔ اور

وہ جو ان اپنے باپ کی جو روؤں بلہاہ اور زلفہ کے بیٹوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اور یوسف ان کے

باپ پاس ان کے بڑے کاموں کی خبر لاتا تھا۔ (پیدائش ۳۷/۲)

اگر یہ بیان صحیح ہے تو پھر قیاس یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ زیادہ وقت باپ ہی کے پاس رہتے ہوں گے

اور جنگل کی زندگی کے عادی نہیں ہوں گے۔ اسی لئے باپ نے کہا کہ مجھے حدیث ہے کہ اسے جنگل میں کوئی

بھڑیا نہ پھاڑ کھائے۔ باپ کے اس حدیث پر بیٹوں نے کہا:-

قَالُوا لَئِنْ أَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّا إِذًا لَّخَسِرُونَ

(۱۲/۱۴)

انہوں نے کہا "بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بھیڑیا اُسے کھالے اور ہمارا پورا ایک جھٹکا موجود ہو۔ اگر ایسا ہو تو ہم پھر بڑے نکتے ہی نکلے!

گلابانی کی زندگی میں بھیڑیوں کے حملے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی۔ حضرت یعقوبؑ نے اسی خیال سے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بیٹوں کی بدخواہ طبیعت نے اس چیز کو اپنے سلسلہ مکرو فریب کی ایک کڑی بنانے کے لئے گرہ میں باندھ لیا۔ بھائی انہیں ساتھ لے گئے اور اپنی طے شدہ خفیہ تجویز کے مطابق حضرت یوسفؑ کو ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَ اجْتَمَعُوا أَن يَجْعَلُوهُ فِي غِيَابَتِ الْجُبِّ (۱۵)

پھر جب یہ لوگ (باپ سے رخصت لے کر) یوسفؑ کو ساتھ لے گئے اور سب نے اس پر اتفاق کر لیا کہ اندھے کنویں میں ڈال دیں (اور ایسا ہی کر گزرے)!

یوسفؑ در چاہ | ذرا اندازہ لگائیے اس جگرگداز ساخ اور ہوش رُبا منظر کا کہ باپ کا چہیتا اپنے بھائیوں کے ہاتھوں 'زندہ درگور کیا جا رہا ہے! اس بھیانک قبر میں حضرت یوسفؑ کے دل پر کیا گزری ہوگی؟ لیکن ادھر انہوں نے حضرت یوسفؑ کو (بزعیم خویش) دنیا کے تمام اسباب و علاق سے منقطع کیا اور ادھر اسباب و علل کے مالک حقیقی نے فوراً وحی بھیجی کہ مت گھبراؤ۔

وَ افْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُونَ

(۱۲/۱۵)

تو ہم نے یوسفؑ پر وحی بھیجی کہ (ما یوس نہ ہو) ایک دن ضرور آنے والا ہے، جب تو انہیں جتائے گا کہ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا تھا اور ان کی عقل و شعور میں بھی نہیں آئے گا کہ تم کیسے زندہ نکالے گئے اور اس مقام تک پہنچ گئے۔

بھائیوں کی واپسی | مکرو فریب کے یہ سنگدل مجتہم شام کے قریب گھروٹے، لیکن عجیب ڈھونگ رچائے ہوئے۔

وَجَاءُوۡا بِآبَاهُمۡ عِشَاءًۭ ۙ يَبْكُوۡنَ ۙ (۱۲/۱۶)

وہ اپنے باپ کے پاس شام کو رو تے پیٹتے آئے۔

اور کہا۔

قَالُوۡا يَاۡ اَبَانَاۤ اِنَّا ذٰهَبْنَا نَسْتَبِيۡحُ وَاَسْرَكْنَا يُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا

فَاَكَلَهُ الدِّثۡلُ وَاَمَّا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَاَوْكُنَّا ضٰلِّیۡنَ ۙ (۱۲/۱۷)

”اے ہمارے باپ! ہم ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کے لئے دوڑ میں لگ گئے اور

یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا۔ پس ایسا ہوا کہ بھیرا یا آنکلا اور یوسف کو (مار کر) کھا

لیا۔ اور ہم جانتے ہیں کہ آپ ہماری بات کا یقین کرنے والے نہیں، اگرچہ ہم کتنے ہی سچے ہوں۔“

آیت کے آخری ٹکڑے پر پھر نگاہ ڈالتے اور دیکھتے کہ برادرانِ یوسفؑ کے قلبِ خائن (GUILTY)

(CONSCIENCE) کی دھڑکنیں ان کے مکرو فریب کے حلیمنی پرووں سے کس طرح پھٹ پھٹ

کر باہر آرہی ہیں۔ ”اگرچہ ہم کتنے ہی سچے کیوں نہ ہوں آپ تو ہمارا یقین کریں گے ہی نہیں،“ نفسِ

نیم شعوری (SUB-CONSCIOUS MIND) کی بیتابانہ، لیکن غیر محسوس کیفیت کا

ایسا صحیح نقشِ قرآنِ کریم کے معجزانہ اسلوبِ بیان کی خصوصیت ہے۔ انہوں نے فریب کارانہ طور

پر رونا دھونا کبھی شروع کیا اور ساتھ ہی اس مکر کی تکمیل کے لئے حضرت یوسفؑ کے کڑتے پر جھوٹ

موٹ کا خون بھی لگالائے تاکہ اسے بطور شہادت پیش کر دیا جائے۔

وَجَاءُوۡا عَلٰۤی قَمِيۡصِهٖۙ بَدْرِۙ كَذِبًاۙ (۱۲/۱۸)

اور وہ یوسفؑ کے کڑتے پر جھوٹ موٹ کا خون لگالائے تھے۔

انہوں نے اپنی طرف سے تو اس سوانگ میں کسی قسم کی کوئی کسر نہ چھوڑی، لیکن ایک صاحبِ فراست

کی نگہ بصیرت کے لئے اس قسم کے جھوٹ اور سچ میں فرق کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا

کہ کیوں یونہی باتیں بنا رہے ہو۔ یہ ساری کہانی تمہارے فریبِ نفس کے سوا اور کچھ نہیں۔

قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَّكُمۡ اَنْفُسُكُمۡ ۙ اَمۡرًاۙ (۱۲/۱۸)

ابا نے کہا ”نہیں (میں یہ نہیں مان سکتا) یہ تو ایک بات ہے جو تمہارے نفس نے

گھڑل ہے اور تمہیں خوشنما (بنا کر) دکھادی ہے (اور تم سمجھتے ہو کہ چل جائے گی)۔“

صبرِ یعقوبؑ | حضرت یعقوبؑ کو اس بات کا یقین تھا کہ حضرت یوسفؑ زندہ ہیں (کیونکہ آلِ یعقوبؑ کے لئے اللہ کی اتمامِ نعمت کے وعدے انہی کی ذات سے پورے ہونے تھے) اس لئے انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اس میں مشیت کا ہاتھ کار فرما ہے۔ لہذا ایسے محبوب بیٹے کے فراق کے صدمے کو استقلال و تحمل سے برداشت کرنا چاہیے۔ اسی لئے فرمایا۔

فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۝ (۱۲/۱۸)

خیر میرے لئے اب صبر کرنا ہے (اور صبر بھی ایسا کہ پسندیدہ) (۱۲/۱۸)۔

یعنی درد و فراق کی سینہ کاویلوں کو جھیلوں کا اور نہایت مردانہ وار جھیلوں کا۔

وَ اِنَّ اللّٰهَ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ ۝ (۱۲/۱۸)

اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگنی ہے۔

اُدھر یہ ہو رہا تھا۔ ادھر ایسا ہوا کہ ایک قافلہ کا گزر اس راستہ سے ہوا جس پر وہ کنواں پڑتا تھا جس میں حضرت یوسفؑ کو ڈالا گیا تھا۔ انہوں نے پانی لینے کے لئے اپنا آدمی کنویں پر بھیجا۔ اس نے ڈول لٹکایا۔ حضرت یوسفؑ نے اسے نجات کی راہ سمجھی اور ڈول کے ساتھ اوپر چڑھ آئے۔ جب اوپر پہنچے تو وہ یوسفؑ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس زمانہ میں بڑے فریٹھی

قافلہ والوں کے ہاتھ میں | کا عام رواج تھا۔ اہل قافلہ نے اسے مُفت کی متاع سمجھا اور چُپا کر رکھ لیا کہ کوئی تلاش کر لے والا نہ آسکے۔

وَ جَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَى دَلْوَةً ۝ وَ قَالَ يَبْشُرِي هَذَا غُلَامٌ ۝ وَ اسْرُوْهُ بِضَاعَةً ۝ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۭ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۲/۹)

اور دیکھو، ایک قافلہ کا اُس (کنویں) پر گزر ہوا (جس میں یوسفؑ کو ڈالا گیا تھا) اور قافلہ والوں نے پانی لینے کے لئے اپنا سقمہ بھیجا۔ پھر جوں ہی اس نے اپنا ڈول لٹکایا (اور یہ سمجھ کر کہ پانی سے بوجھل ہو چکا ہے اوپر کھینچا) تو (کیا دیکھتا ہے کہ ایک جیتا جاگتا لڑکا اس میں بیٹھا ہے! وہ) پکار اٹھا "کیا خوشی کی بات ہے! یہ تو ایک لڑکا ہے اور پھر قافلہ والوں نے آسے

سرمایہ تجارت سمجھ کر چھپا رکھا (کہ کوئی دعویدار نہ نکل آئے)۔ اور وہ جو کچھ کر رہے تھے اللہ کے علم سے پوشیدہ نہ تھا!

تورات میں ہے کہ یہ قافلہ اسمعیلی عربوں کا تھا جو اپنا سامان تجارت لے کر مصر جا رہا تھا۔ نیز یہ کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے انہیں بیس سگوں کے عوض قافلہ والوں کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔ لیکن قرآن کریم کا یہ بیان ہے کہ اہل قافلہ نے انہیں چھپا کر رکھ لیا تھا کہ ان کا کوئی دعویدار نہ آنکلیے۔ آج بھی فنانہ بدوش قبائل جو اس قسم کی بردہ فروشی کرتے ہیں ہاتھ پڑے بچوں کو اسی طرح چھپا کر کہیں سے کہیں لیجاتے ہیں۔ اب حضرت یوسفؑ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے (اور اندازہ لگائیے کہ کس روع فرسا مصیبت سے شروع ہوتا ہے)۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ فلسطین کی زندگی بدوی زندگی تھی، جیسے جنگلوں میں مویشی چرانے والوں کی ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں مصر اُس زمانہ میں تمدن و حضارت کی ان بلندیوں پر تھا کہ آج بھی اُس کے نوادرات کے زمین دوز دینے باہر نکلتے ہیں تو چشم حیرت کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے کہ وہ زمانہ اور اس قسم کے تہذیب و تمدن کے نمونے! جس طرح آج بھی شہروں کی "مہذب" آبادی کے نزدیک گاؤں والوں کی غیر مہذب زندگی نفرت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، اہل مصر اپنے گرو و پیش کے چرواہوں کو سخت حقارت سے دیکھتے تھے۔ بہر حال، صحرائی علاقہ کے چرواہوں کا ایک لڑکا مصر کی آبادی میں پہنچتا ہے اور وہ بھی اس انداز سے کہ ایک اجنبی قافلہ والوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہے جو اسے بازار میں جنس کی طرح بیچنے کے لئے لئے جا رہے ہیں۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ۖ وَ كَانُوا فِيهِ
مِنَ الزَّاهِدِينَ ۝ (۱۲/۲۰)

اور پھر انہوں نے یوسف کو بہت کم داموں پر کہ گنتی کے چند درہم تھے (بازار مصر میں) فروخت کر دیا۔ اور وہ اس معاملہ میں (اچھی قیمت لینے کے چنداں) خواہشمند بھی نہ تھے (یعنی چونکہ لڑکا مفت مل گیا تھا اور انہیں خطرہ بھی تھا کہ اس کے لاحقین پیچھے سے آگئے تو وہ مشکل میں نہیں جائیں گے) اس لئے انہیں جو کچھ ملا اسے غنیمت سمجھا اور لڑکے کو خریدار کے حوالے کر دیا۔

انہوں نے اس "غلام" کو سر بازار فروخت کر دیا۔ اور چونکہ مال مفت ہاتھ آگیا تھا اس لئے اس کی بھی

چنداں پرواہ نہ کی کہ کتنے میں پک رہا ہے۔ جو کسی نے دیا لینے کی کی۔

اللہ اکبر! غلام اور اس بے قدری سے بکا ہوا غلام! ایوں مصر میں داخلہ ہوا۔ قورات میں ہے کہ جس شخص نے حضرت یوسفؑ کو خرید لیا تھا اس کا نام فوطیفار تھا۔

اور مدیا نیوں نے اسے مصر میں فوطیفار کے ہاتھ جو فرعون کا ایک امیر اور شکر کار نہیں تھا

(پیدا آتش ۳۶/۳۶)

بچا۔

اور وہ مصر کی فوج میں ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت رکھتا تھا۔ قرآن کریم نے اسے فقط عزیز (بڑی عزت والا) یا صاحب اختیار (کے لقب سے پکارا ہے کہ مقصد اس کی حیثیت کا تعارف تھا نہ کہ اس کے عہدے کا ذکر۔ عزیز نے حضرت یوسفؑ کو ایک

وہاں سے عزیز کے محلات میں غلام کی حیثیت سے خرید لیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں

اس نے آپ کی راست بازی، دیانتداری، حسن سیرت اور خداداد فراست سے اندازہ لگالیا کہ یہ لڑکا اس قابل ہے کہ اس پر گلی اعتماد کیا جائے اور گھر کا نظم و نسق اس کے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ

عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَكَذَٰلِكَ ۝ (۱۲/۲۱)

اور اہل مصر میں سے جس شخص نے یوسفؑ کو قافلہ داروں سے مول لیا تھا، وہ (مناسب

تجربہ، دیانت و امانت کے بعد) اپنی بیوی سے بولا کہ اسے عزت کے ساتھ رکھو۔ عجب نہیں!

یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے اپنا بیٹا بنا لیں۔

قرآن کریم نے اکرمی ماثوہ (اسے عزت کے ساتھ رکھو) کہہ کر کہانی کا ایک بہت بڑا حصہ

دو لفظوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہ حیات یوسفؑ میں پہلا انقلاب تھا، یعنی غلام کی حیثیت سے گھر

میں داخل ہوتے اور وہ کبھی کنعانی غلام (یعنی مصریوں کے نزدیک ایک گنوار غلام) کی حیثیت سے۔

اور چند ہی روز میں مصر کے ایک بہت بڑے صاحب منصب امیر کے گھر بار کے معتمد علیہ ناظم بن گئے۔

وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِن

تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۝ (۱۲/۲۱)

اور (دیکھو) اس طرح ہم نے یوسفؑ کا سرزمین مصر میں قدم جما دیا اور مقصود یہ تھا کہ

وہاں اس کی ایسی اچھی تعلیم و تربیت ہو جائے کہ اس کے خفتہ جو ہر بیدار ہو جائیں اور اس کی استنباط نتائج کی صلاحیت چمک اُٹھے۔

چوپانی سے جہاں بانی کے انداز | یوں حضرت یوسفؑ کے قدم سرزمین مصر میں جمادیتے گئے اور اتنے بڑے نظم و نسق کو ان کے ہاتھ میں دے

کر حسین تدبیر اور معاملات فہمی (تاویل الاحادیث) کی تعلیم کے مواقع بہم پہنچا دیتے، اس لئے کہ

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰی اَهْلِ الْاَرْضِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۲۱)

اور اللہ اپنی اسکیموں میں کامیاب رہتا ہے، لیکن اکثر آدمی ہیں کہ نہیں جانتے! ذرا غور کیجئے، مشیت کی تدبیر کو اپنے نقطہ آغاز سے تکمیل تک پہنچنے کے لئے اسباب و علل کی کون کونسی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے، لیکن عام انسانوں کی نگاہوں سے چونکہ یہ راز پنہاں ہوتا ہے اس لئے وہ تدابیر کی ان کڑیوں کو سمجھ نہیں سکتے۔

اس طرح حضرت یوسفؑ نے اس جدید ماحول میں پرورش پانا شروع کیا۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَسْتَدَّ لَا اَتَيْنَتْهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ط وَّ كَذٰلِكَ

نَجْرِي الْمُحْسِنِينَ ۝ (۱۲/۲۲)

اور جب یوسفؑ اپنی جوانی کو پہنچا، تو ہم نے اُسے کارفرمائی کی قوت اور علم کی فرادانی بخشی۔

ہم نیک عمل والوں کو ایسا ہی (اُن کی نیک عملی کا) بدلہ عطا فرماتے ہیں!

جب حضرت یوسفؑ نے عمر کے کچھ مراحل اور طے کر لئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کارفرمائی کی قوت اور علم کی نعمت سے سرفراز فرمایا اور یہ سب اُن کے حُسنِ عمل کی بدولت تھا۔ (وَكَذٰلِكَ نَجْرِي الْمُحْسِنِينَ) غور کیجئے، قرآن کریم نے اس پہلے انقلاب کے ساتھ ہی نگاہوں کو کس طرح قصہ سے عبرت و مواعظت کی طرف ملتفت کر دیا، یعنی یہ انقلاب یونہی اتفاقیہ سرزد نہیں ہو گیا تھا بلکہ خدا کے اس اہل قانون کے ماتحت واقع ہوا تھا کہ حُسنِ سیرت اور فضیلت کردار کا لازمی نتیجہ ایسا ہوتا ہے۔ (وَكَذٰلِكَ نَجْرِي الْمُحْسِنِينَ)۔

اب اس زہریں داستان کی اگلی کڑی شروع ہوتی ہے اور کاروانِ شوق اس وادی میں داخل

ہوتا ہے جہاں سیرت و کردار کی آزمائش کے لئے ترغیباتِ نفس کے صبر آزما اور نگاہ فریب مناظر، سامانِ صد بہارِ بدماں کئے، وایم ہم رنگِ زمین کی طرح چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کی عمر اس وقت بھر پور جوانی کی تھی، تمدن و حضارت کی اعصاب شکن مصنوعی زندگی سے دُور دشت و بیاباں کی کھلی فضاؤں میں پرورش یافتہ۔ آج بھی اس کا اندازہ لگانا ہو کہ کھلی فضا میں اور سادہ و بیباک زندگی، انسانی حُسن کو کس طرح نکھارتی ہے، تو آزاد قبائل کے کسی بچے کو دیکھئے۔ افلاس و غربت کا یہ عالم کہ بدن پر کپڑے نہیں، چیتھڑے ہیں، لیکن صحت و تندرستی کو دیکھئے تو رگ رگ سے ارغوانی موہیں تلاطم خیز ہیں۔ حُسن، صحت کا نام ہے اور جب صحت و جوانی یک جا ہو جائیں، تو ان کے امتزاج سے جذب و کیف کا ایک ایسا بلوریں مجسمہ وجود میں آجاتا ہے جس میں زندگی اپنی پوری توانائی و عنائی سے مُرسم دکھائی دیتی ہے۔ پھر رگوں میں خانوادہ نبوت کا صالح خون، ان تمام خصوصیات کے ساتھ حُسنِ عفت سونے پر سہاگہ۔ تندرست جوانی اگر قلب و نگاہ کی پاکیزگی میں گزرے تو اس سے حُسنِ سیرت اور حُسنِ صورت | بڑا حُسن اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ تھے حضرت یوسفؑ۔ دوسری طرف عزیز کی بیوی، تہذیب

تمدن کی بیباکیوں کی تخلیق، عشرت و کامرانی کے ماحول کی پروردہ، دولت کی مرصع کاریوں سے جگمگانا حُسنِ غریبکہ دونوں طرف جذب و کشش کے پورے پورے سامان۔ لیکن ایک طرف جذباتِ نفس کی مقل حکمرانی اور دوسری طرف ترغیباتِ نفس پر عدوِ دانش کی سلطانی۔ نتیجہ یہ کہ حضرت یوسفؑ کا خیال کبھی بھولے سے بھی اُدھر نہ گیا۔ لیکن عزیز کی بیوی کی دل باختگی، آتشِ ناموش کی طرح سلگتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ایک دن بوشِ فریفتگی نے شعلہ بیباک کی صورت اختیار کر لی۔ حضرت یوسفؑ کمرے کے اندر تھے۔ وہ عشوہ طرازیوں کا فنڈہ مجسم، ہزاروں بجلیاں اپنے دامن نگاہ میں لئے وہاں پہنچی۔ دروازے بند کر لئے اور ناز، ہزار نیاز مند یوں کے ساتھ، ایک نگہ التفات کے لئے ملتجی ہوا۔ قرآن کریم نے اس تمام واقعہ کو چند لفظوں میں سمودیا ہے۔ فرمایا:

وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَفْسِهِ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ

وَ قَالَتْ هَيْبَتِي لَكَ ۝ (۱۲/۲۳)

اور پھر (ایسا ہوا کہ) جس عورت کے گھر میں یوسف رہتا تھا (یعنی عزیز کی بیوی)، وہ اس پر اریجھ

گئی اور ڈورے ڈالنے لگی کہ بے قابو ہو کر بات مان جائے۔ اُس نے (ایک دن) دروازے

بند کر دیئے اور بولی "لو آؤ۔"

اُدھر سے یہ التجائیں تھیں اور ادھر پہ خیال دامنگیر کہ معاذ اللہ! یہ کتنی بڑی خیانت ہے

کشاکش جس کی طرف مجھے دعوت دی جا رہی ہے۔

قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ
الظَّالِمُونَ ۝ (۱۲/۲۳)

یوسف نے کہا "معاذ اللہ! مجھ سے ایسی بات کبھی نہیں ہو سکتی (میرے پروردگار نے مجھے سیرت و کردار کے ایسے بلند اور موزوں مقام پر پہنچا دیا ہے) کیا تو مجھے اس مقام سے نیچے گرائے جا سکتی ہے ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ یہ تو قانون خداوندی سے کھلی ہوئی سرکشی ہے اور ایسے لوگوں کی کھیتیاں کبھی ہر دان نہیں چڑھا کرتیں۔

لیکن اس کی آتشِ جذبات کے شعلے تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اس دیوانگی میں سب کچھ بھول کر معاملہ کی انتہائی حد تک پہنچ چکی تھی۔ ذرا غور کیجئے۔ اس کمرے کے اندر کوئی تیسرا دیکھنے والا نہ تھا۔ جذباتِ نفس کی تسکین کے پورے سامان موجود تھے۔ لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے اس سیلابِ انگیزوں کے باوجود حضرت یوسفؑ کے دامنِ عقبت کو تر نہ ہونے دیا! فقط ایک اللہ کا خیال! یعنی اس بات پر ایمان اور غیر متزلزل ایمان کہ جب کوئی اور دیکھنے والا نہیں تو ایک ذات ایسی ہے جو دیکھنے والی ہے۔ اس بات کا یقین کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہر غلط کام اپنا تباہ کن نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے، خواہ اس پر اگر فت کرنے والا ہو یا نہ ہو۔ یہ کھا امرآة العزیز اور حضرت یوسفؑ

دونوں میں فرق میں فرق۔ ایک کی آنکھوں پر ترغیباتِ نفس کے گہرے پردے پڑے ہوئے تھے۔ دوسرے کی نگہِ حقیقت اس ایسے خود فراموش ماحول میں بھی قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ رہی تھی ورنہ ان ان ہونے کی حیثیت سے جوانی کی امنگیں دونوں طرف تھیں۔ دیکھئے قرآنِ کریم نے اس بین فرق کو ایجاز و اختصار کے باوجود کس حسین انداز سے بیان کیا ہے۔ فرمایا۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْ لَا أَنْ رَأَى بُرْهَانَ

رَبِّهِ ط كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّؤْعَ وَ الْفَحْشَاءَ ط إِنَّهُ
مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلِصِينَ ۵ (۱۲/۲۴)

اور حقیقت یہ ہے کہ عورت یوسف کے بچے پڑ چکی تھی اور اس نے حالات ایسے پیدا کر دیئے تھے کہ اگر یوسف (کی جگہ کوئی اور ہوتا جس) کے سامنے اپنے پروردگار کا یہ اخلاقی قانون نہ ہوتا تو وہ بھی اس کی طرف مائل ہو جاتا۔ اس اخلاقی قدر کے سامنے ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس فحش کام سے مجتنب رہا اور اس سے اس نے ثابت کر دیا کہ وہ ہمارے ان بندوں میں سے تھا جو بزرگی کے لئے چُن لئے گئے ہوں۔

اور ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلِصِينَ حضرت یوسفؑ اللہ کے مخلص بندے تھے جن کے متعلق خود ابلیس نے کہا تھا کہ

قَالَ رَبِّ إِنَّمَا آخُونِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ
أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ ۵ (۱۵/۴۰-۳۹)

اس نے کہا "خدا یا! چونکہ تو نے مجھے بہکا دیا ہے، تو اب میں ضرور ایسا کروں گا کہ زمین میں ان کے لئے (جھوٹی) خوشنمائیاں بنا دوں اور (راہ حق سے) گمراہ کر دوں۔ ہاں ان میں جو میرے مخلص بندے ہوں گے (میں جانتا ہوں) میرے بہکانے میں آنے والے نہیں؛

اور خدا نے کہا تھا کہ

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ
الْغٰوِيْنَ ۵ (۱۵/۴۲)

جو میرے (مخلص) بندے ہیں ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا۔ صرف انہی پر چلے گا جو (صحیح) راہ سے بھٹک گئے۔

اس لئے حضرت یوسفؑ ان نظر فریب مناظر کے دام تزییر میں کس طرح آسکتے تھے! اللہ کے بندے ان تمام غاردار جھاڑیوں سے اپنا دامن صاف بچا کر نکل جاتے ہیں۔

ہندہ را کہ بفرمان خدا راہ رو

نگذارند کہ در بند زلیخا ماند (غالب)

عورت بے قابو ہو کر دست درازی تک پہنچی۔ حضرت یوسفؑ دامن چھڑا کر بھاگے کہ باہر نکل جائیں۔
جذبات بیباک کی دست درازیاں | اس منظر کو قرآن کریم نے دو الفاظ میں بیان فرمادیا کہ

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ (۱۲/۲۵)

اور (ایسا ہوا کہ) دونوں دروازے کی طرف دوڑے، اس طرح کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ (یوسف اس لئے کہ عورت سے بھاگ نکلے، عورت اس لئے کہ اسے نکل بھاگنے سے روکے)۔

وہ دونوں دروازے کی طرف دوڑنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ وہ حضرت یوسفؑ سے آگے نہ بڑھ سکی تو پیچھے سے کڑتا پکڑ لیا اور پھٹ گیا۔

وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرِهَا (۱۲/۲۵)

اور عورت نے یوسفؑ کا کڑتا کھینچا اور وہ پیچھے سے پھٹ گیا۔
اور سامنے؟ | لیکن اتنے میں حضرت یوسفؑ دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ دروازہ کھلا تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے اس عورت کا خاوند کھڑا تھا۔

وَالْفَتَا سَيِّدَهَا كَذَلِكَ الْبَابِ (۱۲/۲۵)

اور ان دونوں نے دیکھا کہ عورت کا خاوند دروازہ کے سامنے کھڑا ہے۔

اس اچانک سانحہ نے امراة العزیز کے قلب کے ہیجانوں کا رخ فوراً بدل دیا۔ بالآخر لوالہوس ہی تو تھی۔
 فوراً اس ذلیل ترین حربہ پر اتر آئی جو اس قسم کے کیر کٹر کا فائدہ ہوا کرتا ہے۔

قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَنْ يُسْجَنَ

أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (۱۲/۲۵)

تب عورت نے (اپنا جرم چھپانے کے لئے) فوراً بات بنالی، اور اپنے خاوند سے کہا کہ جو آدمی تیرے اہل خانہ کے ساتھ بُری بات کا ارادہ کرے، اس کی سزا کیا ہونی چاہیے؟ کیا

یہی نہیں کہ اسے قید میں ڈالا جائے یا (کوئی اور) دردناک سزا دی جائے؟
حضرت یوسفؑ نے فرمایا:-

قَالَ رَحِي رَاوَدَ قُبِي عَنْ لَفْسِي (۱۲/۳۶)

اس پر یوسف نے کہا کہ یہ جھوٹ بولتی ہے۔ خود اس نے یہ سب مکرو فریب کیا اور مجھے مجبور کرتی رہی کہ میں اس فعلِ سفینح کا مرتکب ہو جاؤں۔ (لیکن میں اس سے دامن چھڑا کر بھاگ نکلا)۔ وہ انہیں ملزم قرار دے رہی ہے اور یہ نہ صرف اقبالِ جرم سے منکر ہیں بلکہ اسے ملزم بتاتے ہیں۔ کھرے **شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا** کے اندر کوئی تیسرا تھا نہیں۔ حضرت یوسفؑ اپنی بریت میں خود اس عورت کے کنبہ میں سے ایک حق شناس آدمی نے کہا کہ جب کوئی اور گواہی نہیں مل سکتی تو اصول و کوائف کی گواہی (CIRCUMSTANTIAL EVIDENCE) کو دیکھنا چاہیئے۔

دَ شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا ۖ إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ
فَصَدَقَتْ وَ هُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ۚ وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ
دُبُرٍ فَلَا بَتَّ وَ هُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ (۱۲/۲۷-۲۸)

اور اس عورت کے کنبہ والوں میں سے ایک حق شناس نے گواہی دی۔ اس نے کہا: "یوسفؑ کا کرتا (دیکھا جائے) اگر آگے سے پھٹا ہوا ہے، تو عورت سچی ہے، یوسفؑ جھوٹا ہے۔ اور اگر پیچھے سے پھٹا ہے، تو عورت نے جھوٹ بولا، یوسفؑ سچا ہے۔"

اس نے ایک اصول متعین کر دیا جو فی الواقع فیصلہ کن تھا۔ عزیز نے جب دیکھا تو حضرت یوسفؑ کا کرتا پیچھے سے پھٹ رہا تھا، جس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کی بیوی انہیں پیچھے سے پکڑ کر روکنے کے لئے کوشاں تھی۔

فَلَمَّا رَا قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِ كُنَّ ۚ إِنَّ
كَيْدَ كُنَّ عَظِيمٌ ۝ (۱۲/۲۸)

پھر جب عورت کے خاوند نے دیکھا کہ یوسفؑ کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہے تو اصلیت کو پا گیا اور عورت سے کہا: "کچھ شک نہیں یہ تم عورتوں کی مکاریوں میں سے ایک مکاری ہے۔"

اور تم عورتوں کی منکاریاں بڑی سخت منکاریاں ہیں۔

إِنَّ كَيْدَ كُنَّ عَظِيمٌ پر غور کیجئے۔ صاف نظر آتا ہے کہ اس زمانہ تہذیب و تمدن میں عورتوں کے متعلق عام خیال کیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ عزیز مصر کا قول ہے۔ لیکن بعض سادہ لوح اس فقرہ کو جنس نسواں کے مکرو فریب کی تائید میں بطور آسمانی شہادت پیش کرتے ہیں، یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! عورتیں ہوتی ہی مکرو فریب کی گھڑیاں ہیں۔ دیکھئے قرآن

إِنَّ كَيْدَ كُنَّ عَظِيمٌ

کریم میں ہے کہ إِنَّ كَيْدَ كُنَّ عَظِيمٌ۔ لیکن قرآن کا دامن ان اتہامات سے یکسر پاک ہے۔ اس کے نزدیک نہ مرد محض مرد ہونے کی حیثیت سے دیانتداری اور راستبازی کا مجتہم ہے اور نہ عورت محض عورت ہونے کے اعتبار سے مکرو فریب کی پیکر دیانت و امانت اور مکرو فریب کی استعداد دونوں میں موجود ہے اور دونوں اپنے اپنے اعمال کے مطابق واجب التکریم یا مستوجب نفرین ہیں۔

عزیز مصر نے اپنی بیوی کی تو اس طرح ملامت کی اور حضرت یوسفؑ سے کہا کہ اس معاملہ کو رفت گذشت سمجھو۔ اور حضرت یوسفؑ کی بریت کی توثیق کے لئے ایک مرتبہ پھر اپنی بیوی سے کہا کہ اپنی خطاؤں کی معافی مانگ۔ جرم تیرا ہی ہے۔

يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا سَكْتَ، وَ اسْتَغْفِرِي لِذَنبِكِ ۝
إِنَّكَ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِينَ ۝ (۱۲/۲۹)

(پھر اس نے کہا) اے یوسف! اس معاملہ سے درگزر کر (یعنی جو کچھ ہوا اُسے بھلا دے) اور (بیوی سے کہا) اپنے جرم کی معافی مانگ۔ بلاشبہ تو ہی خطا دار ہے۔

اس سے ضمناً یہ بھی ظاہر ہے کہ اس تمدن میں جس کی بنیاد خدا فراموشی پر ہوا انسان میں غیرت و حیثیت کا کتنا جذبہ باقی رہ جاتا ہے؟ کسی بدوی قبیلہ میں یہی واقعہ ہوتا (جو مہذب شہریوں کے نزدیک جاہل اور گنوار ہوتے ہیں) تو خاوند کی غیرت اسی بیوی کی گردن اڑا دیتی۔ لیکن اس "تہذیب کے فرزند" کو دیکھئے

غیر فطری تہذیب میں غیرت کا حشر! کہ آنکھوں کے سامنے یہ واقعہ ہوا، بیوی کا جرم ثابت ہو گیا اور اس پر زیادہ سے زیادہ

کہا تو فقط اتنا کہ تمہارا فرقہ بڑا ہی مکار ہے۔ اور حضرت یوسفؑ سے کہتے ہیں کہ میاں صاحبزادے!

اس قصے کو آگے نہ بڑھانا یہیں ختم کر دینا۔ اور یہ صرف آج سے چار ہزار سال پیشتر کی تہذیبِ مصری کا نتیجہ نہ تھا۔ ہر وہ تہذیب جس کی عملات حدودِ اللہ کی بنیادوں پر استوار نہ ہو اس میں غیرت اور حمیت، جہلا کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ اس میں مرد اور عورت دونوں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ بقول اکبرؑ

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں ہتذب ہیں

حیا ان کو نہیں آتی، انہیں غصہ نہیں آتا

حقیقت یہ ہے کہ غیرت، ضبطِ نفس سے پیدا ہوتی ہے، اور "تہذیب" کی حکمرانی میں، عقل پرستی کی آڑ میں، خدا سے انکار کیا ہی اس لئے جاتا ہے کہ نفس کی کامرانیوں میں کوئی روک ٹوک باقی نہ رہے۔

عورتوں کی محفل | اس کے بعد قرآن نے ایک اور واقعہ لکھا ہے جس کی تفصیل اس نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کی ہے۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مَثَكًا ۙ وَاَنْتَ كُلَّ وَاَحَدَةٍ مِّنْهُنَّ سَلِيْنًا ۙ وَّقَالَتِ اُخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۙ فَلَمَّا رَاَيْتَهُنَّ اَكْبَرْتَهُنَّ وَّقَطَعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۙ وَّقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۙ اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝ (۱۲/۳۱-۳۰)

اور (پھر جب اس معاملہ کا چرچا پھیلنا) تو شہر کی بعض عورتیں کہنے لگیں "دیکھو عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈور سے ڈالنے لگی کہ اسے رجھائے۔ وہ اس کی چاہت میں دل ہار گئی، لیکن اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس نے جو طریق اختیار کیا وہ بالکل غلط تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا مقصد بھی حاصل نہ ہوا اور بدنام بھی ہو گئی۔ (اُسے یوں کرنا چاہیے تھا)۔

جب عزیز کی بیوی نے ان کی اس تدبیر کو سنا تو انہیں بلوا بھیجا اور ان کے لئے مسدیں آراستہ کیں اور (دستور کے مطابق) ہر ایک کو ایک ایک چھری پیش کر دی (کہ کھانے میں کام آئے) پھر (جب یہ سب ہو چکا تو) یوسف سے کہا ان سب کے سامنے نکل آؤ۔ اس

کے بعد انہوں نے وہ سب جن کر ڈالے جو انہوں نے سوچ رکھے تھے انہوں نے یوسف پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ اس پر کس درجہ فریفتہ ہو رہی ہیں کہ انہیں اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لئے۔ لیکن یوسف پر ان کا جادو نہ چل سکا۔ اس طرح وہ یوسف کے عظمتِ کردار کی قائل ہو گئیں اور کہنے لگیں کہ سبحان اللہ! یہ انسان نہیں کوئی واجب الکلم فرشتہ ہے۔

ضمناً قرآن کریم نے یہاں "قطع ید" کے الفاظ استعمال کئے ہیں، اس کے یہ معنی نہیں کہ انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر کلائیوں سے الگ کر دیئے تھے، اس سے مراد یا تو محض ہاتھ روک لینے کے ہیں اور یا ہاتھوں کو زخمی کر لینے کے۔ قرآن کریم میں چور کی سزا کے سلسلہ میں جو "قطع ید" کے الفاظ استعمال کئے ہیں، اس کا مطلب یہاں سے واضح ہو جاتا ہے۔

ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ اسی مجلس میں جو کچھ ہوا اسے حضرت یوسفؑ نے ان عورتوں کا کید (مکر، خفیہ سازش) کہہ کر پکارا ہے (دیکھئے ۱۲/۳۳، ۱۲/۵۰) اور اپنے رب سے کہا ہے کہ اگر تو میری حفا ظنت نہ کرے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا (۱۲/۳۳)۔ اس سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ خود وہ عورتیں بھی حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب بادشاہ نے اس معاملہ کی تحقیق کی ہے تو اس نے ان عورتوں سے (یعنی اکیلی عزیز کی بیوی سے نہیں بلکہ دوسری عورتوں سے بھی) کہا تھا۔

قَالَ مَا خَطْبُكُمْ إِذْ رَأَوْتُنَّ يُوسُفَ عَنْ نَفْسِهِ ط قُلْنَ حَاشَ
بِاللَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ ط (۱۲/۵۱)

(اس پر) بادشاہ نے (ان عورتوں کو بلایا اور) کہا، "صاف صاف بتلا دو تمہیں کیا معاملہ پیش آیا تھا، جب تم نے یوسف پر ڈورے ڈالے تھے کہ اسے اپنی طرف مائل کر لو! وہ بولیں "حاشا للہ ہم نے اس میں کوئی برائی کی بات نہیں پائی۔"

ان تمام شواہد سے ظاہر ہے کہ تنہا عزیز کی بیوی نے نہیں بلکہ سوسائٹی کی اور عورتوں نے بھی حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا۔ لہذا، ہو سکتا ہے کہ اُس محفل میں ان کا بہوت ہو کر اپنے ہاتھ زخمی کر لینا اور حُسنِ یوسفؑ کی اس قدر تعریف کرنا، ان کا "ایکٹنگ" ہی ہو جس سے مقصود خود اپنی مجتہد کا اظہار ہو۔

اس لئے کہ نفسیاتی طور پر یہ حربہ بڑا موثر ہوتا ہے کہ کسی کے حُسن کی اس طرح والہانہ تعریف کی جائے اور اسے عملاً بتایا جائے کہ اسے دیکھ کر بڑے سے بڑے کبھی اپنے ہوش و حواس پر قابو نہیں رکھ سکتے۔

اس کے بعد:

قَالَتْ قَدْ لَبِئْتُ الَّذِي لُمْتُ نَبِيَّ فِيهِ ط وَ لَقَدْ زَادَتْهُ عَنِ
نَفْسِهِ فَاَسْتَعَصَمَ ط (۱۲/۳۲)

تب (عزیز کی بیوی) بولی، ”تم نے دیکھا؟ یہ ہے وہ آدمی جس کے بارے میں تم نے مجھے طعنہ دیتے تھے۔ ہاں بے شک میں نے اس کا دل اپنے قابو میں لینا چاہا تھا، مگر وہ بے قابو نہ ہوا۔“

جذبہ انتقام | اس کے بعد وہ عورت اپنی ضد پر آگئی اور اس نے ہر ملا کہہ دیا۔
مِنَ الصَّغِيرِينَ ۵ (۱۲/۳۲)

”اور (اب اسے سُننا کے کہے دیتی ہوں کہ) اگر اس نے میرا کہنا مانا (اور اپنی ضد پر اڑا رہا) تو ضرور ایسا ہوگا کہ قید کیا جائے اور بے عزتی میں پڑے۔“

ذرا اس منظر کو تصور میں لائیے۔ دنیا جہان میں قاعدہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس لئے قید و بند کی مصیبتوں میں ڈالا جاتا ہے کہ وہ اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے اور انہوں نے کسی کی عصمت پر ہاتھ ڈال دیا۔ یہاں معاملہ دگرگوں ہے۔ حضرت یوسفؑ کو اس لئے قید کی دھمکی دی جا رہی ہے کہ انہوں نے اپنے جذبات پر قابو کیوں رکھا! یہ پھر ایک نئی آزمائش تھی۔ محل کی آرام کی زندگی، ہر ایک پر حکومت، عزت و وقار، دولت و شہرت اور اس کے مقابلہ میں جیل خانہ کی عقوبت، حضرت یوسفؑ کو پورا پورا اختیار حاصل تھا کہ ان دونوں میں سے جسے چاہیں پسند کر لیں۔ انہوں نے ایقان و ایمان کی پوری قوت سے بلا تامل کہہ دیا کہ

قَالَ رَبِّ السُّجُنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ۗ وَالْأَنْصَرُ
عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَضْبُ إِلَيْهِنَّ ۚ وَأَكُنُّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۵ (۱۲/۳۳)

یوسفؑ نے (یہ سن کر) اللہ کے حضور دعا کی، خدایا! مجھے قید میں رہنا اس بات سے

کہیں زیادہ پسند ہے جس کی طرف یہ عورتیں بلارہی ہیں۔ سو تو مجھے اس کی توفیق عطا فرما کہ میں اس مرحلہ میں ثابت قدم رہوں۔ اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہو اور میں ان کی طرف مائل ہو گیا تو یہ بڑی تھی ناشناسی ہوگی۔

عورتوں کی نگاہوں میں حضرت یوسفؑ کا حسن صورت ہی تھا لیکن دیکھنے والی آنکھوں کے لئے اُن کے حسن سیرت کی جمال آفرینی حسن صورت سے کہیں بڑھ کر تھی۔

یہاں پھر دیکھیے، حضرت یوسفؑ نے یہی کہا ہے کہ ”مِمَّا يَدْعُونَ بِنِي الْاَيْدِي“ جس بات کی طرف مجھے یہ عورتیں بلارہی ہیں اس سے قید خانہ کہیں اچھا ہے۔ اس سے کبھی اس توجیہ کی تائید ہوتی ہے جسے ہم مجلس ضیافت والے واقعہ میں درج کر چکے ہیں، یعنی اس مجلس کے تمام اہتمامات اس غرض کے لئے تھے کہ وہ عورتیں حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کر لیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے طرح طرح کے مکر و فریب سے کام لیا تھا۔ انہیں میں سے ایک ہاتھ کاٹنے کا تریاچہ لے بھی تھا۔ ادھر سے خدا کے اس مخلص بندے نے اپنے رب کو مدد کے لئے پکارا اور ادھر سے اس کے رب نے اس کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا۔

فَاَسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَوَّرَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۗ اِنَّهُ هُوَ

السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (۱۲/۳۳)

تو دیکھو اس کے پروردگار نے اس کی دعا قبول کر لی اور اس سے عورتوں کی مکاریاں دفع

کر دیں۔ بلاشبہ وہی ہے (دعاؤں کا) سننے والا (اور سب کچھ) جاننے والا۔

بلا جرم قید و بند

جب عزیز مصر کی بیوی نے دیکھا کہ خالی دھمکی سے بھی کام نہیں چلا تو دھمکی کو سچ کر دکھانے کی سوچھی اور اپنی ہماراز عورتوں کے صلاح و مشورہ سے کچھ ایسی بات بنائی کہ عزیز اور اس کے متعلقین کو اسی میں مصلحت نظر آئی کہ حضرت یوسفؑ کو کچھ وقت کے لئے قید میں ڈال دیا جائے۔

لَمَّا بَدَا لَهُمْ مَنَ بَعْدَ مَا رَأَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهُ

حَتّٰى حِينٍ ۙ (۱۲/۳۵)

پھر (ایسا ہوا کہ) اگرچہ وہ لوگ (یعنی عزیز اور اُس کے خاندان کے آدمی یوسفؑ کی پاکدامنی کی

نشانیوں دیکھ چکے تھے پھر بھی انہیں یہی بات مناسب معلوم ہوئی کہ ایک خاص وقت تک کے لئے یوسف کو قید میں ڈال دیں۔

آگے بڑھنے سے پیشتر راستہ کے اس حصے پر ایک مرتبہ پھر ننگہ باز گشت ڈالتے۔ عزیز مصر دیکھ چکا تھا کہ اس کی بیوی حضرت یوسفؑ کی طرف کس طرح مائل ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہ تو وہ حضرت یوسفؑ کو محلات سے الگ کر سکا (اس لئے کہ اس کی بیوی کبھی ایسا نہ ہونے دیتی) اور نہ ہی اپنی بیوی کو اس کے مذموم ارادوں سے روک سکا۔ یہ سب اس لئے کہ اس قسم کی غلط تہذیب میں عورت کے مقابلہ میں مرد بیچارے کی حالت ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ اور یہ حالت اکیلے عزیز ہی کی نہ تھی۔ دیگر امراء دارا کین بھی ایسے ہی تھے۔ اس لئے کہ ان کی عورتوں کی حالت بھی ہمارے سامنے آچکی ہے، یعنی اس سوسائٹی کی عام معاشرتی حالت ہی ایسی ہو چکی تھی۔ پھر دیکھئے کہ ایک ناکام محبت عورت اپنے جذبہ انتقام میں کیا کچھ کر دیتی ہے؟ اور تیسرے یہ کہ مرد کس طرح عورتوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ عزیز اور اس کے گھرنے کے لوگ حضرت یوسفؑ کی راست بازی اور عصمتِ نفس کی نشانیاں دیکھ چکے تھے وہ سب کچھ جانتے تھے کہ قصور کس کا ہے۔ لیکن بایں ہمہ مجبور ہو گئے کہ امراة العزیز نے جو دمکی دی تھی اسے پورا کر دیا جائے۔

خدا فراموش سوسائٹی میں حق و انصاف کی اسی طرح مٹی پلید ہو کر تھی ہے۔

محلات کے نظم و نسق کا کارفرما یوسفؑ اب قید خانے کی مصیبتیں جھیل رہا ہے اور اس جرم میں کہ اس نے جذبات کو مشتعل کر دینے والے اسباب و مواقع میں بلند اخلاقی قدر کی جو خدا کی طرف سے متعین ہوئی تھی، پابندی کیوں کی! حضرت یوسفؑ کی پاک بازی، شرافتِ نفس، نیکو کاری کچھ چھپی ڈھکی نہ تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک حصہ اسی جگہ گزارا تھا جہاں انہیں اب قید میں ڈالا گیا تھا۔ اس لئے اب قید خانہ میں بھی ان کا احترام و تقدس سہم تھا۔ قید خانہ میں آپ کے ساتھ دو اور نوجوان بھی تھے۔ ایک بادشاہ کے ساقیوں کا سردار اور دوسرا دروغہ

قید خانہ کے ساقیوں کے خواب | مطبخ۔ یہ کسی معاملہ میں زیرِ عتاب آگئے اور قید خانہ میں ڈال دیئے گئے ان میں سے ہر ایک نے ایک رات خواب دیکھے۔ اور چونکہ حضرت یوسفؑ کی فراست اور

بزرگی پہلے سے معروف تھی، وہ ان کے پاس گئے کہ اپنے خوابوں کی تعبیر دریافت کریں۔
 وَدَخَلَ مَعَهُ السَّبْعَ فَتَلِينَ ط قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرَيْتُ
 آعَصِرُ خَمْراً ج وَ قَالَ الْآخَرُ إِنِّي أَرَيْتُ أَخِي قُوتٌ
 رَأْسِي خُبْرًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ط نَبَتْنَا بِتَأْوِيلِهِ ه إِنَّا
 تَرَكْنَاكَ مِنَ الْخُسِيِّينَ ه (۱۲/۳۶)

اور (دیکھو) ایسا ہوا کہ یوسف کے ساتھ دو جوان آدمی اور بھی قید خانے میں داخل ہوئے۔
 ان میں سے ایک نے (یوسف سے) کہا، مجھے (خواب میں) ایسا دکھائی دیا ہے کہ میں شراب
 (بنانے) کے لئے (انگور کا عرق) پھوڑ رہا ہوں، دوسرے نے کہا، مجھے ایسا دکھائی دیا ہے
 کہ سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں اور پرند اُسے کھا رہے ہیں، (اور دونوں نے درخواست کی
 کہ) ہمیں بتلا دو، اس بات کا نتیجہ نکلنے والا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ تم بڑے نیک آدمی ہو۔

تعبیر حضرت یوسفؑ کی نگاہوں کے سامنے تھی لیکن آپ نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ وہ نوجوان اپنی
 ضرورت کی غرض سے آپ کی طرف خاص طور پر متوجہ تھے، آپ نے سوچا کہ دینِ حقیقی کے متعلق ایک اعلیٰ
 بات اُن کے کان میں ڈال دی جائے۔ ممکن ہے وہ اسے بادشاہ کے کانوں تک پہنچا سکیں۔ اس غرض کے
 لئے حضرت یوسفؑ نے خوابوں کی تعبیر بتانے کو تھوڑا سا التوا میں ڈال دیا۔ قرآن کریم میں ہے۔

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقْنِيهِ إِلَّا نَبَأُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ
 يَأْتِيكُمَا ط ذَلِكُمْ مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ه إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّو
 يُؤْمِنُونَ بِآلِهَةٍ وَ هُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ه وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ
 آبَائِي إِنْبِرَهِيمَ وَ إِسْحَاقَ وَ يَعْقُوبَ ط مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ
 بِآلِهَةٍ مِنْ شَيْءٍ ط ذَلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَ عَلَى النَّاسِ
 وَ لَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ه (۱۲/۳۸-۳۷)

یوسف نے کہا (گھبراؤ نہیں) قبل اس کے کہ تمہارا مقررہ کھانا تم تک پہنچے، میں تمہارے خوابوں
 کا حال تمہیں بتلا دوں گا۔ اس بات کا علم بھی منجملہ ان باتوں کے ہے جن کی فراست میرے
 خدا نے مجھے عطا فرمائی ہے۔ (لیکن پہلے یہ سن لو کہ میں کون ہوں اور میرا مسلک کیا ہے)۔

میں نے ان لوگوں کی ملت ترک کی جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی منکر ہیں۔ میں نے اپنے باپ دادوں یعنی ابراہیم اور اسحق اور یعقوب کی ملت کی پیروی کی، (ہم اولادِ ابراہیم) ایسا نہیں کر سکتے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک ٹھہرائیں۔ یہ (ملت) اللہ کا ایک فضل ہے جو اس نے ہم پر اور لوگوں پر کیا ہے۔ لیکن اکثر آدمی ہیں جو اس نعمت کا شکر نہیں بجالاتے۔

وَعِظُ يُوْسُفِ | اپنے کیش و مشرب کا یوں تعارف کرانے کے بعد اب مَا كَانَ لَنَا آتٌ لِّلشِّرِكِ بِإِذْنِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ کی تشریح ارشاد فرمائی اور اس میں دینِ خداوندی کی اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان کر دیا جو اسلام کا اصل الاصول ہے۔ فرمایا:-

يٰصَاحِبِي السُّعْبِيْنَ ءَ اَزْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَالِدُ الْقَهَّارُ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اِلَّا اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَاٰبَاؤُكُمْ مَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَقْرَبُ اِلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِنَّا كَاٰتِلٰكُ الَّذِيْنَ اَلَقِيْمُ وَاَلَكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۴۰-۳۹)

اے یارا! یہ مجلس! (تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ) جدا جدا آقاؤں کا ہونا بہتر ہے یا ایک اللہ کا جو یگانہ اور سب پر غالب ہے؟ تم اس کے سوا جن ہستیوں کی محکومیت اور اطاعت اختیار کرتے ہو، ان کی حقیقت اس سے زیادہ کیا ہے کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نہیں اتاری۔ حکومت تو اللہ ہی کے لئے ہے۔ اُس کا فرمان یہ ہے کہ صرف اسی کی عبودیت (محکومیت و اطاعت) اختیار کرو اور کسی کی نہ کرو۔ یہی سیدھا دین ہے، مگر اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔

اسلام کیا ہے؟ وعظِ یوسفی کے ان مختصر سے جملوں کی عملی تفسیر۔ یوں کہئے کہ سارا قرآن اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہجہاں کو جب قلعہ آگرہ میں قید کر دیا گیا تو اس نے ایک نادارہ کار صنّاع سے کہا کہ اس کے کمرے کی دیوار میں ایک چھوٹا سا نگینہ اس انداز سے ٹکا دے کہ وہ کمرے کے اندر جہاں بھی ہوا اُٹھتے بیٹھتے پورے کا پورا تاج اس کی نگاہوں کے سامنے رہے۔ وعظِ یوسفی کے ان چھوٹے چھوٹے نگینوں کو دیکھئے۔ ایک ایک نگینہ میں پورا پورا "تاج" کس طرح جھلمل جھلمل کرتا نظر آ رہا ہے۔!

حکومت صرف خدا کی ہے | اءِ اَرْبَابٍ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ
الْقَهَّارُ ۝ (۱۲/۳۹) توحید کی پوری کائنات اس نگیں

کے اندر سمائی ہوئی ہے۔ انسان اسی کے سامنے جھکتا ہے جس میں (بزرگم خویش) شان ربوبیت سمجھتا ہے جس کے متعلق اسے خیال ہوتا ہے کہ مجھے کچھ فائدہ پہنچا سکتا یا نقصان دے سکتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اس خدا تراشی کے مسلک میں اُسے دنیا میں کس کس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے اور وہ کن کن چوکھٹوں کی ذلت آمیز خاک سے اپنی پیشانی کو داغدار بناتا ہے۔

گاہ اور را با کلیسا ساز باز گاہ پیش دیریاں اندر نیاز
دین او آتین او سوو آگری است عنتری اندر لباس حیدری است (اقبلًا)
مثل مشہور ہے کہ ایک شخص بیک وقت دو آقاؤں کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ اس سے اُس "عملی مشرک" کی کیفیت کا اندازہ لگائیے جسے اپنی ہر ضرورت کے لئے ایک نئے آقا کے سنگ آستان پر جبین سائی کرنی پڑے۔ اور پھر ستم ظریفی یہ کہ ان میں سے کسی میں بھی وہ قوت نہ ہو جس کے احساس سے وہ اُن کے سامنے جھکتا ہے۔ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِہٖ اِلَّا اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوہَا اَنْتُمْ وَاٰبَاؤُكُمْ
مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِہَا مِنْ سُلْطٰنٍ ط سوجب کسی انسان میں ربوبیت کی قدرت نہیں تو ایک انسان کسی دوسرے انسان کی محکومیت کیوں اختیار کرے؟ حکومت صرف اس ذات کو زیبا ہے جس کے قانون کے مطابق نفع و نقصان کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس لئے سُن رُکھو کہ اِن الْحٰکِمِ اِلَّا بِاللّٰهِ (۱۲/۴۰)
اس کا حکم ہے کہ اس کے قوانین کے سوا اور کسی قانون کی اطاعت نہ کرو۔ یہ ہے (دین النقیم) محکم نظام جس کے تابع انسان کو چلنا چاہیئے۔

وَلٰكِنۡ اَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۴۰)

تعبیر | اس کے بعد حضرت یوسف نے ان نوجوانوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر بتائی۔
يٰۤاَصْحٰبِ الْبَيْتِ اَمَّا اَحَدُكُمْ فَيَسْتَقِي رِبِّہٖ حَمْرًا
وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُضَلِّبُ فَنٰكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَاسِہٖ قُضِيَ الْاَمْرُ
الَّذِيۡ فِيْہٖ تَسْتَفْتِيْنَ ۝ (۱۲/۴۱)

اے یارانِ مجلس! اب اپنے اپنے خوابوں کا مطلب سُن لو تم میں ایک آدمی (وہ ہے جس نے

دیکھا کہ انکو رنجور رہا ہے) تو وہ (قید سے چھوٹ جائے گا اور بدستور سابق) اپنے آقا کو شراب پلائے گا اور دوسرا آدمی (وہ ہے جس نے دیکھا کہ اس کے سر پر روٹی ہے اور پرند روٹی کھا رہے ہیں) تو وہ سوئی پر چڑھا یا جائے گا اور پرند اس کا سر (نوح نوح کر) کھائیں گے۔ تمہارے خوابوں کی یہ تعبیر ہے۔ تعبیر کیا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ ایسا ہی ہوگا۔ میرا اندازہ یہی ہے۔

جس کے متعلق سمجھا تھا کہ وہ مصائب سے نجات پا جائے گا، حضرت یوسفؑ نے اس سے کہا کہ موقع پا کر بادشاہ سے ان امور کا تذکرہ کر دینا جو میں نے تم سے کہے ہیں۔ لیکن ان باتوں کا اثر اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب بادشاہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ قیدی بے گناہ ہے۔ ورنہ ایک مجرم قیدی کے پند و نصائح پر کون کان دھرتا ہے۔ اس لئے یہ بھی کہا ہوگا کہ بادشاہ سے میری قید کی حقیقت کھی کہہ دینا۔ وہ دونوں لو جو ان قید سے نکال لئے گئے اور حضرت یوسفؑ کی بیان کردہ تعبیر کے مطابق ہی ان کے ساتھ سلوک ہوا لیکن وہ نوحان جو اپنے منصب پر محال ہو گیا تھا حضرت یوسفؑ کی بات بھول گیا اور یوں حضرت یوسفؑ ایک عرصہ مزید تک قید میں رہے۔

وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ
فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَمَّا فِي السِّبْيَانِ بَضَعَ سِنِينَ ۙ (۱۳۱)
اور یوسف نے جس آدمی کے متعلق اندازہ لگایا تھا کہ نجات پائے گا اس نے کہا کہ اپنے آقا کے پاس جب جاؤ تو مجھے یاد رکھنا (یعنی میرا حال اس سے ضرور کہہ دینا) لیکن جب تعبیر کے بموجب اس نے نجات پائی تو شیطان نے یہ بات بھلا دی کہ اپنے آقا کے حضور پہنچ کر اسے یاد رکھتا۔ پس یوسف کئی برس تک قید خانہ میں رہا۔

(ان خوابوں کی تعبیر کے متعلق آخر میں لکھا جائے گا)۔

بادشاہ کا خواب | وقت گزرتا گیا۔ حتیٰ کہ ایک رات بادشاہ نے عجیب و غریب خواب دیکھا جس کی تعبیر بتانے سے دربار کے اہل دانش عاجز رہ گئے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ
عِجَافٌ ۖ وَسَبْعٌ سُوسَاتٍ خُضِرَ ۖ وَأُخْرَىٰ يُسْبِغُ بِهَا الْمَلَأَ

أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِنَّ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ ۝ قَالُوا أَضْغَاثُ
 أَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ ۝ (۱۲/۴۳-۴۴)

اور پھر ایسا ہوا کہ ایک دن بادشاہ نے (اپنے تمام درباریوں کو جمع کر کے) کہا کہ میں (خواب میں) کیا دیکھتا ہوں کہ سات گائیں میں موٹی تازی۔ انہیں سات دہلی تیلی گائیں نکل رہی ہیں اور سات بالیں ہری ہیں اور سات دوسری سوکھی۔ اسے اہل دربار! اگر تم خواب کا مطلب بتا سکتے ہو تو بتلاؤ میرے خواب کی تعبیر کیا ہے۔

درباریوں نے (خورد و خوض کے بعد) کہا: ”یہ پریشان خواب و خیالات ہیں (کوئی ایسی بات نہیں جس کا کوئی خاص مطلب ہو)۔ ہم پریشان خوابوں کا حل نہیں جانتے۔“

اہل دربار میں جب اس کا چرچا ہوا تو ساقیوں کے سردار کو اپنا قید خانہ کا خواب اور حضرت یوسفؑ کی بتائی ہوئی تعبیر اور تعبیر کی صداقت یاد آگئی۔

وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنْتُمْ بِتَأْوِيلِهِ
 فَأَرْسَلُونَهُ ۝ (۱۲/۴۵)

اور جس آدمی نے (اُن) دو قیدیوں میں سے نجات پائی تھی، اسے مدت کے بعد (یوسف کی) بات یاد آئی وہ (خواب کا معاملہ سن کر) بول اٹھا ”میں اس خواب کا تہیج تمہیں بتلا دوں گا۔ تم مجھے (ذرا قید خانے تک) جانے دو۔“

چنانچہ وہ بھاگا بھاگا حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچا۔

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ
 سَبْعُ عِجَافٍ ۚ وَ سَبْعِ سُنبُلَاتٍ خُضْرًا ۚ أُخْرَىٰ سَبْعٌ لِّعَلِيٍّ
 أَرْجِمُهُنَّ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ (۱۲/۴۶)

چنانچہ وہ قید خانہ میں آیا اور کہا ”اے یوسف! اے کہ تو مجھے سچائی ہے! اس (خواب) کی ہمیں تعبیر بتا کہ سات موٹی تازی گایوں کو سات دہلی تیلی گائیں نکل رہی ہیں۔ اور سات بالیں ہری ہیں سات سوکھی۔ تاکہ ان لوگوں کے پاس واپس جاسکوں (جنہوں نے مجھے بھیجا ہے)۔ کیا مجھ سے ہے وہ (تمہاری قدر و منزلت) معلوم کر لیں۔“

غور کیجئے۔ یہ وہی نوجوان ہے جسے حضرت یوسف نے اس کی رہائی کا مزدہ سُنایا تھا اور تاکید کی تھی کہ وہ اس کا ذکر بادشاہ سے کرے۔ لیکن وہ نہ صرف یہ کہ بادشاہ سے اس کا ذکر کرنا ہی بھول گیا بلکہ اظہارِ شکر کے لئے بھی اس کے پاس نہ آیا اور اب جب کہ ایک اور غرض لاحق ہوئی، تو حضرت یوسفؑ یاد آئے۔ کوئی نام انسان ہوتا تو سب سے پہلے اس نوجوان سے ان تمام باتوں کا گلہ کرتا اور معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر اس سے کہتا کہ میں تمہیں اس کی تعبیر کیوں بتاؤں۔ بادشاہ کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے تو مجھے یہاں سے نکالے میں خود جا کر بتاؤں گا۔ لیکن ایک عام انسان اور اللہ کے مخلص بنوں **تعبیر اور تدبیر** میں کشادہ نگہی اور وسعتِ ظرف کا یہی فرق ہوتا ہے۔ آپ نے نہ اس سے کسی قسم کی شکایت کی اور نہ ہی اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ تعبیر بھی بتادی اور اس تعبیر کے ساتھ تدبیر بھی۔

قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا ۖ فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَٰلِكَ رُزُقُوكُمْ فِي
سُنْبِلَةٍ ۖ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَأْكُلُونَ ۚ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعُ
سِنٍ آدُ ۖ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَحْصِنُونَ ۚ
ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغْلَبُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ۚ

(۱۲/۴۹-۵۰)

یوسف نے کہا۔۔۔ (اس خواب کی تعبیر اور اس کی بنا پر تمہیں جو کچھ کرنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ سات برس تک تم لگاتار کھیتی کرتے رہو گے (ان برسوں میں خوب بڑھتی ہوگی)۔ پس (جب فصل کاٹنے کا وقت آیا کرے تو) جو کچھ کاٹو اسے اس کی بالوں ہی میں رہنے دو (تاکہ اناج گلے بڑے نہیں) اور صرف اتنی مقدار الگ کر لیا کرو جو تمہارے کھانے کے لئے (ضروری) ہو۔ پھر اس کے بعد سات بڑے سخت مصیبت کے برس آئیں گے جو وہ سب ذخیروں کھا جائیں گے جو تم نے (اس طرح) پہلے سے جمع کر رکھا ہوگا۔ مگر ہاں تھوڑا سا جو تم (بیج کے لئے) روک رکھو گے، بچ رہے گا۔ پھر اس کے بعد ایک برس ایسا آئے گا کہ لوگوں پر خوب بارش بھیجی جائے گا۔ لوگ اس میں (پھلوں اور دانوں سے) عرق پچوڑیں گے۔

جب بادشاہ نے اس تعبیر اور اس کے ساتھ حسن تدبیر کو سُننا تو اس پر حضرت یوسفؑ کی دانش و سنش اور فراست و تدبیر کے جوہر آشکارا ہو گئے۔ اور اس نے فوراً حکم دیا کہ اس شخص کو قید خانہ سے رہا کر کے دربار

میں لایا جائے۔ چنانچہ بادشاہ کا قاصد، رہائی کا حکم لے کر حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچا۔ اس مقام پر سیرت یوسفی کا جمال اپنی انتہائی رعنائیوں پر نظر آتا ہے۔ جب تک قرآن کریم نہ بتائے آپ تصور میں بھی نہیں لاسکتے کہ انہوں نے قاصد کو کیا جواب دیا ہوگا! اس لئے کہ اس کے بعد جواب کیسا؟

سیرت یوسفی کی ایک اور جھلک | یہی نظر آتا ہے کہ آپ نے قید و بند کے مصائب سے نجات ملنے کو غنیمت سمجھا ہوگا اور فوراً اس کے ساتھ دوبارہ تشریف لے گئے ہوں گے۔ ہر شخص ایسے موقع پر یہی کچھ کرتا۔ لیکن جس کی خودی میں اتنی بیداری اور جس کے کیر پکڑ میں اتنی بلندی پیدا ہو چکی ہو جو اللہ کے منتخب بندوں کا حصہ ہوتی ہے وہ یہ نہیں کرے گا اس سے الگ کچھ اور کرے گا۔ حضرت یوسفؑ نے کہا کہ بادشاہ کی توجہ فرمائی کا شکریہ، لیکن میں اس کے رجم و کرم کے صدقے قید خانہ سے نکلنا نہیں چاہتا۔ اس سے جا کر کہو کہ پہلے میرے مقدر کی تحقیق کرے اور جب آئے یقین ہو جائے کہ میں بے گناہ ہوں تو پھر میری رہائی کا حکم بھیجے۔ میرا مقصد قید و بند کے مصائب سے خلاصی حاصل کرنا نہیں، اپنی بریت ثابت کرنا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اٰتُونِي بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَاۤءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ اَرْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الَّتِي قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۗ اِنَّ رَبِّيۡ يَكْفِيۡهِنَّ عِلْمًا ۝ (۱۲/۵۰)

(جب اُس آدمی نے یہ بات بادشاہ تک پہنچائی تو) بادشاہ نے کہا "یوسف کو (فوراً) میرے پاس لاؤ"۔ لیکن جب (بادشاہ کا) پیامبر یوسف کے پاس پہنچا تو اس نے کہا "میں یوں نہیں جاؤں گا) تم اپنے آقا کے پاس جاؤ اور (میری طرف سے) دریافت کرو کہ ان عورتوں کا معاملہ کیا تھا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے (میں چاہتا ہوں پہلے اس کا فیصلہ ہو جائے جیسی کچھ منکاریاں انہوں نے کی تھیں میرا پروردگار اسے خوب جانتا ہے"۔

تورات کا بیان | اللہ اکبر! اتنی بلند سیرت کا مظاہرہ ہے۔ لیکن تورات میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ وہاں یہی مذکور ہے کہ حضرت یوسفؑ نے لباس تبدیل کیا اور فوراً

دوبارہ چلے گئے۔

تب فرعون نے یوسف کو بلوایا وہ جلد اسے قید خانہ سے لے آئے اور اس نے سر منڈایا اور کپڑے

بدل کے فرعون کے حضور آیا۔ (پیدائش ۴۱/۱۴)
 یہاں پہنچ کر ہمیں اپنے ہاں کی بھی ایک بات یاد آگئی۔ تورات کے متعلق تو ہمارا یقین ہے کہ وہ محرف ہے،
 لیکن مقام تاسف ہے کہ ہماری ان کتابوں میں جنہیں
ہمارے ہاں کی ایک روایت "اصح الکتب" کہا جاتا ہے اس سے بھی کچھ زیادہ پایا جاتا
 ہے۔ بخاری شریف میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جیسے بادشاہ کا قاصد آیا تھا اگر میں حضرت یوسفؑ کی جگہ ہوتا
 تو فوراً اس کے ساتھ چلا جاتا۔

وَأَلْبَسْتَنِي فِي السَّبْتِ مَاءً لَبِثًا يُوَسِّفُ لِأَجْبَتِ الدَّاعِي.
 اگر قیدخانہ میں میں اتنے عرصہ تک رہا ہوتا ہتھ یوسف رہے تو میں قاصد
 کے ساتھ ہولیتا۔

صاف نظر آتا ہے کہ اس قسم کی روایتیں معاندین اسلام (یہود و نصاریٰ) کی کار فرمایوں کا نتیجہ ہیں جو انبیاءِ نبی
 اسرائیل کے مقابلہ میں حضورؐ کی سیرت اقدس کو گھٹا کر پیش کرنا چاہتے تھے۔ لیکن گلہ ان پر نہیں، انہوں پر ہے
 کہ یہ اس قسم کی روایتوں کو سینہ سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور اگر حضورؐ کی عظمت و تقدس کا خیال کسی کو
 اس امر پر مجبور کر دے کہ وہ ان روایات کو حضورؐ کی طرف منسوب کرنے کی جرات نہ کرے تو اس کی تکفیر و تفسیق
 کے فتاویٰ صادر کر دیئے جاتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کہ یہ روایتیں بخاری اور مسلم کی کتابوں میں درج
 ہیں یعنی حضورؐ کی شان اقدس میں (معاذ اللہ) طعن پایا جائے تو مضائقہ نہیں، لیکن بخاری اور مسلم میں غلط روایات
 کے امکان کا خیال نہ پیدا ہونے پائے۔ لیکن حقیقت میں لگا ہوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ غلطی سے ہر اس
 آسمان کے نیچے کتاب اللہ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۶۳﴾

فرعون حضرت یوسفؑ کی دانش و عینیت کا تو پہلے ہی متعرف ہو چکا تھا۔ جب آپ کا یہ جواب سنا تو آپ کی
 معاملہ کی تحقیق | بلندی سیرت کا احترام بھی اس کے دل میں اُتر گیا۔ اس نے فوراً تحقیقات کا حکم دیدیا اور
 ان عورتوں سے دریافت کیا کہ بتاؤ، اصل معاملہ کیا ہے؟

قَالَ مَا خَطْبُكَ إِذْ رَأَوْتَنِي يُوَسِّفُ عَنْ نَفْسِهِ ط قُلْنَ حَاشَ

بَلِّغْ مَا عَلَّمْنَا عَلَيْكَ مِنْ سُورَةٍ ۝ (۱۲/۵۱)

(اس پر) بادشاہ نے (ان عورتوں کو بلایا اور) کہا ”صاف صاف بتاؤ کہ تمہیں کیا معاملہ پیش آیا تھا، جب تم نے یوسف پر ڈرے ڈالے تھے کہ اسے اپنی طرف مائل کر لو“ وہ بولیں ”عاشا اللہ! ہم نے اس میں برائی کی کوئی بات نہیں پائی“

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہاں ظاہر ہے کہ ان عورتوں نے بھی حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا اور مجلسِ ضیافت کی تمام حیلہ جوئیاں اور فریب اندازیاں اسی غرض کے لئے تھیں۔ اور اس کے بعد حضرت یوسفؑ کو قید خانہ میں بھجوانا بھی اُنہی کے دامِ تزویج کی ایک کڑی تھی جو امراۃ العزیز کے ایمان پر تیار کی گئی تھی۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے امراۃ العزیز کا نام نہیں لیا، صرف ان عورتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس لئے کہ قیص پھٹنے والے واقعہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ عزیز نے حضرت یوسفؑ سے کہا تھا کہ اس معاملہ کو رفت گذشت سمجھو۔ حضرت یوسفؑ کو ابھی تک اس بات کا خیال تھا اس لئے اپنے مرتب کی بات کا پاس کیا اور اس کی بیوی کا نام لینا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن جب عورتوں کے معاملہ کی تحقیق ہوئی تو سب کچھ بے نقاب ہو گیا۔ اس دوران میں عزیز مصر کی بیوی کے جذبات کی آندھیاں بھی اُتر چکی تھیں اور وہ حضرت یوسفؑ کی بلندی سیرت کی قائل ہو چکی تھی۔ لاکھ جذبات انتقام ہوں سیرت کی بلندی اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جب دوسری عورتوں نے حضرت یوسفؑ کی پاکیزگی داماں کی قسم اٹھائی تو

حقیقت بے نقاب

اس سے بھی نہ رہا گیا اور اس نے برملا کہہ دیا کہ یہ معاملہ تو ایک طرف، خود میرے معاملہ میں بھی یوسفؑ کا کوئی قصور نہ تھا۔

قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ اِنَّكَ حَصْحَصَ الْحَقُّ..... (۱۲/۵۱)

(یہ سُن کر) عزیز کی بیوی بھی ابلے اختیار بول اُٹھی! ”جو حقیقت تھی وہ اب ظاہر ہو گئی۔ ہاں وہ میں ہی تھی جس نے یوسف پر ڈرے ڈالے کہ اپنا دل ہار بیٹھے۔ بلاشبہ وہ اپنے بیان میں بالکل سچا ہے۔“

اس پر حضرت یوسفؑ نے کہا۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّي كُنَّا بِالْغَيْبِ عَلٰمًا ۗ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ

كَيْدَ الْخَائِبِينَ ۝ (۱۲/۵۳)

میں نے اپنے مقدمہ کی تحقیق اسی لئے کرائی تھی کہ عزیز کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کے معاملے میں خیانت نہیں کی، نیز اس لئے کہ (واضح ہو جائے) کہ اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی کامیابی کی راہ نہیں کھولتا۔

پھر عزیزِ مصر کی بیوی نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

وَمَا أُبْرِيءُ نَفْسِي زَانِ النَّفْسِ زَوَّارَةً بِالسُّوءِ إِلَّا مَا

رَحِمَ رَبِّي ۝ إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ (۱۲/۵۳)

میں اپنے آپ کی پاکیزگی کا دعویٰ نہیں کرتی۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کے حیوانی جذبات اسے برائی کے لئے آمادہ کرتے رہتے ہیں۔ اس سے وہی بچ سکتا ہے جس پر میرا پروردگار رحم کرے۔ بلاشبہ میرا پروردگار بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

کون تھا جس کے دل میں سیرتِ یوسفی کی اس درخشندگی سے احترام و عظمت کے جذبات بیدار نہ ہو جاتے، دانش و بینش، تدبیر و فراست کے ساتھ ساتھ سیرت کی اتنی بلندی اور کیر پیٹر کی اتنی پختگی، بادشاہ کی نگہ جو ہر شناس نے فوراً اس کندن کو پہچان لیا۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۚ اَسْتَعْلِضُهُ لِنَفْسِي ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهُ

قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ اَمِينٌ ۝ (۱۲/۵۴)

اور (پھر) بادشاہ نے حکم دیا "یوسف کو میرے پاس لاؤ کہ اسے خاص اپنے کاموں کے لئے مقرر کروں۔ پھر جب (وہ آیا) بادشاہ نے اس سے گفتگو کی (تو یوسف کے توجہ اس پر اور کھلے) تب اسے کہنا پڑا کہ "آج کے دن تو ہماری نگاہوں میں بڑا ہی صاحبِ قدر و منزلت اور امانت دار انسان ہے!"

اللہ اکبر! کنعان کا چرواہا، بازارِ مصر میں نیلام شدہ غلام، برسوں کا قیدی اور بادشاہ کی طرف سے ان الفاظ کا مخاطب کہ

اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ اَمِينٌ

حضرت یوسف نے سلطنت کے نظم و نسق کے مختلف شعبوں پر نگاہ ڈالی اور فیصلہ کر لیا کہ کس شعبہ

منصب بلند پر سفر فرازی کو اپنے ہاتھ میں رکھنے سے باقی تمام انتظامات اپنی اپنی جگہ درست چلیں گے۔

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۗ إِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْكُمْ ۝ (۱۲/۵۵)
یوسف نے کہا کہ زمین کے خزانوں پر مجھے مختار کر دیجئے۔ میں حفاظت کر سکتا ہوں اور میں اس کام کا جتنے والا ہوں۔ (چنانچہ بادشاہ نے زمین کی پیدادار کا انظم و نسق ان کے سپرد کر دیا)۔

غور کیجئے! جب حضرت یوسفؑ عزیز کے محلات میں پہنچے ہیں اور وہاں کا انظم و نسق ان کے اعتماد میں سپرد کیا گیا ہے، اللہ نے کہا تھا،

وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِن تَأْوِيلِ
الْأَحَادِيثِ ۗ وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَى أَمْرِهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۱۲/۲۱)

اور (دیکھو) اس طرح ہم نے یوسف کا سر زمین مصر میں قدم بٹھا دیا اور مقصود یہ تھا کہ ہم اس طرح اسے باتوں کا نتیجہ اور مطلب نکالنا سکھادیں۔ اور اللہ کو جو معاملہ کرنا ہوتا ہے وہ کر کے رہتا ہے۔ لیکن اکثر آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے!

یعنی اس ممکن سے غرض یہ تھی کہ معاملات فہمی اور سُن تدبیر کے مختلف گوشوں کی تعلیم دی جائے۔ اس عملی تعلیم کا یہ نتیجہ تھا کہ آج حضرت یوسفؑ اتنے بڑے انتظام کو سنبھالنے کے قابل ہو گئے یہ سنا پہنچ کر فرمایا:۔

وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ ۗ يَتَّبِعُونَ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۗ نُصِيبُ
بِرَحْمَتِنَا مَن نَّشَاءُ ۗ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (۱۲/۵۶)

اور (دیکھو) اس طرح ہم نے سر زمین مصر میں یوسف کے قدم بٹھا دیئے کہ جس جگہ چاہے اختیار رکھے۔ ہم جسے چاہتے ہیں (اسی طرح) اپنی رحمت سے فیض یاب کر دیتے ہیں اور نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے۔

ممکن فی الارض اور ایسا ممکن کہ آپ کے اختیارات میں کوئی دخل انداز نہ ہو۔ جہاں چاہیں اپنا حکم چلاویں۔

تمکن فی الارض | دنیا میں حسن عمل اور تطہیرِ فکر و نظر کی اس سے بڑی جزا اور کیا ہو سکتی ہے۔ باقی رہی اس دنیا سے اگلی منزل، سو وہاں کے مناصب و مدارج کے کیا کہنے!

وَلَا جُرُ الْاُخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ (۱۲/۵۷)
اور جو لوگ (اللہ پر) ایمان لائے اور (بد عملیوں سے) بچتے رہے، ان کے لئے تو آخرت کا اجر اس سے کہیں بہتر ہے۔

حضرت یوسفؑ نے اپنی اسکیم کے مطابق فاصلہ اناج کا ذخیرہ کر لیا۔ اس کے بعد قحط سالی شروع ہوئی تو مصر کے ارد گرد کے علاقوں کے لوگ بھی غلہ لینے کے لئے اسی چشمہ و فیض کی طرف آنے شروع ہوئے۔ حضرت یعقوبؑ کا قبیلہ بھی اس مصیبت میں گرفتار ہوا تو برادرانِ یوسفؑ بھی غلہ خریدنے آئے۔ حضرت یوسفؑ نے انہیں پہچان لیا لیکن چونکہ یہ بات ان کے بھائیوں کے حیطہ تصور میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ یوسف اس مقام بلند پر فائز ہوگا اس لئے انہوں نے آپ کو نہ پہچانا۔

وَجَاءَ اِخْوَتُهُ يُوْسُفَ فَاذْكُرُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفُوْهُمْ وَهُمْ
لَهٗ مُنْكَرُوْنَ ۝ (۱۲/۵۸)

اور (پھر قحط کے سالوں میں) ایسا ہوا کہ یوسف کے بھائی (کنعان سے غلہ خریدنے مصر) آئے۔ یوسف نے انہیں پہچان لیا لیکن انہوں نے نہیں پہچانا۔

بھائی غلہ لینے کے لئے آئے | ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ نے ان سے ان کے گھر کے تمام حالات کرید کرید کر پوچھے ہوں گے اور اس طرح باتوں باتوں میں یہ بھی ان سے کہلوایا ہوگا کہ ان کا ایک سوتیلہ بھائی اور بھی ہے جو باپ کے پاس ہے۔ چنانچہ وہ واپس جانے لگے تو آپ نے ان سے کہا کہ اب کے لوٹ کر آنا تو اپنے سوتیلے بھائی (بن یامین) کو بھی ساتھ لانا۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهٰزِهِمْ قَالَتْ اُنْتُنِيْ بِاَخِيْ لَكُمْ مِّنْ
اٰبِيْكُمْ ۚ اَوْ تَرُوْنَ اَنِّيْ اَدْفِي الْكَيْلَ وَ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝
فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ

وَاَوْ تَقْرُبُوْنَ ۝ (۵۹ - ۱۲/۴۰)

اور جب یوسف نے ان کا سامان مہیا کر دیا تو (جانے وقت) کہا "اب کے آنا تو اپنے سوتیلے بھائی (بن یامین) کو بھی ساتھ لانا۔ تم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ میں تمہیں پوری تول (غلہ) دینا ہوں۔ اور (باہر سے آنے والوں کے لئے) بہتر مہمان نواز ہوں۔ لیکن اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے، تو پھر یاد رکھو، نہ تو ہمارے لئے میرے پاس تول کا غلہ ہوگا، نہ تم میرے نزدیک جگہ پاؤ گے۔

انہوں نے کہا:

قَالُوْا سَنُرَادُ عَنْهُ اَبَاؤُ دَا اِنَّا لَفَاعِلُوْنَ ۝ (۱۲/۴۱)

انہوں نے کہا "ہم اس کے باپ کو اس بات کی ترغیب دیں گے اور ہم ضرور ایسا کریں گے۔"

حضرت یوسف نے ان کے دوبارہ آنے کو اور نچتہ کرنے کے لئے ان کی پونجی بھی ان کی بوریلوں میں رکھوا دی۔

وَقَالَ لِفَتْيَانِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِجَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَا
اِذَا اُنْقَلَبُوْا اِلَى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ (۱۲/۴۲)

اور یوسف نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا، "ان لوگوں کی پونجی (جس کے بدلے انہوں نے غلہ مول لیا ہے) انہی کی بوریلوں میں رکھ دو جب یہ لوگ اپنے گھر کی طرف لوٹیں گے تو بہت ممکن ہے اپنی پونجی دیکھ کر پہچان لیں (کہ لوٹا دی گئی) اور پھر عجب نہیں کہ دوبارہ آئیں۔"

انہوں نے واپس جا کر حضرت یعقوبؑ سے "امیر مصر" (یعنی حضرت یوسفؑ) کی شرط بیان کی۔
فَلَمَّا رَجَعُوْا اِلَى اٰبِيْهِمْ قَالُوْا يَا اَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَارْسَلْ
مَعَنَا اَخَانًا نَّكْتُلُ دَا اِنَّا لَخٰفِضُوْنَ ۝ (۱۲/۴۳)

پھر جب یہ لوگ اپنے باپ کے پاس لوٹ کر گئے تو کہا "اے ہمارے باپ! آئندہ کو غلہ کی فروخت ہم پر بند کر دی گئی ہے۔ پس ہمارے بھائی (بن یامین) کو ہمارے ساتھ بھیج دے کہ غلہ خرید لائیں اور ہم اس کے نگہبان ہیں۔"

اس پر حضرت یعقوبؑ نے فرمایا،

قَالَ هَلْ أَمْنَكُمُ عَلَيْهِ إِلَّا كَمَا أَمِنْتُكُمْ عَلَىٰ آخِنِهِ مِنْ قَبْلُ
فَإِنَّهُ خَيْرٌ حَفِظًا مِنْ ذَا هُوَ أَرْحَمُ الرَّحِمِينَ ۝ (۱۲/۶۳)

باپ نے (یہ سن کر کہا) ”کیا میں اس کے لئے اسی طرح تمہارا اعتبار کروں جس طرح پہلے اس کے بھائی (یوسف) کے بارے میں کر چکا ہوں؟ سو خدا ہی سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور اس سے بڑھ کر رحم کرنے والا کوئی نہیں!“

اس کے بعد جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو اس میں اپنی پونجی موجود پائی۔ اس پر حضرت یوسفؑ کی توقع کے مطابق انہوں نے باپ سے مزید اصرار شروع کر دیا۔

وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَآئِعَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ
.... ذَلِكَ كَيْلٌ لِّسَيِّئَاتِهِ ۝ (۱۲/۶۵)

اور جب ان لوگوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کی پونجی انہی کو لوٹا دی گئی ہے۔ تب انہوں نے (اپنے باپ سے) کہا ”اے ہمارے باپ! اس سے زیادہ اور ہمیں کیا چاہیئے؟ دیکھ یہ ہماری پونجی ہے جو ہمیں لوٹا دی گئی ہے۔ (ہمیں اس نے غلہ بھی دے دیا اور قیمت بھی واپس کر دی۔ پس ہمیں اجازت دے کہ بن یمن کو ساتھ لے کر پھر جائیں) اور اپنے گھرانے کے لئے مدد لے آئیں۔ ہم اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ اور زیادہ لے لیں گے۔ یہ غلہ (جو اس مرتبہ لائے ہیں) بہت تھوڑا ہے۔

دوسری مرتبہ | اب بالآخر حضرت یعقوبؑ نے اُن سے اللہ کے نام پر عہد لیا کہ وہ بن یمن کو بخیریت واپس لے آئیں گے اور اس کے بعد اسے جانے کی اجازت دیدی۔

قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّىٰ تُؤْتُوا مِنِّي مَوْثِقًا مِنَ اللَّهِ لَتَأْتُنَّنِي
بِهِ إِلَّا أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ
مَا نَقُولُ وَكَيْلٌ ۝ (۱۲/۶۶)

باپ نے کہا، ”میں اسے کبھی تمہارے ساتھ بھیجنے والا نہیں جب تک کہ اللہ کے نام پر مجھ سے عہد نہ کرو (تم عہد کرو کہ) بجز اس صورت کے کہ ہم خود گھیر لیتے جائیں (اور بے بس ہو جائیں)

ہم ضرور اسے تیرے پاس لے آئیں گے: ”جب انہوں نے اپنے باپ کو (اس کے کہنے کے مطابق) اپنا پکا قول دے دیا، تو اس نے کہا، ”ہم نے جو قول و قرار کیا اس پر اللہ نگہبان ہو۔“

تورات میں ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کے بھائی پہلی مرتبہ مصر گئے ہیں تو ان پر جاسوسی کا شبہ گزرا تھا۔ حضرت یعقوبؑ کے دل میں یہ کھٹکا تھا کہ مبادا ان پر کچھ ایسا ہی شبہ گزر جائے اور یوں یہ بھی گھر جائیں اور ان کے ساتھ بن یامین بھی کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ اس لئے انہوں نے احتیاطاً ان سے کہا کہ مصر میں داخل ہونا تو ایک جتنی کی صورت میں نہ جانا، الگ الگ دروازوں سے شہر میں داخل ہونا۔ قرآن کریم میں ہے:

وَقَالَ يٰٓبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنۡ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّ ادْخُلُوا مِنۡ اٰنۡوََابٍ مُّتَفَرِّقَةً وَاِنَّهٗ لَذُوۡ عَلِيۡمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهٗ وَلَٰكِنۡ اَكۡثَرُ النَّٰسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ؕ (۱۲/۴۸-۴۷)

اور باپ نے انہیں اچلتے وقت کہا ”اے میرے بیٹو! دیکھو جب مصر پہنچو تو شہر کے ایک ہی دروازہ سے داخل نہ ہونا، جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا۔ میں نے یہ بات یونہی برناتے احتیاط کر دی ہے ورنہ وہاں موقع پر جو کچھ پیش آئے اس کے لئے تم نے قوانین خداوندی کے مطابق خود فیصلہ کرنا کہ کیا کرنا چاہیے، اس لئے کہ ہر معاملہ خدا کے قانون کے مطابق طے ہوتا ہے اور میں بھی اس پر بھروسہ رکھتا ہوں اور وہی ہے جس پر تمام بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے!“

پھر جب یہ لوگ (مصر میں) داخل ہوئے اسی طرح جس طرح باپ نے حکم دیا تھا تو دیکھو یہ بات اللہ کے قانون کے مقابلے میں کچھ کام آنے والی نہ تھی، مگر ہاں، یعقوب کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا تھا جسے اس نے پورا کر دیا۔ بلاشبہ وہ صاحب علم تھا کہ ہم نے اس پر علم کی راہ کھول دی تھی۔ لیکن اکثر آدمی (اس بات کی حقیقت) انہیں جانتے!

جب یہ قافلہ حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچا تو آپ نے اپنے بھائی (بن یامین) کو اشارے سے بتایا کہ میں تیرا بھائی ہوں۔ غمگین نہ ہو۔

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰی یُوۡسُفَ اَدۡۤیٰ اِلَیۡهٖ اَخَاہٗ قَالَ رَٰتِیۡ اَمۡنًا
اٰخُوۡکَ فَلَا تَبۡتَدِیۡسۡ بِمَا کَاۡلَمۡا یَعۡمَلُوۡنَ ؕ (۱۲/۴۹)

اور جب ایسا ہوا کہ یہ لوگ حضرت یوسف کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے بھائی (بن یامین) کو اپنے پاس بٹھالیا اور اُسے (پوشیدگی میں) اشارہ کر دیا کہ ”میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بھی تلقین کر دی کہ یہ لوگ جو کچھ کرتے چلے آئے ہیں اس پر کبیدہ خاطر نہ ہونا (اب دن پلٹ جائیں گے)۔

حضرت یوسف ہزاروں سے چاہتے ہوں گے کہ بن یامین اُن کے پاس رہ جائے لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا تا وقتیکہ اسے یا تو یونہی روک لیتے یا بھائیوں پر اس راز کا انکشاف کر دیتے کہ وہ کون ہیں؟ اول الذکر مرفوع انقلم تھا، اس لئے کہ قانون کی رو سے ایسا ہو نہیں سکتا تھا اور استبداد آپ کی ذات سے ناممکن تھا۔ دوسری طرف بھائیوں پر راز کا انکشاف ابھی قبل از وقت تھا۔ اس لئے آپ نے مجبوراً ان کے ساتھ بھائی کو بھی الوداع کہہ دیا۔ حضرت یوسف نے ان کی واپسی کا سامان ہتیا کیا۔ جب یہ سامان سفر تیار ہو رہا تھا تو ان بھائیوں میں سے ایک نے چپکے سے حضرت یوسف کا شاہی کٹورہ بن یامین کی بوری میں رکھ دیا۔ نیت یہ ہو گی کہ اگر کسی کی نگاہ نہ پڑی تو کٹورہ گھر پہنچ جائے گا اور اگر پتہ چل گیا تو بن یامین بدنام ہوگا اور باپ کی نظروں سے گر جائے گا۔

اس کے بعد قافلہ روانہ ہو گیا۔ جب محلات کے کارندوں نے مختلف کٹورہ کی کھمشنگی چیزوں کا جائزہ لیا تو شاہی کٹورہ کو وہاں نہ پایا۔ چونکہ یہ کنعانی قافلہ وہاں ٹھہرا تھا اس لئے ان کا لامحالہ انہیں پر شبہہ گزرا۔ وہ اُن کے پیچھے گئے اور انہیں آواز دے کر ٹھہرایا اور پوچھا کہ کیا تم پیالہ لے آئے ہو؟

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَّازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ
 أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ۝ قَالُوا ذَا أَقْبَلُوا
 عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُونَ ۝ قَالُوا لَنَفَقْدُ صَوَاعَ الْمَلِكِ وَ لَمَّا
 جَاءَ بِهِ حُمْلٌ بَعِيرٌ ذَا أَنَا بِهِ زَعِيمٌ ۝ (۱۲/۷۲-۷۰)

پھر جب یوسف نے ان لوگوں کا سامان ان کی روانگی کے لئے تیار کر دیا تو اس کے بھائیوں میں سے ایک نے شاہی کٹورہ یوسف کے بھائی کی بوری میں رکھ دیا۔ پھر ایسا ہوا کہ (جب یہ لوگ روانہ ہو گئے اور شاہی کارندوں نے پیالہ ڈھونڈا اور نہ پایا، تو ان پر شبہہ ہوا اور ایک پکارنے

والے نے (اُن کے پیچھے) پکارا، "اے قافلہ والو! (کھڑو) ہونہ ہو تم ہی چور ہو۔" وہ پکارنے والے کی طرف پھرے اور پوچھا "تمہاری کونسی چیز کھو گئی ہے؟" (شاہی کارندوں نے) کہا "ہمیں شاہی پیانہ نہیں ملتا۔ جو شخص اسے لادے اس کے لئے ایک بار شتر (غلہ) انعام ہے اور (کارندوں کے سردار نے کہا) میں اس بات کا ضمان ہوں۔"

ہم نے جو یہ لکھا ہے کہ برادران یوسفؑ میں سے ایک نے یہ کٹورہ بن یامین کی بوری میں رکھ دیا تھا تو اس کی دلیل یہ ہے کہ آگے چل کر جب حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کو بتایا ہے کہ وہی یوسفؑ ہیں تو اُن سے کہا کہ هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَ اَخِيهِ (۱۲/۸۹) تمہیں معلوم ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا؟ بن یامین کے ساتھ انہوں نے خاص طور پر کیا کیا تھا اس کا کوئی ذکر اس قصے میں نہیں۔ بجز اس مقام کے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ بن یامین کی بوری میں یہ کٹورہ اُسی بھائیوں میں سے کسی نے رکھا تھا اور یہی وہ شرارت تھی جس کی طرف حضرت یوسفؑ نے بعد میں اشارہ کیا تھا۔ بہر حال شاہی کارندوں نے ان سے پوچھ گچھ شروع کی اور انہوں نے قسمیں کھانی شروع کر دیں کہ ہم چور نہیں ہیں۔ ہم تو ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں آچکے ہیں۔ تم نے دیکھ لیا تھا کہ ہم نے کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں کی تھی۔

قَالُوا قَاتِلْهُ تَقَدَّرَ عَلِمْتُمْ مَا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَ مَا كُنَّا سَارِقِينَ ۝ (۱۲/۴۳)

انہوں نے کہا، "اللہ جانتا ہے، ہم اس لئے یہاں نہیں آئے کہ ملک میں شرارت کریں اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم پہلے بھی ایک مرتبہ آچکے ہیں اور ہمارا کبھی یہ شیوہ نہیں رہا کہ چوری کریں۔"

شاہی کارندوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ یونہی سہی۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اگر تلاشی لینے پر پیالہ تمہارے پاس سے نکل آیا تو اس کی کیا سزا؟

قَالُوا فَمَا جَزَاءُكَ ۖ اِنْ كُنْتُمْ كَذِبِينَ ۝ (۱۲/۴۴)

(کارندوں نے کہا) "اچھا" اگر تم جھوٹے نکلے تو بتلاؤ چور کی سزا کیا ہونی چاہیے؟

انہوں نے جواب دیا کہ سزا صاف ہے۔ جو چور ہو وہ اپنے جرم کی پاداش میں اپنی سزا آپ بن جاتے

یعنی اسے روک لیا جائے اور سزا دی جائے۔

قَالُوا جَزَاءُ مَا كَفَرْنَا بِهِ نَلِئُكَ مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ (۱۲/۷۵)

انہوں نے کہا ”چور کی سزایہ کہ جس کی بوری میں چوری کا مال نکلے وہ آپ اپنی سزا یعنی اپنے جرم کی پاداش میں پھرا جائے۔ ہم زیادتی کرنے والوں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔“

چنانچہ کارندوں کے سردار نے اس نے پہلے کہا تھا کہ جو پیالہ لے

من یابین کی بوری میں آئے اسے انعام دیا جائے گا اور اس کا میں ضامن ہوں) تلاشی

یعنی شروع کر دی اور پیالہ بن یابین کی بوری سے برآمد کر لیا۔

فَبَدَأَ بِأُذُنِ غَيْبَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ آخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ آخِيهِ ۝ (۱۲/۷۶)

پس (کارندوں کے سردار نے) ان کی بوریوں کی تلاشی یعنی شروع کی (اور کچھ نہ پایا)۔ پھر یوسف کے بھائی کی بوری (دیکھی اور اس میں) سے پیالہ نکال لیا۔

یہاں تک دیکھئے کہ ہوا کیا ہے؟ حضرت یوسفؑ چاہتے تھے کہ اپنے بھائی (بن یابین) کو اپنے پاس رکھ لیں لیکن (ان وجوہات کی بنا پر جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) وہ ایسا کر نہیں سکتے تھے۔ برادران یوسفؑ میں سے ایک نے بن یابین کی بوری میں کٹورہ رکھ دیا۔ اس لئے نہیں کہ بن یابین یہیں رہ جاتے بلکہ کٹورہ حاصل کرنے یا بن یابین کو بدنام کرنے کی غرض سے۔ جب کٹورہ کی تلاش ہوئی تو برادران یوسفؑ نے خود ہی کہہ دیا کہ جس کے پاس سے چوری کا کٹورہ نکلے گا وہ ماخوذ ہو جائے گا اور اپنی سزا بھگتنے کے لئے یہاں رہ جائے گا۔ کٹورہ بن یابین کی بوری سے نکلا اور اس طرح اس کے یہاں رکنے کی صورت پیدا ہو گئی۔ اس توجیہ کی سند، قرآن کریم کا ایک لطیف اشارہ ہے۔ آیت ۷۶ کا پہلا حصہ اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ اس کے آگے ہے۔

كَذَلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ۝ (۱۲/۷۶)

از خود تدبیر | تو (دیکھو) اس طرح ہم نے یوسف کے لئے (بن یابین کو پاس رکھنے کی) ایک

مخفی (اور لطیف) تدبیر پیدا کر دی۔

اس لئے کہ

مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاكَ فِي دِينِ الْمَلِكِ (۱۳)

وہ بادشاہ (مصر) کے قانون کی رو سے ایسا نہیں کر سکتا تھا کہ اپنے بھائی کو روک لے۔

اس کے لئے یہی صورت تھی کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کوئی راہ نکال دیتی۔

إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ (۱۲/۷۶)

مگر ہاں اسی صورت میں کہ اللہ کو (اس کی راہ نکال دینا) منظور ہوتا۔ (سو اس نے غیبی سامان کر کے راہ نکال دی)۔

اور راہ بھی ایسی کہ حضرت یوسفؑ کو اپنی آرزو کی تکمیل کے لئے نہ قانون شکنی کرنی پڑے نہ دست دراز اور اس طرح ان کی عظمت منصب بھی قائم رہے۔ بلکہ اظہار واقعہ کے بعد یہ عظمت لوگوں کی نگاہوں میں اور بھی بڑھ جائے۔

مَنْ رَفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ تَشَاءِ (۱۲/۷۶)

ہم جسے چاہتے ہیں مرتبوں میں بلند کر دیتے ہیں۔

یہ اس طرح رکاوٹوں کے حل علم کی بنا پر ملتے ہیں۔ اور خدا جس کا علم سب سے زیادہ ہے سب سے بہتر حل دے سکتا ہے۔

وَفَوْتَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٍ (۱۳)

اور ہر علم والے کے اوپر ایک علیم (یعنی اللہ کی) ہستی ہے (جس کا) علم سب کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اب معاملہ حضرت یوسفؑ کے سامنے آچکا تھا۔ وہ اس سے پیشتر بن یامین کو اپنے متعلق بتا چکے تھے اس لئے بن یامین کے لئے نہ تو اس الزام سے گھبرانے کی کوئی تھی اور نہ معاملہ کے حضرت یوسفؑ کے سامنے

لے دین کے معانی پر غور کیجئے اور پھر سمجھئے کہ دین الاسلام کے معنی ضابطہ قوانین الہیہ کے ہیں جس کے لئے نظام حکومت کی ضرورت ہے یا محض پوجا پاٹ کے مذہب کے؟

پیش ہونے سے کوئی تشویش۔ حضرت یوسفؑ نے سمجھ لیا کہ یہ سب کچھ مشیت کی تدبیر کے ماتحت ہوا ہے اور اس لئے ہوا ہے کہ بن یامین یہاں رُک جلتے۔ اس لئے وہ خاموش رہے۔ لیکن ان برادرانِ یوسفؑ کو بن یامین سے پہلے ہی دشمنی تھی (اس لئے کہ وہ یوسفؑ کے بعد باپ کا چیتا بیٹا تھا) اس لئے جوشِ حسدِ عداوت میں بے اختیار پکار اُٹھے کہ اس نے اگر چوری کی ہے تو کچھ عجب نہیں۔ یہ بات تو ان کے ہاں پہلے ہی سے چلی آ رہی ہے۔ اس کا ایک بھائی تھا وہ بھی **برادرانِ یوسفؑ کی تنگ ظنی** ایسا ہی تھا۔ اندازہ فرمائیے کہ حضرت یوسفؑ نے کس دل سے اس الزام کو سنا ہوگا۔ لیکن ابھی مصلحت کا تقاضا تھا کہ اپنے آپ کو ان پر ظاہر نہ کیا جائے۔ اس لئے کہا تو صرف اتنا کہ اپنے بھائی کو چور بنا کر تم اپنے متعلق بھی کچھ اچھا ظن پیدا نہیں کر رہے۔ تم بھی تو اسی خانوادہ کے نو بہاں ہو! قرآن کریم میں ہے۔

قَالُوا يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنَّا نَنبئُكَ أَنَّكَ كَاهِنٌ وَرَبُّكَ يُرِيدُ أَنْ يَبَدِّعَكَ مِنْ قَوْمِكَ وَيَجْعَلَكَ كَاهِنًا لِلَّذِينَ كَفَرُوا لَعَلَّكَ أَتَىكَ الْكَلْبُ الْمَتِينُ ۝ (۱۲/۷۷)

(جب بن یامین کی بوری سے کٹورہ نکل آیا، تو بھائیوں نے کہا، "اگر اس نے چوری کی تو یہ کوئی عجب بات نہیں۔ اس سے پہلے اس کا (حقیقی) بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔" تب یوسفؑ نے (جس کے سامنے اب معاملہ پیش ہوا تھا) یہ بات اپنے دل میں رکھ لی، ان پر ظاہر نہ کی کہ میرے مُنہ پر مجھے چور بنا رہے ہو) اور (صرف اتنا) کہا کہ "سب سے بُری جگہ تمہاری ہوئی (کہ اپنے بھائی پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو) اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو، اللہ سے بہتر جاننے والا ہے۔"

جب جذباتِ بغض و عناد یوں ٹھنڈے ہوتے تو اب منت و سماجت پر اتر آئے۔ کہنے لگے۔

قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَخَاهُ

لے اس کے برعکس تورات (کتابِ پیدائش) باب ۴۲ آیت ۲۱ میں دیکھتے تو وہاں یہ مذکور ہے کہ حضرت یوسفؑ نے خود ہی وہ پیا بن یامین کی بوری میں رکھوا دیا اور جب قافلہ روانہ ہو چکا تو خود ہی اپنے کارندوں کو تعاقب میں بھیج دیا کہ ان کی تلاشی لیں اور چور کو پکڑ کر لے آئیں۔ غور کیجئے۔ قرآن کریم اور مختلف کتبِ آسمانی میں کس قدر فرق ہے؟

مَكَانَهُ ۚ إِنَّا نَزَّلَكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (۱۲/۷۸)

انہوں نے کہا، "اے عزیز! اس باپ بہت لوڑھا آدمی ہے (اور اس سے بہت محبت رکھتا ہے) پس اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے (مگر اسے نہ روکنے) ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو احسان کرنے والے ہیں۔"

حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ چور اپنی سزا آپ بھگتے۔ اب ہم اس جگہ کسی دوسرے کو کیسے روک لیں۔

قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ أَنْ نَأْخُذَ إِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَآ إِفَّا
إِذَا تَطَلَّثُونَ ۝ (۱۳/۷۹)

یوسف نے کہا، "اس بات سے اللہ کی پناہ کہ ہم اس آدمی کو چھوڑ کر جس کے پاس ہمارا سامان نکلا کسی دوسرے کو پکڑ لیں۔ اگر ایسا کریں تو ہم ظالم ٹھہریں۔"

اس بات کو پھر نہ بھولنے کہ بن یامین کو علم تھا کہ روکنے والا یوسفؑ ہے۔ اس لئے اس پر کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہو رہی تھی۔ جب وہ اپنی کوششوں میں مایوس ہو گئے، تو الگ ہو کر باہمی مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

فَلَمَّا اسْتَيْسَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا ۖ قَالَ كَبِيرُهُمْ.....
..... وَ إِنَّا لَصَدِيقُونَ ۝ (۱۲/۸۲-۸۱)

پھر جب وہ یوسف سے مایوس ہو گئے (کہ یہ ماننے والا نہیں) تو مشورہ کے لئے (ایک جگہ) کیلے میں بیٹھ گئے جو ان میں بڑا تھا، اس نے کہا "تم جانتے ہو کہ باپ نے بن یامین کے بلے میں (اللہ کو شاہد ٹھہرا کر تم سے عہد لیا ہے اور اس سے پہلے یوسف کے معاملہ میں بڑی تقصیر ہو چکی ہے۔ پس میں تو اب اس ملک سے ٹلنے والا نہیں جب تک کہ باپ از خود مجھے حکم نہ دے یا پھر اللہ میرے لئے کوئی دوسرا فیصلہ کر دے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!"

"تم لوگ باپ کی طرف لوٹ جاؤ اور اس سے جا کر کہو "اے ہمارے باپ! (ہم کیا کریں) تیرے (چیتے) بیٹے نے (پراتے ملک میں) چوری کی۔ اور ہم تو انہی معاملات میں اس کی نگرانی اور حفاظت کر سکتے تھے جن کا ہمیں علم ہوتا۔" وہ اگر ہم سے خفیہ چوری کرنے پر اتر آئے تو ہم اسکی

کس طرح نگرانی اور پاسبانی کر سکتے؟

اور (یہ بھی کہہ دینا کہ) آپ اُس بستی سے دریافت کر لیں جہاں ہم ٹھہرے تھے اور اس قافلہ کے

آدمیوں سے پوچھ لیں جس میں ہم آئے ہیں۔ ہم (اپنے بیان میں بالکل سچے ہیں)

آگے بڑھنے سے پیشتر فوراً اس نشتر کو دیکھتے جاتے جو اس طعن آمیز فقرہ میں چھپا ہوا ہے کہ يَا أَبَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقٌ ۚ "اے باپ تیرے بیٹے نے چوری کی ہے" دل میں بغض و عناد کے جذبات نہ ہوتے تو سیدھی طرح کہتے کہ ہمارے بھائی نے چوری کی ہے یا بن یا بن نے چوری کی ہے۔ لیکن باپ کو جتا کر کہنا کہ

قساوتِ قلبی کی ایک جھلک "یہ ہے آپ کے اس بیٹے کے کرتوت، جسے آپ یوں

سینے سے لگائے رہتے تھے، کس قدر کلمے کو چھپانی کر دینے

والا لگا ہوا ہے! اور پھر قساوتِ قلب دیکھئے۔ یہ نشتر کس وقت رگِ جان میں بیوست کئے جانے کی تجویز ہو رہی ہے؟ جب کہ ضعیف باپ پہلے ہی ایک بیٹے کے غم میں نیم سوختہ ہو رہا تھا اور اس کے بعد اب دوسرے بیٹے کے متعلق یہ خبر سنائی جانے والی تھی کہ وہ بھی تم سے جدا ہو گیا۔ یہ وقت تھا کہ اس خبر کو انتہائی ہمدردی کے پیرایہ میں بیان کیا جاتا۔ لیکن قرآن کریم نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ذنی الطبع لوگوں کی قساوتِ قلبی ایسے مواقع پر اور بھی زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔

چنانچہ بھائیوں نے ایسا ہی کیا اور کنعان میں آکر باپ سے اسی طرح بات کہہ دی۔ لیکن اس پر حضرت یعقوبؑ نے پھر وہی فقرہ دہرایا جو بیٹے والے افسانہ سُکر بیٹوں سے کہا تھا۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبِرْ جَبِيلٌ ۗ عَسَى اللَّهُ

أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَبِينًا ۗ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝ (۳۳)

(چنانچہ بھائیوں نے ایسا ہی کیا اور کنعان آکر یہ ساری باتیں باپ سے کہہ دیں) اُس نے

(سُکر) کہا، "نہیں، یہ تو ایک بات ہے جو تمہارے جی نے تمہیں سمجھا دی ہے۔ (یعنی بن یا بن کا

چوری کرنا) خیر! میرے لئے صبر کے سوا چارہ نہیں، ایسا صبر کہ خوبی کا صبر ہو۔ اللہ کے فضل سے

کچھ بعید نہیں کہ وہ (ایک دن) ان سب کو میرے پاس جمع کر دے۔ وہی ہے جو (سب کچھ)

جاننے والا (اور اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَبِينًا پر غور کیجئے۔ حضرت یعقوبؑ نے اس بات کو کبھی صحیح

تسلیم نہیں کیا تھا کہ حضرت یوسفؑ واقعی ہلاک ہو چکے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ زندہ ہیں۔ اب جو بن یامین کے متعلق یہ سب کچھ سنا تو ان تمام واقعات پر غائر نگاہ ڈالنے سے آپ کی فراست نے بھانپ لیا کہ یہ کڑیاں کچھ غیر معمولی سی ہیں۔ اس سے آپ کی نگاہ دور رس نے بن یامین کی گمشدگی میں سب کے دوبارہ اکٹھے ہو جانے کی جھلک دیکھ لی (یعنی یوسفؑ، بن یامین اور وہ بڑا بیٹا جو باقیوں کے ساتھ نہیں آیا تھا)۔ بن یامین کی جدائی نے پھلے زخموں کو پھر سے تازہ کر دیا اور یوسفؑ کی یاد اور کبھی ستلے لگی۔ ہر چند انہیں امید کی جھلک نظر آچکی تھی لیکن فراق آخر فراق ہے جب ستمنا مایوسی نہ ہو بلکہ نیم ور جا کا عالم ہو تو درودِ فراق کی شدت اور کبھی بڑھ جاتی ہے۔ قرآن کریم نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسْفَىٰ عَلَىٰ يَٰوَسْفَٰ ۚ أَبْيَضَّتْ عَيْنُهُ
مِنَ الْحُزَنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ۝ (۱۲/۸۴)

اور اُس نے ان لوگوں کی طرف سے رُخ پھیر لیا اور (چونکہ اس نئے زخم کی غلش نے پھیلاؤ ختم تازہ کر دیا تھا) اس لئے (پکارا اٹھا) "اے یوسفؑ کا دردِ فراق! اور شدتِ غم سے اس کی آنکھیں ہر وقت آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی تھیں اور اس کا سینہ غم سے لبریز تھا۔

پھر اس آتشِ غم کی جگر سوزی کا اس سے اندازہ لگائیے کہ چارہ ساز تو ایک طرف، کوئی غمخوار بھی پاس نہ تھا۔ بیٹے تھے تو ایسے کہ انہیں یوسفؑ اور بن یامین کے نام سے چڑھ تھی! خود بوڑھے ہو چکے تھے۔ ایسے میں بیٹوں کی ہر بات سننی پڑتی ہوگی۔ اور ان باتوں کا زخمِ داغِ جدائی سے بھی زیادہ کرب انگیز ہوتا ہوگا۔

كَأَلَا قَاتِلُهُ تَفْتَوُوا ۚ تَذَكَّرُوا يَٰوَسْفَٰ حَتَّىٰ تَكُونَ حَاصِصًا ۚ
تَكُونَ مِنَ الْهَالِكِينَ ۝ (۱۲/۸۵)

(باپ کا یہ حال دیکھ کر بیٹے) کہنے لگے، "بڑے میاں! تم اس قفتے کو چھوڑ دو گے بھی یا ہر وقت اسی کی یاد کرتے رہو گے، یہاں تک کہ (اسی غم میں) گُل جاؤ یا اپنے آپ کو ہلاک کر دو۔"

حضرت یعقوبؑ یہ سب کچھ سنتے اور جواب میں کہتے تو فقط اتنا کہ

بیٹوں کی طرف سے نشتر

حقیقی کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ کیا تمہیں اتنا بھی گوارا نہیں؟

قَالَ إِنَّمَآ أَشْكُوا بَنِيَّ وَحُزْنِي إِلَىٰ ٱللَّهِ وَٱللَّهُ مَنَّ ٱللَّهُ

مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۱۲/۸۶)

باپ نے کہا، ”میں تو اپنی حاجت اور اپنا غم اللہ کی جناب میں عرض کرتا ہوں (کچھ تمہارا شکوہ نہیں کرتا) میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تمہیں معلوم نہیں“

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، حضرت یعقوبؑ کی اُمیدیں بڑھتی جا رہی تھیں کہ فراق کی یہ جاں سوز گھڑیاں وصال میں تبدیل ہونے والی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ جس طرح انہوں نے بیٹوں کی پہلی افسانہ طرازی کو صحیح نہیں مانا تھا اسی طرح اس دوسری کہانی کو بھی درست تسلیم نہیں کیا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ بیٹوں کو آمادہ کر لیا کہ وہ ایک بار جائیں اور یوسفؑ اور اس کے بھائی کا سراغ لگائیں۔

يٰۤاِبْنَيْ اٰذْهٰبُوْا فْتَحَسُّوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاٰخِيْنِهٖ وَاَوْ قٰتِلُوْا
مِنْ رُّوْحِ اللّٰهِ ط اِنَّهٗ لَوْ يٰۤاِنۡسُ مِنْ رُّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ
الۡكٰفِرُوْنَ ۝ (۱۲/۸۷)

(پھر انہوں نے کہا) ”اے میرے بیٹو! (ایک بار پھر مصر) جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے، مگر وہی لوگ جو اس کے قانون پر یقین نہیں رکھتے۔“

دیکھتے! یہاں اُمیدوں کی دنیا کس طرح بیدار ہوتی نظر آ رہی ہے۔ بیٹے غلہ لینے کے لئے پھر مصر پہنچے۔ قحط زدگی سے ان کی حالت بہت زیادہ سقیم ہو چکی تھی۔ اس لئے اب خرید و فروخت کے بجائے حضرت یوسفؑ سے بھیک کے طلبگار ہوئے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا دَ اٰهْلُنَا الضَّرُّ
وَجِئْنَا بِبِضَاعٍ مُّزۡجَجَةٍ قٰوۡدٍ لَنَا الْكِيۡلَ وَاَتَّصَدَقُ عَلٰنَا
اِنَّ اللّٰهَ يَجۡزِي الْمُتَّصِدِّقِيۡنَ ۝ (۱۲/۸۸)

پھر جب (باپ کے حکم کی تعمیل میں یہ لوگ مصر پہنچے اور) یوسف کے پاس گئے تو اپنے پھر آنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا، ”اے عزیز! ہم پر اور ہمارے گھر کے آدمیوں پر بڑی سختی کے دن گذر رہے ہیں۔ پس (مجبور ہو کر غلہ کی طلب میں ہمیں پھر نکلنا پڑا) ہم تھوڑی سی پونجی لے کر آئے ہیں اسے قبول کر لیجئے اور غلہ کی پوری تول عنایت کیجئے۔ اور (اسے خریدو

فروخت کا معاملہ نہ سمجھتے بلکہ ہمیں (محتاج سمجھ کر) خیرات دیدیجئے۔ اللہ خیرات کرنے والوں کو ان کا اجر دیتا ہے!“

ذرا غور کیجئے۔ عزیز مصر (حضرت یوسفؑ) کی عاجز نوازیوں کی شہرت کتنی عام تھی کہ اُن (اجنبیوں) نے اتنے وثوق سے کہہ دیا کہ ہماری بصاعت کی طرف نہ دیکھئے، اپنے رجم و کرم کی طرف دیکھئے اور معاملہ خرید و فروخت کا نہ سمجھتے بلکہ صدقہ و خیرات کا خیال کیجئے۔ کیسا درد انگیز اور عبرت آموز تھا یہ منظر! یہ جابر و قاہر بھائی اُس یوسفؑ سے بھیک کے سوالی ہیں جسے انہوں نے اس بیدردی سے کنویں میں ڈال دیا تھا۔ یہ سن کر حضرت یوسفؑ کا بھی جی بھر آیا اور انہوں نے کہا،

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَآ فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَ آخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ
جَاهِلُونَ ۝ (۱۲/۸۹)

(یہ حال سن کر) یوسف (کا دل بھر آیا۔ اُس) نے کہا ”تمہیں یاد ہے تم نے برہنائے جہالت یوسف اور اُس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا۔“

إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ پر نگاہ ڈالئے۔ سیرت یوسفی کی زبانی پھلک کر باہر آرہی ہیں۔ ایک یہ بھائی تھے کہ بن یامین تو ایک طرف، اس کے بھائی کے متعلق بھی چوری کا غلط الزام لگانے سے نہ بچ سکے۔ حتیٰ کہ بوڑھے باپ سے بھی طعن آمیز نشتر کے بغیر بات نہ کی۔ اور انہی کے بھائی حضرت یوسفؑ ہیں کہ ایسے شقی القلب بھائیوں کو ان کی شقاوتِ قلبی کی یاد دلائی تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ تم سے یہ کچھ نادانی اور جہالت سے ہو گیا تھا۔

سائے حضرت یوسفؑ ہیں | حضرت یوسفؑ نے اپنی کشادہ نگہی سے الزام کی نوعیت کو اس قدر نرم کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود ذرا تصور میں لائیے کہ یہ معلوم کر کے کہ سائے یوسفؑ کھڑا ہے، بھائیوں کے قلب و دماغ کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی؟ قرآن کریم نے اس اضطرابی کیفیت کو ایک عجیب انداز سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے کہ جب بھائیوں نے یوسفؑ کے مُنہ سے یہ الفاظ سنے تو بوکھلاہٹ میں بول اُٹھے۔

عَ أَنْتَ يٰ يُوسُفُ ۙ (۱۳/۹۰)

کیا فی الحقیقت تم ہی یوسف ہو۔

حضرت یوسفؑ نے فرمایا:

قَالَ أَنَا يُسُفُّ وَ هَذَا آخِرُ نَزَقٍ مِّنَ اللَّهِ عَلَيْنَا ۖ إِنَّهُ مَن
يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ (۱۲/۹۰)

یوسف نے کہا "ہاں میں یوسف ہوں اور یہ (بن یامین) میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر احسان کیا۔ درحقیقت یہ ہے کہ جو کوئی (برائیوں سے) بچتا اور (مصیبتوں میں) ثابت قدم رہتا ہے تو اللہ (کا قانون یہ ہے کہ وہ) نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔

غور کیجئے، لسانِ یوسفؑ نے دو لفظوں میں کتنی بڑی حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ جو کوئی زندگی کی تباہ کن روش سے بچتا اور قانونِ خداوندی کی ننگداشت کرتا ہے اور پھر ہجومِ مشکلات میں ثابت قدم رہتا ہے اس پر اللہ کی نوازشات کی گہراری ہوتی ہے، اس اللہ کی جو مخلص انسان کی محنت کو رازِ یگانہ نہیں جالے دیتا۔ اس کے بعد برادرانِ یوسفؑ پر جو کچھ گزری ہوگی اس کا اندازہ بیان میں نہیں، تصویر ہی میں آسکتا ہے۔ انہوں نے شرم و ندامت سے گردن جھکالی اور کہا۔

قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ أَشْرَكْنَا بِاللَّهِ عَلَيْنَا ۖ وَإِن كُنَّا لَخَاطِئِينَ ۝ (۱۲/۹۱)

انہوں نے کہا "بخدا، اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ نے تجھے ہم پر برتری دی ہے اور بلاشبہ ہم سرتاسر قصور وار تھے۔"

غور فرمائیے، وہ بھائی جنہوں نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا تھا جو آج تک دنیا میں بطور ضربِ المثل مشہور ہے آج اُسی بھائی کے سامنے مجرموں کی حیثیت سے سر جھکانے کھڑے ہیں یہ وقت تھا کہ اُن سے پورا پورا انتقام لیا جاتا۔ لیکن جنہیں اللہ نے وسعتِ ظرف **لَا تَرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** عطا فرمائی ہو وہ ذاتی انتقام نہیں لیا کرتے۔ ان کی دوستی اور

دشمنی، عفو اور انتقام، سب اللہ کے لئے ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ نے فرمایا۔

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ ذَوٰهُ
أَرْحَمُ الرَّحِيْمِيْنَ ۝ (۱۲/۹۲)

یوسف نے کہا "آج کے دن (میری جانب سے) تم پر کوئی سزا نہیں (جو کچھ تم نے میرے خلاف کیا تھا اسے تو میں نے معاف کر دیا لیکن اس سے جو کچھ تم نے خود اپنے خلاف کیا، یعنی

اس کا جو اثر تمہاری ذات پر مرتب ہوا۔ اس کے ازالہ کی صورت تو یہی ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی حفاظت کا سامان بنیاد کرو۔ یہ سامان تو اسی کی طرف سے مل سکتا ہے جو ارحم الراحمین ہے۔

اللہ اکبر! جمالِ یوسفی کا مہرِ عالمِ کتاب نصف النہار پر نظر آ رہا ہے۔ اس کے بعد آپ نے بھائیوں سے کہا کہ اب تم یوں کرو۔

إِذْ هَبُوا بِنَقْمِيصِي هَذَا فَأَلْقُوهُ عَلَى وَجْهِ رَبِّي يَأْتِ بَصِيرًا
وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ ۝ (۱۲/۹۳)

کہ میرا یہ کرتا اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس سے مہرے منصب اور وجاہت کا پتہ چل جاتا ہے۔ جب تم اسے والد کے سامنے پیش کرو گے وہ اس سے سب کچھ سمجھ جائیں گے (اور تمہاری بات کا یقین کر لیں گے) پھر تم اپنے تمام اہلِ خاندان کو یہاں لے آنا۔

یہی بھائی اس سے پیشتر باپ کے پاس ایک کرتا لائے تھے جسے دیکھ کر روئے پیر بن یوسفؑ

روتے باپ کی آنکھیں سفید ہو گئی تھیں۔ آج وہی بھائی اسی یوسفؑ کا ایک اور کرتا لے کر اسی باپ کے پاس جاتے ہیں جس کرتے سے بوڑھے باپ کی چھنی ہوڑا متاع واپس مل رہی ہے۔ قافلہ مصر سے روانہ ہوا اور مختلف منازل طے کرتا اس بستی کے قریب اپنی چاچھاں حضرت یعقوبؑ اور ان کا گھر آنا آباد تھا۔ یہاں سے باقی قافلہ آگے چل دیا اور برادرانِ یوسفؑ کے اونٹ الگ ہو گئے۔ (وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قافلہ کی آمد کا چرچا عام ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت یعقوبؑ قافلہ کا انتظار کس شدت سے کر رہے ہوں گے۔ ایسا انتظار کہ دل کی ساری حسرتیں سمٹ کر آنکھ کے تل میں آگئی ہوں گی۔ ان کے دل اور دماغ کی تمام قوتیں ایک نکتہ پر مرکوز ہو چکی ہوں گی۔

قرآن کریم نے حضرت یعقوبؑ کی وجد و مسرت کی اس شمیمِ یوسفی کی عطر بیزیاں

والہا نہ کیفیت کو عجیب و لا وزیرا یہ میں بیان فرمایا

ہے۔ ارشاد ہے۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا
أَنْ تَفْتَدُونِ ۝ (۱۲/۹۴)

اور پھر جب یہ لوگ یوسف کے حکم کے مطابق گرتا لے کر روانہ ہوئے اور کنعان کے قریب پہنچ گئے اور قافلہ (جس میں یوسف کے بھائی آ رہے تھے ان سے) جدا ہوا (یعنی یوسف کے بھائی بستی کی طرف چل دیئے) تو (ادھر گھر میں) ان کا باپ کہنے لگا "اگر تم لوگ یہ نہ کہنے لگو کہ بڑھاپے سے اس کی عقل ماری گئی ہے تو میں کہوں گا مجھے یوسف کی بہک آ رہی ہے (اور مجھے اس کا یقین ہے)۔"

سننے والوں کی نگاہیں بھلا وہ کچھ کب دیکھ سکتی تھیں جو دیدہ یعقوب کو نظر آ رہا تھا؟ ہو سکتا ہے کہ اب وحی کی طرف سے بھی کچھ اشارہ مل گیا ہو جیسا کہ (۱۲/۹۶) سے ظاہر ہے، لیکن سننے والوں کو اس کا بھی علم نہ تھا۔

قَالُوا قَاتِلْهُ إِنَّكَ لَبِئْسَ الَّذِي تَصْنَعُ (۱۲/۹۵)

سننے والوں نے کہا: "بخدا! تم تو اب تک اپنے (اُمس) پرانے خط میں مبتلا ہو" (یعنی یوسف کا تو نام و نشان بھی نہیں رہا اور تم اب تک اس کی واپسی کے خواب دیکھ رہے ہو)۔

اتنے میں وہ بیٹا جس کے پاس گرتا تھا اس مژدہ حیات آور کو لیکر حضرت یعقوبؑ کرتا اپنیچا کے پاس آپہنچا۔

فَلَمَّا أَنْ جَاءَ الْبَشِيرُ آتَهُ عَلَى وَجْهِهِ فَأَزَدَّتْ بَصِيرَاتُ قَالَ
أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۱۲/۹۶)

لیکن پھر جب خوشخبری سنانے والا (دوڑتا ہوا) آیا اور اُس نے یوسف کا پیر بن یعقوب کے سامنے رکھ دیا تو اس نے معاملہ کو سمجھ لیا اور (فرط مسرت سے) کہا "کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تمہیں معلوم نہیں؟"

باپ کی اس کیفیت کے ساتھ ساتھ بھائیوں کی اس کیفیت کا بھی اندازہ لگائیے۔ باپ کے سامنے ان کی نگاہیں اوپر کو نہیں اٹھ سکتی تھیں۔ انہوں نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے عرض کیا۔

قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ (۱۲/۹۷)

اے ہمارے باپ! ہماری خطاؤں کے لئے خدا سے سامانِ حفاظت طلب کر۔ فی الحقیقت ہم سے سراسر قصوری ہوتے رہے۔

حضرت یعقوبؑ نے فرمایا۔

قَالَ سَوِّتَ اسْتَفْفِرُ لَكُمْ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ (۱۲/۹۸)

باپ نے کہا: "وہ دقت دور نہیں کہ میں اپنے پروردگار سے تمہارے لئے حفاظت طلب کروں گا۔ وہ وہی حفاظت و رحمت عطا کرنے والا ہے۔"

گھرانہ جان ب مصر روانہ ہوا | اس کے بعد یہ تمام گھرانہ شاداں و فرجاں جانب مصر روانہ ہوا ..

حضرت یوسفؑ نے شہر سے باہر ان کا استقبال کیا۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَى يُوسُفَ أَدَّى إِلَيْهِ أَبُوْنِهِ دَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ
إِنْ شَاءَ اللهُ آمِنِينَ ۝ (۱۲/۹۹)

پھر جب ایسا ہوا کہ یوسف کی خواہش کے مطابق) یہ لوگ کنعان سے روانہ ہو کر مصر پہنچ گئے اور شہر کے باہر یوسف سے ملے تو اس نے اپنے باپ اور ماں کو (عزت و احترام سے) اپنے پاس بگڑی اور کہا اب شہر میں چلو۔ انشاء اللہ تم سب کے لئے ہر طرح کی سلامتی ہے۔

عزت و تکریم کی مسدیں | پھر انہیں اپنے ساتھ شہر میں لے گئے۔ حضرت یوسفؑ نے دربار منعقد کیا۔ اپنے ماں باپ کے لئے مسند بچھائی، اہل دربار تعظیم

بجالائے۔ عزت و وقار اور عظمت و اجلال کا یہ وہ منظر تھا جسے آج سے بہت عرصہ پہلے حضرت یوسفؑ نے اپنے خواب میں دیکھا تھا۔ وہ آج یوں پورا ہو کر رہا۔

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَدَّرُوا لَهُ سُجُودًا ۖ إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ ۖ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝ (۱۲/۱۰۰)

اور (جب شہر میں داخل ہوئے تو) اس نے اپنے والدین کو تخت پر اونچا بٹھایا، (باتی سب کے لئے نیچے نشستیں رکھیں) اور سب اُس کے سامنے تعظیماً جُھک گئے (اور مصر کے دستور کے مطابق اس کے منصبِ حکومت کی تعظیم بجالائے) اُس وقت اسے اپنے بچپن کا خواب یاد آ گیا اور بے اختیار پکار اٹھا "اے باپ! یہ ہے تعبیر اس خواب کی جو مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا میرے پروردگار

لے اس زمانہ میں مصر کا دار الحکومت عمیس تھا اور اسے حشن کا شہر کہتے تھے۔

نے اسے سچا ثابت کر دیا اور یہ اسی کا احسان ہے کہ مجھے قید سے رہائی دی تم سب کو صحرے نکال کر میرے پاس پہنچا دیا اور یہ سب کچھ اس واقعہ کے بعد ہوا کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں اختلاف ڈال دیا تھا! بلاشبہ میرا پروردگار ان باتوں کے لئے جو کرنی چاہتا بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ بلاشبہ وہی ہے کہ (سب کچھ) جاننے والا اور اپنے سارے کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے!

اس علو مرتبت اور رفعت مدارج کے احساس سے حضرت یوسفؑ کی گردن اس محسن حقیقی کے حضور جھک گئی جس کی ذرہ نوازیوں کے صدقے یہ سب کچھ دیکھنے میں آیا تھا اور اس کی بارگاہ میں عرض کیا کہ

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ
فَاطْرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّكَ وَرِيٌّ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ تَوَقَّعْنِي
مُسْلِمًا ۗ الْحَقِّيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ (۱۲/۱۰۱)

پروردگار! تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا۔ اے آسمان و زمین کے بنانے والے! تو ہی میرا کارساز ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی تو (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کیجیو کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں!

غور فرمائیے، دنیا کی حکومت اور شوکت کے ساتھ ساتھ دعا کیا مانگی جا رہی ہے کہ جب دنیا سے جاؤں تو ایک عبدِ مسلم کی حیثیت سے جاؤں اور عاقبت میں تیرے صالح بندوں کے زمرہ میں شریک ہوں! یہ ہے ایک عبدِ مومن کی دین و دنیا کی آرزوؤں کا منتہی! کیسا خوش بخت ہے وہ انسان اور کیسی طالع مند ہے وہ قوم جسے وہ مہدار فیض دین و دنیا کی سرفرازیں عطا فرما دے۔ لیکن یہ سب کچھ عطا ہوتا ہے ایمان و عمل کے بدلے، نہ صرف خاص قسم کے نام رکھ لینے اور دعائیں مانگ لینے سے!

یہ ہے حسن عمل کی وہ سرگذشت زریں جس سے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضور نبی اکرمؐ کو مطلع فرمایا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِ اِلَيْكَ ۗ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ

إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَنْكُرُونَ ۝ (۱۲/۱-۲)

(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی ہم تجھ پر وحی کر رہے ہیں۔ ورنہ (ظاہر ہے) ہم جس وقت یوسف کے بھائی سازش میں مصمم ہو گئے تھے اور پوشیدہ تدبیریں کر رہے تھے تو تم اُس وقت اُن کے پاس کھڑے نہ تھے (کہ یہ سب کچھ دیکھ سُن لیا ہوا)۔

اور اللہ تعالیٰ نے اسی احسن انداز سے حضرات انبیاء سابقہ کے احوال و کوائف قرآن کریم میں بیان فرمائے ہیں۔

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ تَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ
أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ قِصَّةً وَمِنْ
كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمَنِ الْغَفِيلِينَ ۝ (۱۲/۳-۲)

ہم نے اس شکل میں اُرا کہ عربی زبان کا قرآن ہے تاکہ تم سمجھو پوچھو۔ (اے پیغمبر!) اس قرآن کی وحی کر کے ہم تجھے بہتر سے بہتر طریقہ پر (بھلی) سرگدشتیں سناتے ہیں اور یقیناً قرآن کے نازل ہونے سے پہلے تو بھی انہی لوگوں میں سے تھا جو (ان سرگدشتوں سے) بے خبر تھے۔

یہ داستان شیریں ختم ہو گئی۔ لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر اس کے دو ایک مقامات پر نگہ بازگشت کی ضرورت ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف کو "تاویل الاحادیث" کا علم عطا فرمایا تھا۔ چونکہ حضرت یوسف نے خوابوں کی تعبیر بتائی تھی اس لئے عام طور سے **تاویل الاحادیث** سمجھ لیا گیا کہ تاویل الاحادیث سے مراد خوابوں کی تعبیر کا علم ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں، جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا۔ خوابوں کی تعبیر کا علم بھی تاویل الاحادیث کے اندر شامل ہو سکتا ہے۔ لیکن تاویل الاحادیث سے مراد فقط علم تعبیر المنام نہیں۔ تاویل کے معنی نتیجہ اور مالِ کار کے ہیں اور احادیث کے معنی ہیں باتیں۔ لہذا تاویل الاحادیث کے معنی ہوتے کسی بات سے یہ معلوم کر لینا کہ اس بات کا صحیح مطلب کیا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اسی کو معاملہ فہمی کہتے ہیں، یعنی کوئی معاملہ سامنے آئے اُس کے سیاق و سباق اور متعلقات و تضمنات پر غور کر کے اس حقیقت پر پہنچ جانا کہ اس کا مال اور انجام کیا ہوگا؟ غور کیجئے، دنیا میں ایک عام انسان اور ایک صاحب تدبیر و فراست میں کیا فرق ہوتا ہے؟ معاملات

واقعات ہر ایک کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہیں۔ ایک عام ذہنی سطح کا انسان وہی کچھ دیکھتا ہے جو اس کے پیش نظر ہوتا ہے۔ لیکن ایک دیدہ ور کی نگاہیں 'ہواؤں کے رُخ سے طوفان کی آمد کا اندازہ کر لیتی ہیں۔ قوموں کی زندگی ان کے مفکرین کی دیدہ ور اور مال اندیشی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، وہ مفکر جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ

دو صد و انادریں محفل سخن گفت
سخن نازک تراز برگ سمن گفت
فلے بامن بجو آں دیدہ ور کیست
کہ خارے دید و احوال چمن گفت (اقبال)

حضرت یوسفؑ، بیابان کنعان کے گلہ بانوں کے ایک قبیلہ میں پیدا ہوئے۔ ہر چند قبیلہ کی سرداری ان کے گھرالے میں تھی، لیکن ظاہر ہے کہ انہیں وہاں حضرت کی سیاستِ مدن اور عمرانیات و معاشیات کے ہمتا و معاملات سے متعلق نہ کوئی تعلیم مل سکتی تھی نہ تربیت کے سامان موجود تھے۔ بدوی اور حضری زندگی کا فرق چھپا ہوا نہیں۔ اس لئے اس قسم کا ایک دہقانی پتہ جب ایک غلام کی حیثیت سے شہر میں آئے تو اس کی زندگی ایک غلام (گھر کے ملازم) سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک طرف اعلیٰ درجہ کی فراست عطا فرمائی اور اس کے ساتھ ایسے مواقع ہم پہنچا دیئے جن میں آپ نے عملی طور پر اہم معاملات کے نظم و نسق کا سلیقہ حاصل کر لیا، یعنی عزیزِ مصر نے آپ کو اپنے کاروبار کا مختار و متحد علیہ بنالیا اور اس طرح آپ کو ان امور کا عملی تجربہ ہو گیا جو تمدنی زندگی کی خصوصیات میں سے تھے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مشیت کی طرف سے یہ انتظام اس لئے کیا گیا تھا کہ یوسفؑ کو تاویل الاحادیش کا علم سکھا دیا جائے۔

وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ أَنْ نَعْلَمَهُ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ

(۱۲/۲۱)

اور دیکھو، اس طرح ہم نے یوسفؑ کو زمینِ مصر میں قدم جما دیا۔ اور مقصود یہ تھا کہ اسے

بانوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا سکھادیں

اسی خدا داد فراست اور عملی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جب حضرت یوسفؑ کو حکومت و مملکت کے اختیارات تفویض کئے گئے تو آپ نے اس حسن تدبیر سے ان امور کا انتظام کیا کہ سب کی گردنیں آپ کے سامنے

جھک گئیں۔ اللہ تعالیٰ کی اس عنایت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اُس نے مجھے مملکت عطا فرمائی اور اس کے ساتھ تاویل الاحادیث کا علم بھی دے دیا۔

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِي مِنْ كَأْوْنِلِ الْاَوْحَادِيثِ
فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ قَفْ اَنْتَ وِالِي فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ جِئْتَنِي
مُسْلِمًا وَ اَلْحَقْنِي بِالصَّالِحِيْنَ ۝ (۱۲/۱۰۱)

(پھر یوسف نے دعا کی) پروردگار! تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا۔ اے آسمان و زمین کے بنانے والے! تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ تو اپنے فضل و کرم سے ایسا کیجیو کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں!

ان مقامات سے تاویل الاحادیث کا مفہوم واضح ہے۔

کہ غارے دید و احوالِ حَسَنِ گفت

۲۔ خوابوں کی دنیا

قصہ حضرت یوسفؑ میں خوابوں کے تذکرہ کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ خواب کی حقیقت کیا ہے؟ یہ مسئلہ اُس وقت سے اربابِ فکر و نظر کی توجہات کا مرکز بنا چلا آ رہا ہے جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا۔ عصرِ حاضر میں علمِ تجزیہٴ نفس کے ماہرین نے اس مسئلہ کو خاص طور پر اپنے غور و فکر اور تحقیق و تفتیش کا موضوع بنایا ہے جن کی عملی کادشوں کی بنا پر اس پستان کے کئی ایک گوشوں پر روشنی پڑ چکی ہے۔ چونکہ یہ علم ہنور اپنے عہدِ طفولیت میں ہے اس لئے یہ روشنی ابھی دھندلکی سی ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس موضوع کے کچھ نہ کچھ خط و خال سامنے ضرور آچکے ہیں۔ اس علم کی رو سے انسان میں نفسِ شعوریہ (CONSCIOUS MIND) کے علاوہ نفسِ غیر شعوریہ (UN-CONSCIOUS MIND) بھی ہے۔ انسانی زندگی میں بہت سے احوال و کوائف ایسے ہوتے ہیں جنہیں نفسِ شعوریہ کچھ وقت تک یاد رکھتا ہے لیکن اس کے بعد یا تو ان واقعات کو یکسر بھلا دیتا ہے یا ان کے خصوصی احساسات و تاثرات کے نقوش

اپنی لوح سے مٹا دیتا ہے۔ لیکن نفسِ غیر شعوریہ ان واقعات سے اہم حصص اور ان کے خصوصی تاثرات کو اپنی گرہ میں باندھ کر رکھ لیتا ہے۔ یہ تاثرات نفسِ شعوریہ کے ساتھ متصادم ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح انسان کے نظامِ عصبی کو غیر محسوس طور پر متاثر کرتے رہتے ہیں اور ان سے اس قسم کے عوارضات لاحق ہو جاتے ہیں جن کا کوئی طبعی سبب (PHYSICAL CAUSE) سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ حصہ ایک جداگانہ بحث سے تعلق رکھتا ہے۔ مبحثِ زیرِ نظر کے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ نفسِ نیم یا غیر شعوریہ اس وقت اپنا عمل شروع کرتا ہے جب نفسِ شعوریہ کی فعالیت (ACTIVITY) معطل ہو جاتی ہے (مثلاً حالتِ نشہ میں یا بلکہ سے غش، ہسٹیریا وغیرہ کے دورے میں) لیکن نفسِ غیر شعوریہ کو اپنی کارفرمائی کے لئے ان ہنگامی مواقع سے بھی زیادہ فرصت کا زمانہ اس وقت ملتا ہے جب انسان سو رہا ہو۔ اس وقت نفسِ شعوریہ کی حرکت معطل ہوتی ہے اور نظامِ جسمانی میں کسی قسم کا انتشار و اضطراب بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے نفسِ نیم یا غیر شعوریہ اپنے ”جادو“ کے اہم کو کھولتا ہے اور بھولے ہوئے افسانوں کی مختلف تصویریں ذہن کے پردہِ سیمن پر لاتا ہے۔ واقعات میں ترتیب اور ان کے نتائج و عواقب میں ربط و ضبط، نفسِ شعوریہ کا حصہ ہے۔ اس لئے نیم یا غیر شعوریہ نفسِ جن تاثرات یا واقعات کے ٹکڑے سامنے لاتا ہے، ان میں کوئی باہمی ربط یا ترتیب نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کی پیش کردہ فلم عجیب سی بے لٹی کا مجموعہ ہوتی ہے (اگرچہ بعض اوقات ایسے ٹکڑے بھی سامنے آجاتے ہیں جو اچھے خاصے مربوط ہوتے ہیں)۔ اسی کا نام خواب ہے۔ ان تاثرات میں جنہیں نفسِ شعوریہ بھلا دیتا ہے اور نفسِ نیم یا غیر شعوریہ اپنے اسٹوریوں میں جمع رکھتا ہے، ہزاروں نوح گشتہ آرزوئیں، سینکڑوں پامال شدہ تمنائیں، بیسیوں ایسی لپچائی ہوئی نگاہیں جو حسرت بن کر دل کی گہرائیوں میں جا چھپی ہوں، خواہش ہوئی ہیں۔ جب نفسِ شعوریہ کی دنیا سوتی ہے تو یہ خواہیدہ حسرتیں جاگ اٹھتی ہیں، لیکن بے لٹی ہضمون سے طلسم ہو شہر با کا افسانہ بن کر سامنے آتی ہیں اور جب نفسِ شعوریہ کی آنکھ کھلتی ہے تو اس افسانے کے بعض ٹکڑے کسی بھولے ہوئے واقعہ کی دھندلکی سی یادوں تازہ کر دیتے ہیں جیسے مرمبیں گرد میں ڈوبی ہوئی وادی کہسار کے اُس پار رات کے ستارے میں، وور سے بنسری کی آواز دل کے نرم و نازک گوشوں میں میٹھا میٹھا درد پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر خواب کا افسانہ، اس کی بے لٹی ہی کی نذر ہو جاتا ہے۔ علمِ تجزیہ نفس کے ماہرین خوابوں کے ان بے ربط ٹکڑوں سے نفسِ نیم یا غیر شعوریہ کی تہ میں چھپے ہوئے رازوں کی ٹوہ لگاتے ہیں۔ اس کے لئے انہیں بڑی صبر آزما محنت کرنی پڑتی ہے۔ وہ خواب (۱) فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے

دیکھنے والے کی سابقہ زندگی کے احوال و کوائف معلوم کرتے ہیں۔ اس کی ناکامیوں اور نامرادیوں اور کامیابیوں اور شادمانیوں کے اسباب و علل دریافت کرتے ہیں۔ وہ ان نیم کشس تیروں کی انیاں تلاش کرتے ہیں جو دل کے اندر ٹوٹ کر رہ گئی ہوں۔ وہ ایسی پھانسیوں کی ٹوہ نگاتے ہیں جو رگ جان میں ڈوب کر پھر نہ ابھری ہوں۔ اس طرح وہ خواب دیکھنے والے کے خیالات کی رُو اور ذہن کی افتاد کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس سے بڑے بڑے اہم نتائج پر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ قیاسی ہوتا ہے، حتمی طور پر وہ بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنے قیاسات سے خواب کے معاملات کو آنے والے واقعات سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ مستقبل کے واقعات خواب یا اس کی تعبیر کے مطابق نکل آتے ہیں، لیکن یہ محض اتفاقی امور ہیں۔ انہیں حقائق سے کچھ علاقہ نہیں۔ مثلاً ہوتا کیا ہے؟ آپ کی گبری تمنا ہے کہ آپ کا مستقبل فلاں سا پنچے میں ڈھلے۔ لیکن حالات اور واقعات آپ کو اس طرف جانے نہیں دیتے۔ آپ کا نفس شعور یہ حالات و واقعات کے مطابق کام کرتا ہے۔ لیکن جو نبی آپ سوتے ہیں، نفس نیم شعور یہ آپ کی تمنا کی سوئی ہوئی دنیا کو بیدار کر دیتا ہے اور وہ ایک حسین خواب کی شکل میں آپ کے سامنے آتی ہے۔ جب آپ جاگتے ہیں تو پھر اپنے احوال و ظروف کے مطابق مصروف کار ہو جاتے ہیں۔ آپ آخر میں دو صورتوں میں سے ایک صورت پیدا ہوگی۔ یا تو آپ کا مستقبل آپ کی آرزوؤں کے خلاف عام احوال و ظروف کے قالب میں ڈھل جائے گا۔ اُس صورت میں آپ کے خواب جو آپ کے مستقبل کو آپ کی تمناؤں کے رنگ میں پیش کیا کرتے تھے، محض واہمہ بن کر رہ جائیں گے۔ لیکن اگر ایسا ہو گیا کہ آپ نے احوال و ظروف کے علی الرغم اپنے مستقبل کو اپنی خواہشات کے مطابق بنا لیا تو اس صورت میں آپ کے خواب ”حرف بحرف سچ ہو کر“ سامنے آجائیں گے۔ اس وقت آپ کہہ اٹھیں گے کہ مجھے پہلے ہی خواب میں یہ اشارہ ہو گیا

گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ) لے بیداری کے وقت، خواب کے متعلق جو کچھ یاد رہتا ہے وہ سب کچھ دہی نہیں ہوتا جو نفس غیر شعور یہ حالت خواب میں سامنے لاتا ہے۔ جو کچھ خواب میں سامنے آتا ہے، علم تجزیہ نفس کی رو سے اسے (LATENT CONTENT) کہا جاتا ہے اور حالت بیداری میں جو کچھ یاد رہتا ہے اسے (MANIFEST CONTENT) کہتے ہیں۔ اس (MANIFEST CONTENT) سے (LATENT CONTENT) کا سراغ لگانا خواب کی تعبیر کہلاتا ہے۔

تھا کہ میرا مستقبل کیا بننے والا ہے۔ اس طرح آپ کے خواب پریشین گوئی (PROPHETIC) ہو جائیں گے۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ اس پر اور واقعات کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اور (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) بہت سی باتیں تو اتفاقی امور (COINCIDENCE) سے متعلق ہوتی ہیں۔

یہ سب خواب کی حقیقت جو اس وقت تک کی علمی تحقیق کی رو سے سامنے آئی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، علم تجزیہ نفس اور اس کے تضمنات بنو زاپنے ابتدائی مراحل میں ہیں اور ہمیں کہا جاتا تھا کہ جو کچھ اس وقت تک سامنے آیا ہے وہی حقیقت ہے۔

لیکن بہر کیف علمی تحقیقات کی رو سے جو کچھ سامنے آیا ہے وہ یہی ہے۔ اس تحقیقات کی رو سے خواب انسان کے اپنے ہی گم گشتہ خیالات و تصورات اور دہی ہوئی تمناؤں اور آرزوؤں کی صدائے بازگشت ہوتے ہیں۔ انہیں کسی اور دنیا سے تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے جس قسم کے خیالات و تصورات ہوں گے اسی قسم کے خوابوں کی دنیا ہوگی۔ جن لوگوں کے خیالات و تصورات اور مقاصد کثافتوں سے پاکیزہ ہوں گے ان کے خواب بھی آئینے کی طرح مصفی ہوں گے۔ جن کے فکر و نظر کی تطہیر ہو چکی ہوگی ان کے خوابوں کی دنیا میں بھی کوثر و سلسبیل کی آباریں نغمہ بار ہوں گی۔ حضرات انبیائے کرامؑ خیالات و تصورات کی پاکیزگی و رفعت میں اس مقام بلند پر ہوتے ہیں جو امکان انسانیت کی آخری حد ہے۔ اس لئے جیسی ان کے قلب و نگاہ کی دنیا ویسے ان کے خواب۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ان حضرات کو اللہ تعالیٰ امور غیبیہ کی اطلاع ”خواب کی حالت“ میں دے۔ لیکن ”خواب کا یہ عالم ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے جو درحقیقت خواب کہلا بھی نہیں سکتا۔ اس قسم کے ”خواب“ صرف خاصہ نبوت ہوتے ہیں ختم نبوت کے ساتھ ان کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا اس لئے کہ ختم نبوت کے بعد کسی شخص کو خدا کی طرف سے براہ راست کوئی علم حاصل نہیں ہو سکتا، نہ خواب کے ذریعے نہ کشف و الہام کے ذریعے۔ اس قسم کے تصورات سب غیر قرآنی ہیں اور ختم نبوت کی مہر کو توڑنے والے (تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر ملے گی) یہ تو ہے خواب دیکھنے کا معاملہ۔ اب رہا خواب کی تعبیر کا سوال.....

۱۔۔۔ سو عام حالات میں اس کا تعلق محض فراست سے ہے جو مختلف احوال و ظروف کی روشنی میں قیاساً کسی نتیجہ تک پہنچا دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تعبیرات محض ظنی اور قیاسی ہوتی ہیں، حتمی اور یقینی نہیں ہوتیں۔ لیکن حضرات انبیاء کرامؑ کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں آنے والے

واقعات (غیب) سے مطلع کر دے تو اس کا تعلق خواب کی تعبیر سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے عطا فرمودہ علم غیب سے ہوگا۔ چونکہ سلسلہ نبوت کے ختم ہو جانے سے غیب سے مطلع ہو جانے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا، اس لئے اب خوابوں کی تعبیر کا تعلق فراست سے رہ گیا۔

اس مقدمہ کو سامنے رکھ کر قصہ حضرت یوسفؑ کے خوابوں پر غور کیجئے۔ پہلا خواب خود حضرت یوسفؑ کا ہے۔ ہر چند وہ اُن کے (قریب قریب) بچپن کا زمانہ ہے۔ لیکن خانوادہ نبوت کا جہنم و چراغ اور خود بھی ہونے والا نبی، اس لئے آپ کا خواب کبھی انہی بلندیوں کا آئینہ دار تھا جن کی آماجگاہ آپ کا قلب و دماغ تھا۔ شمس و قمر اور روشن ستارے سجدہ ریز! یہ تھا خواب اور اس کی تعبیر بتانے والے حضرت یعقوبؑ جنہیں بیٹے کا طالع بلند اس کی سیرت کی پیشانی میں درخشاں نظر آ رہا تھا۔

دوسرا خواب قید خانہ کے ساتھیوں کا تھا۔ اگر اس کی تعبیر بشری حیثیت سے بتائی گئی تھی تو کہا جاسکتا ہے کہ کچھ وقت تک ساتھ رہنے سے فراست یونہی لے بھانپ لیا ہوگا کہ ان میں ایک بے گناہ ہے اور دوسرا واقعی مجرم۔ ان کے خیالات کی رو کا پہچان لینا بھی مشکل نہ تھا۔ ان کے خوابوں کی تعبیر چنداں دشوار نہ تھی۔ یہ درحقیقت آپ کی خصوصیت تاویل الاحادیث کا ایک مظاہرہ تھا، یعنی اس میں معاملہ فہمی کو زیادہ دخل تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک طرف قرآن نے اس تعبیر کا ذکر ایسے انداز میں کیا ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا علم آپ کو بذریعہ وحی عطا کر دیا تھا۔ آپ نے تعبیر بتانے کے بعد فرمایا قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِينَ ۝ (۱۱۳/۴۱) جس بات کے بارے میں تم سوال کرتے ہو وہ فیصل ہو چکی ہے اور فیصلہ وہ ہے جو میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ "خالی فراست کا قیاس کبھی اس حتم و یقین کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ قُضِيَ الْأَمْرُ معاملہ طے ہو چکا ہے۔ یہ امر فیصل شدہ ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ دوسری طرف قرآن نے اگلی آیت میں کہا ہے کہ وَ قَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ

لے بعض اوقات طبیعت کے اثر سے بھی خواب مرتب ہو جاتے ہیں۔ مثلاً سوتے میں پیاس لگے تو انسان خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ آگ میں مجلس رہا ہے یا پھانسی کا پھندہ اس کے گلے میں پڑا ہے۔ وہ گہرا کراٹھ بیٹھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ پیاس سے اس کے حلق میں کلنٹے پڑ رہے ہیں۔ اس قسم کے خواب محض مزاج کے اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں جنہیں "اضغاثِ اطلام" (پریشاں خیالی) کہا جاتا ہے۔ یہ حقہ طب کی دنیا سے متعلق ہے۔

خارج مِّنْهُمَا (۱۱۳/۴۲) ”ان میں سے جس کے متعلق اس نے اندازہ لگایا تھا (ظن) کہ وہ چھوٹ جائے گا، اس نے کہا.....“ یہاں کہا گیا ہے کہ خواب کی یہ تعبیر حضرت یوسفؑ کا ظن تھی۔ ظن کے معانی کے متعلق امام راغب نے لکھا ہے کہ کسی چیز کی علامات سے انسان جس نتیجہ پر پہنچے اسے ظن کہتے ہیں اور یہ صرف قیاس اور اندازہ ہوتا ہے یقینی بات نہیں ہوتی۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ تعبیر آپ کی اپنی فراست کا نتیجہ تھا۔ وحی کی صورت میں اسے ظن نہیں کہا جاسکتا۔

تیسرا خواب بادشاہ کا ہے۔ اس کی تعبیر کے ساتھ ساتھ حضرت یوسفؑ نے تدبیر بھی بیان کر دی ہے، جس سے ظاہر ہے کہ آپ یہاں پورے یقین کے ساتھ بتا رہے تھے کہ کیا ہونے والا ہے اور اس کے متعلق کیا کرنا چاہیے۔

خوابوں کی حتمی تعبیر نبوت ہی کا خاصہ ہوسکتی ہے جس میں کسی غیر نبی کا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ غیر نبی جو کچھ کہے گا، محض ظن و تخمین ہوگا۔ (خود نبی بھی جو کچھ ذاتی طور پر اپنی بشری حیثیت سے کہے گا وہ اس کی فراست کا نتیجہ ہوگا)۔ اب چونکہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اس لئے خدا کے عطا فرمودہ علم غیب کی رُو سے اس قسم کی یقینی باتیں بتا دینا بھی ممکن نہیں رہا۔ اب اس بارے میں جو کچھ ہوگا بشری فراست کی رُو سے ہوگا۔ باقی رہا خوابوں کا معاملہ، سو جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، وہ انسان کے اپنے ہی خیالات و تصورات کا پریشان سا عکس ہوتے ہیں۔ کسی اور دنیا سے ان کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ لہذا، خوابوں کی دنیا کو ایک مستقل عالم قرار دے کر اس پر حقائق کی بنیاد رکھ دینا افسانہ طرازی سے زیادہ کچھ نہیں۔ حقائق کا تعلق علم سے ہے اور علم حقیقی اللہ کی کتاب کے اندر ہے۔ نہ کسی کا خواب کسی دوسرے (یا خود خواب دیکھنے والے) کے لئے حجت ہو سکتا ہے اور نہ اس کی تعبیر کوئی خدائی سند اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ لیکن حقائق سے مُنہ موڑ لینے کے بعد مسلمانوں کے ہاں جس طرح اوہام پرستی کے سیکڑوں اور گوشے کھل گئے، ان میں خوابوں کی توہم پرستی بھی شامل ہو گئی۔ فلاں بزرگ خواب میں آکر یہ ارشاد فرمائے گئے۔ اب اس کی تعمیل آریب خداوندی سے بھی زیادہ مقدم ہے۔ مقدم ہی نہیں بلکہ اگر وہ ارشاد حکم شریعت کے صریحاً خلاف بھی جاتا ہے تو بھی یہ کہہ کر اس کو ترجیح دی جاتی ہے کہ شریعت ظواہر پرستی ہے اور وہ بزرگ حقیقت شناس ہیں اس لئے ان کے ارشاد میں ایک ایسا راز پنہاں ہے جسے ظاہر میں آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اسی پر بس نہیں۔ قیامت تو یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر علم المنام کی رُو سے کی جاتی ہے۔ مثلاً

قرآن کریم کی کسی آیت کا واضح مفہوم اگر ان کے مفید مطلب نہیں تو وہ کہیں گے کہ اس میں فلاں فلاں لفظ کے متعلق تعبیر نامہ میں لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے (اور تعبیر ناموں میں ایک ایک لفظ کے متعلق بیس بیس مفہوم درج ہوتے ہیں تاکہ ہر ایک اپنے اپنے مطلب کے مطابق تعبیر لے لے۔ لہذا قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم یہ ہے۔ یعنی ان لوگوں کے نزدیک قرآن کریم (معاذ اللہ، معاذ اللہ) اللہ کے خوابوں کا مجموعہ ہے جس کی تفسیر نہیں، بلکہ تعبیر (تعطیر المنام) خوابوں کے تعبیر نامہ) کی رو سے کی جائے گی قِمَامًا قَدْ دُوا اِنَّهُ سَحَقٌ قَدْ رِجَا۔ حقائق کی تفسیر ایسے ظنیات و خرافات سے! اور اس پر دعویٰ یہ کہ اس "قرآن فہمی" کا سرچشمہ خاص علم الہی ہے!

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا بکھتے!

گذشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت یوسفؑ کا کنبہ مصر میں آیا تو آپ نے اپنے **سجدہ** ماں باپ کے لئے سنبھکھوائی اور اہل دربار بطور اظہار اطاعت کو نشیں بجلائے۔

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوا لَهُ سُجَّدًا (۱۲/۱۰۰)

اور (جب شہر میں داخل ہوئے تو) اُس نے اپنے والدین کو تخت پر اونچا بٹھایا (باقی سب کے لئے نیچے نشیں رکھیں) اور (دیکھو) اس وقت ایسا ہوا کہ سب اُس کے آگے جھک گئے اور مصر کے دستور کے مطابق اس کے منصبِ حکومت کی تعظیم بجلائے۔

لفظ سجدہ کے متعلق کتاب ابلیس و آدم، باب آدم) میں بصراحت لکھا جا چکا ہے کہ اس سے مفہوم سچ مچ پیشانی کو زمین پر رکھ دینا نہیں بلکہ اطاعت شعاری اور فرماں پذیری ہے۔ زمین پر ماتھا رکھ دینا اس اطاعت شعاری کا طریق اظہار ہے جو ہمارے ہاں صرف اللہ کے لئے مختص ہے۔ اور حق بھی یہ ہے کہ انسان کی گردن اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنی نہیں چاہیے۔ اس لئے قصہ حضرت یوسفؑ میں سجدہ سے مراد یہ نہیں کہ اہل دربار (یا ان کے بھائیوں) نے سچ مچ زمین پر پیشانی رکھ دی بلکہ اس سے مراد اظہار اطاعت و تعظیم ہے۔ اور اگر اس سے مراد وہی سجدہ ہے جس میں انسان اپنا ماتھا زمین پر رکھ دیتا ہے، تو اس صورت میں "لہ" میں ضمیر کا مرجع خدا لینا ہوگا، یعنی اس شوکت و اجلال کو دیکھ کر حضرت یوسفؑ کے ماں باپ اور بھائی سب خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔ لیکن زبان کے قاعدہ کی رو سے "رفع" کے فاعل

حضرت یوسفؑ کو "لہ" کی ضمیر کا مرجع قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔ اس لئے اس اعتبار سے اس آیت کا مفہوم وہی درست ہوگا جو پہلے بیان کیا گیا ہے، یعنی اہل دربار اور حضرت یوسفؑ کے بھائی ادا اور تعظیماً آپ کے سامنے جھک گئے۔ یا اگر "لہ" کے معنی یہ لئے جائیں کہ "حضرت یوسفؑ کی خاطر" تو اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ جب حضرت یوسفؑ کے والدین اور آپ کے بھائیوں نے آپ کی اس قدر عظمت و شوکت دیکھی تو اس کے لئے خدا کے حضور سجدہ تشکر ادا کیا۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ مسلمان کے لئے خدا کے سوا کسی اور کے سامنے تعظیم ہی کے لئے کیوں نہ ہو سجدہ بہر ہونا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہو سکتا۔

۴۔ حضرت یوسفؑ اور شاہِ مصر

قرآن کریم نے اس امر کی تصریح نہیں کی کہ شاہِ مصر آپ پر ایمان لے آیا اور نہ ہی تاریخ اس واقعہ پر کوئی روشنی ڈالتی ہے۔ اس لئے اس کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ خدا کے رسولؐ تھے۔ ان کا مقصد فقط اتنا ہی نہ تھا کہ اپنی بریت ثابت کر کر قید خانہ سے نکل آئیں اور اس کے بعد بادشاہ کی حکومت میں شریک ہو کر ملک کا انتظام بہتر کر دیں اور بس۔ رسول کے ذمے خدا کا پیغام پہنچانا اور اس کے مطابق نظام زندگی قائم کرنا ہوتا ہے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ بادشاہ آپ کی رسالت پر ایمان لے آیا ہوگا۔ حالات بھی اس کے مؤید ہیں۔ بادشاہ نے آپ کے بلند کیش کا خود مشاہدہ کر لیا۔ خواب کے معاملہ میں آپ کی غیب دانی کو دیکھ لیا۔ ملک کے انتظام میں فراست و تدبیر نکھر کر اس کے سامنے آگئے۔ جب یہ سب کچھ اس کے سامنے آگیا، تو حضرت یوسفؑ کی صداقت پر ایمان لانے میں کونسا امر مانع ہو سکتا تھا؟ پھر حضرت یوسفؑ اخیر عمر تک اس ملک میں رہے اور وہیں متکفن فی الارض ہوئے۔ اگر وہ آپ کی دعوت کا انکار کرتا تو نہ آپ وہاں رہ سکتے تھے نہ وہ آپ کو وہاں رہنے دیتا۔ ان قرآن سے بھی ظاہر ہے کہ نظام زندگی حضرت یوسفؑ کا تجویز فرمودہ خطوط پر ہی مشتمل ہوا ہوگا۔ اگرچہ نسبت کی رو سے اسے "بادشاہ کا قانون" ہی کہا جاتا تھا۔ حضرت یوسفؑ کو وہاں کس قسم کے اختیارات حاصل تھے؟ اس کے لئے قرآن کریم کے ان الفاظ پر پھر غور فرمائیے جہاں ارشاد ہے کہ وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ قَبْلُ إِنَّهَا كَانَتْ مِنْهَا حَيَاتٌ يَشَاءُ (۱۱۲/۵۹) اس

طرح ہم نے یوسفؑ کو مصر میں متمکن کر دیا کہ وہ جہاں چاہے اختیار رکھے، یعنی آپ کے اختیارات اس قدر وسیع تھے۔ بائبل میں اس موقع پر لکھا ہے کہ بادشاہ نے حضرت یوسفؑ کو کل اختیارات دے رکھے تھے۔ خود حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ رَبِّ قَدْ أَتَيْتَنِي مِنَ الْمَلِكِ (۱۲/۱۰۱) ”میرے اللہ نے مجھے حکومت عطا فرمائی“ اس سے بھی ظاہر ہے آخر الامر حکومت آپ ہی کی قائم ہوئی۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ (معاذ اللہ) کسی طاغوتی نظام کے ممد و معاون نہ تھے بلکہ آپ نے اس طاغوتی نظام کو خدائی نظام میں تبدیل کر دیا تھا۔

سورہ مومن کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری کی پوری قوم حضرت یوسفؑ پر ایمان نہیں لائی تھی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کے قصہ کے ضمن میں (جن کی بعثت حضرت یوسفؑ سے قریب چار سو سال بعد ہوئی) دربار فرعون کا مرد مومن اپنی قوم سے کہتا ہے۔

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا
جَاءَكُمْ بِهِ ۗ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَن يَبْعَثَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ
رَسُولًا (۲۰/۳۴)

اور یقیناً اس (حضرت موسیٰ) سے پہلے یوسفؑ تمہارے پاس دلائل (یا واضح قوانین) لے کر آیا۔
لیکن جو کچھ وہ تمہارے پاس لایا تم اس کے بارے میں شک میں رہے۔ یہاں تک کہ جب وہ
فوت ہو گیا تو تم نے کہا کہ اس کے بعد اللہ کوئی (اور) رسول نہیں بھیجے گا۔

یہاں سے یہ واضح ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنا پیغام (رسالت) قوم مصر تک پہنچایا تھا۔ اب سوال یہ باقی رہتا ہے کہ آیا اسے پوری کی پوری قوم نے رد کر دیا یا تسلیم بھی ہوا اور رد بھی ہوا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ حقیقت کہ حضرت یوسفؑ عمر بھر مصر میں رہے اور ممتاز حیثیت سے رہے اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ان کے پیغام کو تسلیم کیا گیا تھا۔ ورنہ نہ یہ ممکن تھا کہ قوم کی پوری مخالفت کے باوجود آپ ایک ممتاز حیثیت سے وہاں رہ سکتے اور نہ ہی یہ ممکن تھا کہ آپ بحیثیت رسول اپنا پیغام کی تبلیغ سے باز رہتے۔ اس لئے اس حقیقت اور دربار فرعون کے مرد مومن کی محولہ صدر تقریر کو ملانے سے اسی نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ آپ کا پیغام تسلیم بھی کیا گیا اور اس کی بابت شک بھی کیا گیا اور یہ بھی کہ بادشاہ اور اس کا آئین حکومت حضرت یوسفؑ کے فصول کے تابع تھا۔ اس لئے بھی کہ وہ یوسفؑ جو قید خانہ میں اس انقلابِ عظیم کا اعلان فرماتے تھے کہ

ءَ اَرْبَابٍ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۲/۳۹) اور جو اس حقیقت
 کبریٰ کا بیباکانہ اظہار فرماتے تھے اِنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) اور جن کے نزدیک یہی دینِ القیامہ
 (۱۲/۴۱) تھا اس کے سوا سب باطل تھا۔ اس کے متعلق یہ تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ ایک غیر خدائی نظام
 حکومت کے دست و پا زدن کر ساری عمر گزار دیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی زندگی میں ملک کی
 آبادی کا ایک حصہ آپ کی نبوت کے متعلق شک میں رہا جیسا کہ اکثر انبیاء کے ساتھ ہوا اور ایک حصہ آپ پر
 ایمان لے آیا۔

خلاصہ بحث | مساعد حالات اور موافق ماحول میں راست بازی اور دیا شنڈاری کی زندگی بسر کرنا چند

دقت طلب نہیں ہوتا۔ لیکن مشکل وہاں آہٹتی ہے جہاں ماحول نامساعد اور حالات
 مخالف ہوں ایسے وقت میں حق و صداقت کو ہاتھ سے نہ جانے دینا یقیناً من عزم الامور ہے اور حقیقت یہ ہے کہ
 انسان کے صحیح کیرکٹر اور بلندی سیرت کا اندازہ بھی ایسے ہی ناموافق حالات میں لگایا جاسکتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ
 چاروں طرف مکرو فریب کے جال کچھ ہے ہیں۔ جھوٹ اور ملمع کاری کو ہر طرف فروغ حاصل ہے۔ جو جس قدر زیادہ
 زمانہ ساز اور فریب کار ہے اتنا ہی زیادہ کامیاب و کامران ہے۔ صداقت اور راست اطواری کا ہر طرف گلا گھونٹا
 جا رہا ہے۔ اس طرز زندگی سے قدم قدم پر مصائب و تکالیف کا سامنا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں مسابقت تصنع اور
 فریب سے حاصل ہو رہی ہے سچے اصولوں پر کار بند رہنے سے ناکامی ہی ناکامی نظر آتی ہے۔ آپ اس دور لہے
 پر ٹھنک کر رک جاتے ہیں۔ ذہنی کش مکش آپ کو کچھ فیصلہ نہیں کرنے دیتی۔ کامیابیوں کا لالچ آپ کو کبھی فریب دیتا ہے
 کہ جن حربوں سے دوسرے لوگ کام نکال رہے ہیں وہی مجھے استعمال کرنے چاہئیں۔ دوسری طرف اصول پرستی ہے کہ وہ
 اس فریب کارانہ روش میں ہر مقام پر غماں گیر ہوتی ہے۔ ان حالات میں وہ لوگ جن کے سامنے نصب العین فقط اصول
 مقصد ہوتا ہے (خواہ اس کے لئے کسی قسم کے ذرائع بھی کیوں نہ استعمال کرنے پڑیں) اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کچھ اور لوگ
 کر رہے ہیں ہمیں بھی وہی کرنا چاہیے۔ نفس کا فریب یہ خوش آئند دلیل پیش کر کے "اطمینان" دلا دیتا ہے کہ ایک فرد اول
 کی اصول پرستی سوائے اس کے کہ اس کی اپنی ہلاکت کا موجب بن جائے اور کیا نتیجہ پیدا کر سکتی ہے۔ عوام ہی نہیں بلکہ
 اتنا عقل کے زور پر مسائل حیات کو حل کرنے والے نظام میں (بڑے بڑے مفکرین کبھی اسی نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ یورپ
 کے فلسفہ اخلاق کا بہت بڑا علمبردار ہربرٹ اسپنسر HERBERT SPENCER لکھتا ہے:

ایک مثالی زندگی بسر کرنے والے انسان کے لئے دوسری قسم کے انسانوں کے اندر مثالی زندگی بسر کرنا ممکن نہیں۔ ان فریب کار لوگوں میں جن کا کوئی اصول نہ ہو خواص سچائی اور صاف دلی یقیناً ہلاکت کا موجب ہوتی ہے۔ ایسی روش زندگی پر جو عام مروجہ مسالک زندگی کے خلاف ہو کامیابی کے ساتھ قائم نہیں رہا جاسکتا۔ یہ چیز آخر کار اس انسان کی اپنی یا اس کی نسل کی یادوں کی موت کا باعث ہوتی ہے۔

(The PRINCIPLES OF ETHICS - Pt. II, P. 108)

ان لوگوں کے لیے ہی فیصلے ہونے چاہئیں۔ لیکن جن کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے وہ ناموافق حالات اور نامساعد احوال و ظروف کے طوفان میں حق و صداقت کی چٹان بن کر کھڑے رہتے ہیں اور پھر دنیا دیکھتی ہے کہ آخر الامر ان کے اپنے سامنے یا ان کے بعد ماحول کو ان کی روش کے تابع ہونا پڑتا ہے۔ ان کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک لمحہ اس حقیقتِ کبریٰ کا آئینہ دار ہوتا ہے کہ

حدیثِ بے خبراں ہے ”تو ہا زمانہ ساز“

زمانہ باتو نہ سازو، تو بازمانہ ستیز

حضرت یوسفؑ کی داستانِ زریں اسی حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے۔

اس قصے میں دوسری چیز ہمارے سامنے یہ آتی ہے کہ اس عالم اسباب میں اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے پروگرام کو اسباب و علل کی کڑیوں سے ہی ظہور میں لاتا ہے۔ کنگان کے ایک ”پروا ہے“ کو ان بلند یوں تک پہنچانے میں ’جہاں‘ چاند اور ستارے“ اس کے سامنے جھکیں، اندھے کنوؤں، مصر کے بازاروں اور قید بند کی مصیبتوں سے گزارنا ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ بلندیاں ملتی ہی اس استحکامِ خودی کے نتیجہ اور صدقے میں ہیں جن کا منظر ان نامساعد حالات میں ہوتا ہے۔



وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ (۱۱/۸۴)

قوم مدین

حضرت شعیب علیه السلام

از ضعیفان نال ربودن حکمت است
 از تن نشان جان ربودن حکمت است
 شیوه تهنیب نو آدم دری است
 پرده آدم دری سوداگری است

حضرت شعیب علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ جلیلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آپ کی بیوی (قطوس) کے بطن سے جو اولاد پیدا ہوئی، ان میں ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ حضرت اسمعیلؑ ارضِ حجاز میں متکون ہوئے اور حضرت اسحاقؑ فلسطین میں، مدینہ حجاز کے شمال میں شام سے متصل علاقہ میں سکونت پذیر ہو گیا اور اس کی نسل تاریخ کے صفحات پر قوم مدین کے نام سے متعارف ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ ۲۱۰۰ء یا ۲۲۰۰ء ق م ہے۔ اس قوم مدین کے آغاز کا زمانہ ۲۱۰۰ ق م تصور کرنا چاہیے۔ جو قافلہ حضرت یوسفؑ کو چاہ کنعان سے بازار مصر لے گیا تھا وہ انہی مدیانیوں کا تھا۔ یہ قوم اس علاقہ میں بڑھی پھولی پھلی، قریب چار سو سال تک یہی حالت رہی تا آنکہ ان میں حضرت شعیبؑ کی بعثت ہوئی۔ جب حضرت موسیٰؑ (قبل از نبوت) مصر سے بھاگ کر نکلے ہیں، تو مدین کی بستی کی طرف ہی آئے

قوم مدین

تھے۔ قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے یہاں پہنچ کر ایک کبیر سن بزرگ کے ہاں رہائش اختیار کرنی اور گلہ بانی کی خدمت سنبھال لی۔ انہوں نے اپنی بیٹی کا عقد حضرت موسیٰؑ سے کر دیا (ملاحظہ ہو ۲۰/۲۲، ۲۸/۲۲ تا آخر رکوع تفصیل حضرت موسیٰؑ کے ذکر میں آئے گی)۔ قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ بزرگ کون تھے لیکن بعض محققین کا خیال ہے کہ آپ حضرت شعیبؑ ہی تھے۔ تورات میں ان کا نام کہیں رعوبیل کہیں یثرو اور کہیں حوباب لکھا ہے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ آپ کا نام حوباب ہی تھا (جیسا کہ کتاب گنتی ۱۰/۲۹ میں مذکور ہے)۔ باقی نام دراصل القاب تھے اور یہی حوباب ہیں جو قرآن کریم میں شعیب کے

۱۰ آیت ۲۹ کے مطابق حوباب حضرت موسیٰؑ کے خسر کا نہیں بلکہ ان کے بیٹے کا نام تھا۔ (طلوح اسلام ٹرسٹ)۔

نام سے موسوم ہیں۔ اس اعتبار سے حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ کا زمانہ ایک ہی ہے یعنی بیسہ پتی بم۔
 اورات میں مذکور ہے کہ مدین کا ایک اور بھائی تھا جس کا نام یقشان تھا۔ اس کا
 بیٹا دووان اپنے چچا مدین کے قریب ہی آباد ہو گیا۔ یہ علاقہ بہت سرسبز و شاداب
 اور گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت شعیب قوم مدین کے علاوہ اصحاب الایکہ کی
 طرف بھی مبعوث ہوئے تھے۔ ارباب تحقیق کا خیال ہے کہ اصحاب الایکہ بنو ووان ہی تھے۔ ایک کے معنی
 ہیں جنگل۔ ان کی بستی کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ وہ اسی شاہراہ (امام مبین) پر واقع تھی جو حجاز سے شام
 کی طرف جاتی ہے اور جس کا ذکر قوم لوط کی سرگذشت میں آچکا ہے۔

وَإِنْ كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ ظَالِمِينَ ۖ فَانْتَقْنَا مِنْهُمُ وَإِنَّمَا
 لِيَا مَامٍ قَبِيلٌ ۙ (۱۵/۷۸)

اور (اسی طرح) گھنے جنگل کے لوگ بڑے ظالم تھے (یعنی اصحاب الایکہ) انہیں بھی ہم نے ظلم
 و سرکشی کی اسناد دی۔ اور یہ دونوں بستیاں (یعنی قوم لوط اور اصحاب الایکہ کی) شارع پر سب
 کو دکھائی دیتی ہیں۔

یہ تھے وہ قبائل جن کی طرف حضرت شعیب مبعوث ہوئے۔ انہی طور پر آپ مدین کے قبیلہ سے متعلق تھے۔

وَالِی مَدَیْنِ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ
 مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ ۗ قَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ فَادْعُوا الْكٰفِرِیْنَ
 وَ الْمُبْزِنِیْنَ وَ لَوْ تَبَخَّسُوا النَّاسَ اَشْیَاءَهُمْ وَ لَا تَنْفُسُهُمْ وَ فِی
 الْاَوْرَاقِ بَعْدَ اَصْلٰحِهَا ۗ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۙ

(۱۵/۷۸) نیز ۱۱/۸۴ : (۹/۳۶)

اور اسی طرح مدین کی بستی میں شعیب کو بھیجا گیا کہ انہی کے بھائی بندوں میں سے تھا۔ اس
 نے کہا، بھائیو! اللہ کی عبودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی تمہارا
 معبود (آقا و حاکم) نہیں۔ دیکھو تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح ضابطہ ہدایت تمہارے
 سامنے آچکا ہے پس چاہیے کہ ناپ تول پورا کیا کرو۔ لوگوں کو خرید و فروخت میں ان کی چیزیں کم
 نہ دو۔ ملک میں درستی کے بعد کہ نظام فداوندی کے قیام سے ظہور میں آرہی ہے (خرابی نہ پیدا کرو۔

اگر تم ایمان رکھتے ہو تو یقین کرو، اسی میں تمہارے لئے بہتری ہے۔
آپ ان قبائل کی طرف سب سے پہلے رسول نہ تھے بلکہ آپ سے پہلے اور رسول بھی آپکے تھے جن کی
تکذیب کی گئی تھی۔

كَذَّبَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ ﴿٢٦﴾
گئے جنگل والوں (اہل مدین) نے اللہ کے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا۔

انہی کو حضرت شعیب نے مخاطب کیا تھا۔

إِذْ قَالَ لَهُمُّ شُعَيْبٌ يَا قَوْمِ اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي كُنْتُمْ تُشْرِكُونَ ۚ

(۱۷۷-۱۷۸/۲۶)

جب شعیب نے ان سے کہا، ”کیا تم اپنی غلط روش کے تباہ کن حواقب سے ڈرتے نہیں؟ یقین
رکھو، میں تمہارے لئے (خدا کی طرف سے) ایک امانت دار رسول ہوں (میرا اتباع کرو اور مجھ پر
ایمان لاؤ)۔

دولت کے نشہ میں مست | ایک تو علاقہ سرسبز و شاداب، اس پر دُور دور تک کی
تجارت۔ اہل مدین دولت کے نشہ میں مست تھے۔

دولت کے ساتھ کثرتِ افراد بھی شامل تھی جو قبائلی زندگی میں بہت بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ اس لئے دولت
وقت کی فراوانی سے یہ قوم طاغوتی سرکشیوں کا آتشیں پیکر بن چکی تھی۔ جب سرمایہ داری اور تجارت
ایک خدا فراموش قوم کے ہاتھ میں ہوں، تو وہ لوگ جن اہلیسی حربوں سے لوگوں کا گلا گھونٹتے ہیں وہ محتاج
تشریح نہیں۔ اس قوم میں یہ سب خرابیاں ایک ایک کر کے آپچی تھیں۔ اس تاجرانہ ”جیب تراشی“
کے علاوہ یہ لوگ اپنی قوت و کثرت کے گھمنڈ پر رہزنی سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ یہ ان کی عام حالت تھی۔
جب حضرت موسیٰ نے (بعد از نبوت) بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے ہجرت کی ہے تو وہ انہی علاقوں
میں نیمہ زن ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل روزمرہ کی ضروریات کی چیزیں انہی لوگوں سے خریدتے تھے۔ یہ نہیں
یوں بھی لُٹتے تھے اور پھر ہر قسم کا فتنہ و فساد بھی برپا کرتے تھے۔ تو رات (سفر القضاة اور سفر لعدد) میں دیکھنے
کہ انہوں نے بنی اسرائیل کے خلاف کس کس قسم کی ننگِ انسانیت حرکتیں کیں۔ ان کی عورتوں نے بنی اسرائیل

کے نوجوانوں کو جو درحقیقت ان کی سپاہ تھی) اپنے دام فریب میں الجھا کر بد اخلاقی کو عام کرنا شروع کر دیا۔ انہیں 'آہستہ آہستہ' اُن کے سرداروں سے باغی بنا دیا۔ ارد گرد کے قبائل کے ساتھ سازشیں شروع کر دیں کہ بنی اسرائیل کو ان علاقوں سے نکال دیا جائے۔ غرضیکہ جس طرح ہر تبد قوم کا شیوہ ہے، انہوں نے اس قسم کے ابلہ فریب حربوں سے بنی اسرائیل کے جواہر ملی کو ایک ایک کر کے چھین لینا چاہا۔ یہ کٹھا وہ وقت جب حضرت شعیبؑ نے انہیں للکارا اور کہا کہ وہ اس قسم کے انسانیت سوز جرائم سے کیوں غضبِ الہی کو دعوت دے رہے ہیں؟ سورۃ اعراف میں ہے۔

وَ اِلٰی مَدٰیْنٍ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ
اِلٰهِ غَيْرِهٖ وَ اَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عٰقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ه

(۸۵ — ۸۶/۴)

اور اسی طرح مدین کی بستی میں شعیب کو بھیجا گیا کہ انہی کے بھائی بندوں میں سے تھا۔ اس نے کہا بھائیو! اللہ کی عبادت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود (آقا و حاکم) نہیں۔ دیکھو تمہارے پروردگار کی طرف سے واضح ضابطہ ہدایت تمہارے سامنے آچکا ہے پس چاہیے کہ ماپ تول پورا پورا کیا کرو۔ لوگوں کو (خرید و فروخت میں) ان کی چیزیں کم نہ دو۔ ملک کی درستی کے بعد کہ نظامِ خداوندی کے قیام سے ظہور میں آ رہی ہے) اس میں خرابی نہ ڈالو۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو یقین کرو، اسی میں تمہارے لئے بہتری ہے۔

اور دیکھو! ایسا نہ کرو کہ اس دعوت کی اشاعت روکنے کے لئے، ہر راستے پر جابٹھو اور جو آدمی بھی ایمان لائے اسے دھمکیاں دے کر خدا کی راہ سے روکو اور اس میں خرابیاں پیدا کرنے کے ورپئے ہو۔ خدا کا احسان یاد کرو کہ تم بہت تھوڑے تھے اُس نے (امن و عافیت دے کر) تمہاری تعداد زیادہ کر دی۔ اور پھر غور کرو، جن لوگوں نے فساد کا شیوہ اختیار کیا تھا، انہیں کیسا انجام پیش آچکا ہے؟

غور کیجئے! وہ تمام عیوب و جرائم جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، کس طرح ایک ایک کر کے بیان کئے گئے ہیں۔ سورۃ ہود میں ارشاد ہے۔

وَ اِلٰی مَدٰیْنٍ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ

مَا لَكُمْ مِنْ آلِهِ عَائِدًا..... يَقِيَّةُ اللَّهِ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ
مُؤْمِنِينَ ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ۝ (۱۱/۸۶-۸۴)

اور ہم نے (قبیلہ) مدین کی طرف اس کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔

اُس نے کہا، ”اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عہودیت (اطاعت و محکومیت) اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود (آقا اور حاکم) نہیں۔ اور ماپ اور تول میں کمی نہ کیا کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خوشحال ہو (یعنی خدا نے تمہیں بہت کچھ دے رکھا ہے۔ پس کفرانِ نعمت سے بچو) میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا دن ایسا نہ آجائے جو سب پر چھا جائے گا۔

اور اے میری قوم کے لوگو! ماپ تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو۔ لوگوں کو ان کی چیزیں ان کے حق سے کم نہ دو۔ ملک میں شر و فساد پھیلانے نہ پھرو۔ اگر تم میرا کہا مانو، تو جو کچھ اللہ کے قانون کے مطابق تمہارے پاس رہے اسی میں تمہارے لئے بہتری ہے۔ اور دیکھو! میرا کام تو صرف نصیحت کر دینا ہے (میں کچھ تم پر نگہبان نہیں کہ سب راہ پر چلا دوں)۔

دعوتِ شعیبؑ | بَقِيَّةُ اللَّهِ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ۝

پھر اس محنت کے حاصل کو خدا کے اس نظام کے تابع رکھو جو ربوبیتِ عامہ کے لئے بہت مشکل ہوا ہے وہاں سے اس رزق کی تقسیم قانونِ خداوندی کی رُو سے اس طرح ہوگی کہ کسی ضرورت مند کی ضرورت رُکی نہیں رہے گی۔ جو کچھ اس طرح سے حاصل ہو، حقیقی خوشگواریاں اور سرفرازیاں اس سے ملتی ہیں۔ اس سے تمہاری صلاحیتوں کی نشوونما اور انسانیت کی پرورش ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں آیات ۱۷۹-۱۸۲/۲۶؛ ۲۹/۳۶ بھی دیکھئے۔

دعوت کا جواب | قوم کی حالت اور حضرت شعیبؑ کی دعوت ہمارے سامنے آچکی۔ اس دعوت سے

عبرت حاصل کی، لیکن باقی اپنی سرکشی میں بدست رہے (۱۱/۸۶)۔

قوم کی بدعنوانیاں اور حضرت شعیبؑ کی اصلاح کی کوششیں دوش بدوش آگے بڑھتی گئیں۔ حتیٰ کہ وہ قوم ان اوجھے ہتھیاروں پر اتر آئی جو اندھی قوت کے آخری حربے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے قوم اور حضرت شعیبؑ کے مکالمات کو اپنے خاص انداز میں بیان فرمایا ہے جسے اسی ترتیب و اسلوب سے درج کیا جاتا

ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے۔

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَشْعِيبَ وَالَّذِينَ
آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُوذُنَّ فِي مَلَكِنَا (۷/۸۸)

اس پر قوم کے دولت مند سرداروں نے جنہیں (اپنی دنیوی طاقتوں کا) گھمنڈ تھا کہا، اے
شعیب! (دوباتوں میں سے ایک بات ہو کر رہے گی) یا تو تجھے اور ان سب کو جو تیرے ساتھ
ایمان لائے ہیں، ہم اپنے شہر سے نکال باہر کریں گے یا تمہیں مجبور کر دیں گے کہ ہمارے دین
میں لوٹ آؤ۔“

دیکھئے جب دانش و بصیرت پر مبنی کوئی جواب پاس نہیں ہوتا تو مستبد
تخویف و ترہیب تو تیس کن و ہمیکوں پر اتر آتی ہیں۔ ”یا تو اس انقلاب انگیز مسلک سے باز آ جاؤ
ورنہ ملک بدر کر دیئے جاؤ گے!“ لیکن جن کی آنکھیں حقیقت کو بے نقاب دیکھ چکی ہوں ان پر ان پر ہمیکوں
کا کیا اثر ہو سکتا ہے؟ حضرت شعیب نے فرمایا، قَالَ اَوْ لَوْ كُنَّا كَارِهِيْنَ قَعْبًا (۷/۸۸) خواہ ہم اس
مسلک کو ناپسند ہی کیوں نہ کرتے ہوں، پھر بھی اسے اختیار کر لیں، غور کیجئے! استبداد کے مطالبات کا
کیسا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ مستبد قوتیں اس کی اجازت نہیں دے سکتیں کہ جسے آپ کی بصیرت درست سمجھے
اسے اختیار کر لینے کا آپ کو حق حاصل ہو۔ آپ کو وہ مسلک اختیار کرنا ہو گا جسے ان کی مصلحتیں اپنے مفید
مطلب سمجھیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جو اللہ کا بندہ علی و جبر البصیرت ان گمراہ کن راستوں کو چھوڑ چکا ہو، وہ محض
استبداد کے ڈر سے ان راہوں کو کیسے اختیار کر لے؟ حضرت شعیب نے فرمایا۔

قَالَ اَوْ لَوْ كُنَّا كَارِهِيْنَ قَعْبًا قَدْ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ
عُدْنَا فِي مَلِكِكُمْ بَعْدَ اِذْ بَعَثْنَا اِلَيْهِ مِنْهَا ط وَ مَا يَكُوْنُ لَنَا
اَنْ نَعُوْذَ فِيْهَا اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ط وَ سِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ
عِلْمًا ط عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ط رَبَّنَا اضْمُرْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ
وَ اَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِيْنَ ۝ (۷/۸۹ — ۸۸)

شعیب نے کہا، ”اگر ہمارا اول تمہارے دین پر مطمئن نہ ہو تو کیا جبر امان لیں؟ اگر ہم تمہارے
دین میں لوٹ آئیں، حالانکہ خدا نے علم و یقین کی روشنی نمایاں کر کے ہمیں اس سے نجات

دیدنی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے جھوٹ بولتے ہوئے خدا پر بہتان باندھا۔ ہمارے لئے ممکن نہیں کہ اب قدم پیچھے ہٹائیں، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہم نے یہ دین اس خدا کی طرف سے پایا ہے جس کا علم تمام کائنات کو محیط ہے۔ باقی رہیں تمہاری دہمکیاں، سو ہم ان کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے۔ ہمارا بھروسہ قوانین خداوندی کی محکمیت پر ہے۔

اس کے بعد شعیب نے خدا کے حضور عرض کیا کہ ”اے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم

کے درمیان سچائی کے ساتھ فیصلہ کر دے اور تو بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!“

جب حضرت شعیب کی محکم خودی کے سامنے ان لوگوں کی کوئی پیش نہ چلی تو عوام کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا کہ خبردار! جو شخص اس کے پیچھے چلے گا سخت عذاب میں ماخوذ کر دیا جائے گا۔

وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَمِثْنِ شُعَيْبًا

إِنَّكَ إِذًا لَمِنَ الْخٰسِرِينَ ۝ (۴/۹۰)

قوم کے سرداروں نے جو شعیب کے منکر تھے (لوگوں سے) کہا، ”اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو

بس سبھ لو تم برباد ہوئے!“

غور کیجئے! دعوتِ حق و صداقت کو کس طرح روکا جاتا ہے! دنیا میں کوئی طاغوتی قوت ایسی نہیں جو دعوتِ الٰہی اللہ کی عام تبلیغ اور اس کی اتباع و اطاعت کی اجازت دیدے۔ ابد سے یہی ہوتا چلا آ رہا ہے اور ازل تک یہی ہوتا چلا جائے گا۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ ابلیس آدم کے ساتھ اس آئینج پر کن دعاوی کو ساتھ لے کر

آیا ہے؟ لہذا اگر طاغوتی قوتوں کی طرف سے کسی دعوت کی مخالفت نہیں

ایک نکھرا ہوا معیار ہوتی تو سمجھ لیجئے کہ وہ دعوتِ حق و صداقت کی دعوت نہیں خواہ اس پر خدا پرستی کے کیسے ہی جاذب نگاہ و نظر فریب پر دمے کیوں نہ ڈال ویسے گئے ہوں۔ اس لئے کہ انسانوں کے خود ساختہ نظامہائے زندگی (خواہ ان کی شکل کچھ اور نام کوئی سا کیوں نہ ہو) ان کی مفاد پرستیوں پر مبنی ہوتے ہیں اور نظامِ خداوندی نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے لئے وجود میں آتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کی مفاد پرستیوں

اور عیشِ سامانیوں پر سخت زد پڑتی ہے۔ لہذا ان کی طرف سے اس نظام کی مخالفت فطری چیز ہے۔ اگر وہ اس کی مخالفت نہیں کرتے تو سمجھ لیجئے کہ یہ نظام صحیح معنوں میں نظامِ خداوندی نہیں۔ حق و صداقت اور باطل و ضلالت کی دعوتوں کو پرکھنے کا یہ ایک ایسا کھلا ہوا معیار ہے جس میں کبھی کہیں کوئی استثناء نظر نہیں آئے گا۔ لہذا

حضرت شعیب کے ساتھ ہی کچھ کیوں نہ ہوتا؟

سورہ ہود میں قوم کی طرف سے ایک ایسا اعتراض درج کیا گیا ہے جو اسلام کی ایک بہت بڑی ہولی حقیقت کو اپنے آغوش میں لئے ہے۔ انہوں نے کہا۔

قَالُوا لَشُعَيْبٍ أَصْلُوثًا تَأْمُرُكَ أَنْ تَتْرُكَ مَا يَعْْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَنْ
تَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ ۝ (۱۱/۸۷)

لوگوں نے کہا، اے شعیب! کیا تیری صلوة یہ حکم دیتی ہے کہ ہمیں آکر کہتے ان مجوسوں کو پھوڑ دو جنہیں تمہارے باپ دادا پوجتے رہے ہیں۔ یا یہ کہ تمہیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہو کرو۔ بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو!

مذہب کے متعلق یہ ایک عام خیال ہے اور اس خیال کو ہمارے زمانے میں خاص مصلحتوں کے ماتحت اور بھی عام کیا جا رہا ہے کہ مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق کا نام ہے۔ اسے دنیاوی معاملات سے کیا واسطہ؟ مذہب کا دائرہ پوجا پاٹ، نماز روزہ، نیک عملی اور

مذہب و سیاست

خدا پرستی" تک محدود ہے، اس سے آگے دنیاوی معاملات ہیں۔ ان معاملات میں مذہب کو دخل انداز نہیں ہونا چاہیے۔ یہ خیال نیا نہیں۔ خدا کا سچا مذہب (جس کے لئے صحیح لفظ 'دین' یعنی نظام اطاعتِ خداوندی ہے)، جہاں اور جب بھی پیش کیا گیا، خود ساختہ قوانین پر چلنے والے انسانوں نے ہمیشہ ہی کہا ہے کہ "مذہب کو ان معاملات کے ساتھ کیا تعلق؟" خدا کی عبادت (یعنی پوجا پاٹ) سے دنیا میں کوئی نہیں روکتا۔ اس سے دوسرے کا بگڑنا کیا ہے۔ آپ صبح سے شام تک اس شکل کی عبادت کرتے رہتے آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ یہ وہ چیز ہے جس کی ہر جگہ آزادی ہے۔ لیکن جب آپ عبادت یعنی عبودیت (یعنی انسانوں کی بجائے قوانینِ خداوندی کی محکومیت) کو مذہب (یعنی دین) کی حیثیت سے اختیار کریں گے اور اس کی دعوت دیں گے تو مستبد قوتیں کبھی اس کی اجازت نہیں دیں گی۔ اس لئے کہ دنیا کا نظام استبداد، بعض انسانوں کو حق دیتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں۔ لیکن انہیں ان کا نظام (یعنی دین) انسانوں سے یہ حق چھین کر اس ذات کے سپرد کر دیتا ہے جو حکومت کی فی الواقع منوا رہے۔ لہذا دوسروں پر اپنی مرضی چلانے کا نوگرا انسان اسے کس طرح گوارا کر سکتا ہے؟ یہ ہے وہ جذبہ محرکہ جس کے ماتحت مستبد قوتوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ مذہب پوجا پاٹ کی حد تک رہے تو بالکل درست ہے، لیکن

اگر معاملات میں دخل دینے لگ جائے تو سخن درین است۔ یہی ہے وہ اعتراض جو قوم مدین نے پیش کیا۔ انہوں نے حضرت شعیبؑ سے کہا کہ آپ نمازیں پڑھتے رہیے۔ ہم کب روکتے ہیں۔ لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آپ کی یہ نماز کیسی ہے جو اس باب میں دخل ہوتی ہے کہ ہم اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں بلکہ اسے کسی اور قانون کے تابع رکھیں۔ "اموال" کے لفظ کو خاص طور پر سامنے رکھتے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ نظام صلوة صرف مساجد کی چار دیواری تک محدود نہیں۔ اس کا دائرہ معاشیات کو بھی اپنے اندر لے آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین خداوندی ان ناہمواریوں کو دور کرنے کے لئے آتا ہے، جو تقسیم رزق کے بارے میں انسانوں نے اپنے خود ساختہ آئین و قوانین کی رو سے پیدا کر رکھی ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر غیر خدائی نظام، نظام خداوندی کے مقابلہ میں آتا ہے اور اس سے بڑی شدت سے متصاوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم اپنی صلوة کا دائرہ اپنی مساجد تک رکھو تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض تو آپ طرف ہیں تمہاری مساجد کی تعمیر مرمت، روشنی، جھاڑ فالوس، فرش، قالین تک کے لئے مدد دوں گا۔ لیکن اگر تم یہ کہو کہ خدا کا قانون ہماری معاشی زندگی کو بھی محیط ہے تو اس کی ہم اجازت نہیں دے سکتے۔

یہ تو تھا آیت کے دوسرے ٹکڑے کے متعلق۔ اب پہلے ٹکڑے پر غور کیجئے۔ اہل مدین بہت پرست تھے۔ بُت پرستوں سے پوچھتے، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم پرستش تو درحقیقت خدای کی کرتے ہیں لیکن ان مقصود سب کا ایک بابا

ہی منزل تک پہنچنے کے دوراستے ہیں۔ اور ایک بُت پرستوں تک ہی کیا موقوف ہے، دنیا میں کسی خدا کے بھگت سے پوچھتے، وہ یہی کہے گا کہ راستے مختلف ہیں لیکن قبلہ مقصود سب کا ایک ہے۔ کسی نے خدا خدا کہہ لیا، کسی نے رام رام۔ بات ایک ہی ہے۔ یہ تعلیم نظام بڑی خوش آئند ہے اور ولآویز۔ اسی لئے مذہب کو خدا اور بندے کے درمیان سخی تعلق تک محدود رکھنے کے مدعی اور سماجی ہمیشہ اس قسم کے فیروں اور بزرگوں کے اقوال پیش کرتے رہتے ہیں جن سے یہ پایا جائے کہ راستے جدا جدا ہیں مہلوب سب کا ایک ہے (جمن ایک گھاٹ بہتیرے۔ کہت کبیر سمجھ کے پھیرے)۔ اور اس کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھاتے

ہیں کہ جب عالمگیر سچائیاں سب جگہ یکساں طور پر موجود ہیں تو پھر اختلافِ طریق پر کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ دوسروں کو اپنے طریق کی دعوت دے جس طریق پر کوئی پلا آ رہا ہے ٹھیک ہے۔ غور کیجئے، قوم مدین نے حضرت شعیب سے کیا ہی نہیں کہا؟ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے آباء و اجداد کے جس طریق پر چلے جا رہے ہیں اور جن چیزوں کی پرستش کر رہے ہیں وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ تم جس انداز سے اپنے رب کی عبادت کرتے ہو وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ لوگوں سے یہ کہو کہ وہ اپنے طریقہ کو چھوڑ کر تمہارا طریقہ اختیار کر لیں؟

متذکرہ صدر تصریحات کو سامنے رکھ کر آیت زیر نظر پر پھر غور کیجئے اور دیکھئے کہ حقائق و عبرت کا کتنا بڑا بحر ذخار ہے جو چند الفاظ کے سوا حل میں گھرا ہوا موجزن ہے۔ دین الہی خدا اور بندے کے درمیان محض پرستش (پوجا پاٹ) کا تعلق نہیں۔ دین حکومتِ خداوندی کا ضابطہ قوانین ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر عروج ہے جو چند الفاظ کے سوا حل میں گھرا ہوا موجزن ہے۔ دین الہی خدا اور بندے کے درمیان محض پرستش (پوجا پاٹ) کا تعلق نہیں۔ دین حکومتِ خداوندی کا ضابطہ قوانین ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر عروج ہے جو چند الفاظ کے سوا حل میں گھرا ہوا موجزن ہے۔ دین الہی خدا اور بندے کے درمیان محض پرستش (پوجا پاٹ) کا تعلق نہیں۔ دین حکومتِ خداوندی کا ضابطہ قوانین ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر عروج ہے جو چند الفاظ کے سوا حل میں گھرا ہوا موجزن ہے۔

دین کا صحیح مفہوم | ہے۔ اس لئے دنیا کا کوئی معاملہ دین کی حدود نہیں باہر نہیں۔ اور دین خداوندی (اسلام) میں عبادت سے مفہوم محض پرستش (پوجا پاٹ) نہیں بلکہ اس ضابطہ قوانین کی عملی اطاعت ہے جس کا نفاذ قوت و حکومت کے بغیر ممکن نہیں۔ عبادت کی مختلف شکلیں (نماز روزہ وغیرہ) اسی اطاعت کا محسوس مظہر ہیں اور اس نظام کے قیام و بقا کا ذریعہ (تفصیل ان امور کی اپنے مقام پر آئے گی)۔

قوم نے یہ کہا اور اس کے جواب میں حضرت شعیب نے فرمایا۔

قَالَ لِقَوْمِ آرَعَيْنَهُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيْتَةٍ مِّن رَّبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَمْلِكَ لَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنفَكُم عَنْهُ إِن أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۝ (۱۱/۸۸)

شعیب نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن رکھتا ہوں اور اس کے فضل و کرم کا یہ حال ہوگا، اچھی

(سے اچھی) روزی عطا فرما رہا ہو (تو پھر بھی میں چپ رہوں اور تمہیں راہِ حق کی طرف نہ بلاؤں؟) اؤ
میں یہ نہیں چاہتا کہ جس بات سے تمہیں روکتا ہوں، اُس سے تمہیں تو روکوں اور خود اس کے
خلاف چلوں (میں تمہیں جو کچھ کہتا ہوں، اس پر عمل بھی کرتا ہوں) میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا
کہ جہاں تک میرے بس میں ہے اصلاحِ حال کی کوشش کروں۔ میرا کام بنانا ہے تو اللہ ہی کی مدد
سے بنانا ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع ہوں!

اس بصیرت افروز جواب کے مختلف ٹکڑوں پر غور فرمائیے۔ قوم نے یہ کہا تھا کہ ہم اُس روش پر چلے
جا رہے ہیں جو ہمارے آباء و اجداد سے ہم تک متواتر پہنچی ہے۔ تم اس کے خلاف کیوں کہتے ہو؟ آپ نے
اس کے جواب میں وہی کہا جو اس سے پیشتر ہر رسول نے اس اعتراض کے
جواب میں کہا تھا، یعنی جب میرے پاس اللہ کی طرف سے ایک کھلی ہوئی
روشنی موجود ہے جس سے میں غلط اور صحیح کی پرکھ کر سکتا ہوں تو پھر بلا سوچے سمجھے آنکھیں بند کئے کسی روش کہن پر
چلے جانا کھلی ہوئی گمراہی ہے۔

یہ واضح دیں اور کھلی ہوئی روشنی حضرت شعیبؑ کی تعلیم تھی جو بذریعہ وحی آپ پر نازل ہوئی تھی۔
پھر اس کے بعد فرمایا کہ دوسری بات یہ ہو سکتی ہے کہ میں تمہاری تخویف و ترہیب سے ڈر جاؤں۔ لیکن
ڈرے وہ جو تمہارا محتاج ہو جسے اللہ پر ایمان ہو وہ انسانوں کا محتاج کیسے ہو سکتا ہے۔ تم میرے رازق نہیں
ہو مجھے رزق اس مہدار فیض سے ملتا ہے جو خَيْرُ الرَّازِقِينَ ہے، جس کا عطا کردہ رزق، درحقیقت
رزقِ حسنہ (بہترین روزی) ہے۔ تم غیر اللہ کو رازق سمجھتے ہو اور ان کی حکومت اختیار کئے ہوئے ہو۔ اس لئے
تمہاری حالت یہ ہے کہ روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے تمہیں دس مرتبہ مقامِ انسانیت سے گزنا پڑتا ہے۔ لیکن
میرا خدا وہ ہے کہ رزق بھی دیتا ہے اور اس کے ساتھ دنیا جہان کی سرفرازیاں بھی۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ۷
آں خدا نمانے دہد جانے دہد
ایں خدا جانے برونانے دہد

پھر فرمایا کہ تم کہتے ہو کہ میں بھی تمہاری روش اختیار کروں، لیکن تم یہ نہیں سوچتے کہ جس بات کو میں علی و جبر البصیر
صحیح سمجھتا ہوں اور اس پر چلنے کے لئے تمہیں دعوت دیتا ہوں، تو کیا میں خود اس کے خلاف چلنے لگ
جاؤں؟ میں جو کچھ تم سے کہتا ہوں وہی کچھ خود بھی کرتا ہوں۔ باقی رہا یہ کہ میری صلوة یہ کیوں حکم دیتی ہے کہ میں

تمہارے "دنیاوی معاملات" میں بھی دخل انداز ہوں اور تم سے تمہارے آباء و اجداد کی روش کہن چھڑا کر ایک اور راہ پر لے چلوں، سو یہ اس لئے ہے کہ میں اپنی استطاعت بھر تمہاری اصلاح چاہتا ہوں اور اصلاح کے لئے یہ سب کچھ ضروری ہے۔ لیکن جو کچھ چاہتا ہوں اس کی توفیق کا اللہ سے طلبگار ہوں۔ اسی کے قوانین کی حکمت پر میرا بھروسہ ہے اور ہر مشکل مقام پر اسی کی قوت و تائید کی طرف رجعت! اس کے بعد فرمایا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ ایسا نہ کرو کہ چونکہ تم نے پہلے ہی سے دل میں فیصلہ کر لیا ہے کہ میری مخالفت ضرور کرنی ہے اس لئے میں جو کچھ کہوں اُس کا اٹک کرے جاؤ۔ یہ روش سر تا پا حماقت ہے اور اس کا نتیجہ ہلاکت و بربادی۔

وَلْيَوْمَ لَا يُخِيرُ مَتَكُمْ شِقَاقِي أَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ
نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ طَلُوتَ وَمِثْلَكُمْ
بِئَعِينِ ۝ (۱۱/۸۹)

اور اے میری قوم کے لوگو! میری ضد میں آکر کیسی ایسی بات نہ کر بیٹھنا کہ تمہیں بھی ویسا ہی معاملہ پیش آجائے جیسا قوم نوح کو یا قوم ہود کو یا قوم صالح کو پیش آچکا ہے۔ اور قوم لوط (کا معاملہ) تم سے کچھ دور نہیں۔

محض ضد! غور کیجئے! کیا دنیا میں حق و صداقت کی مخالفت عام طور پر اسی نتیجے سے نہیں ہوتی کہ محض ضد اور تعصب کی بنا پر فیصلہ کر لیا جاتا ہے کہ اس کی مخالفت کرنی ہے اور پھر اس کے بعد کبھی سوچا ہی نہیں جاتا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اس پر غور تو کر لیا جاتے؟ یہی وہ راہ ہے جو سیدھی تباہی اور بربادی کے جہنم تک لے جاتی ہے۔ اس روش سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ حضرت شعیبؑ نے فرمایا:

وَأَسْتَغْفِرُكَ رَبِّكَ ثُمَّ يُوَدُّ إِلَيْهِ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ ۝ (۱۱/۹۰)
اور دیکھو! اللہ سے اپنی حفاظت چاہو اور اس کی طرف لوٹ جاؤ۔ میرا پروردگار بڑا ہی رحمت والا
بڑا ہی محنت والا ہے۔

قوم کے پاس ان محکم دلائل کا جواب کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن کیا انہوں نے لاجواب ہو کر اعتراف حقیقت کر لیا؟
توبہ! توبہ! نخوت و تکبر کے شیطاں بھلاکب اس کی اجازت دیتے ہیں؟ انہوں نے کہا:

قَالُوا يَا شُعَيْبُ مَا لَفَقَهُ كَثِيرًا مِمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا ۚ

وَلَوْ لَا رَهْمُكَ لَرَجَمْنَاكَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْنَا بِعِزِّينَ ۝ (۱۱/۹۱)

لوگوں نے کہا: اے شعیب! تم جو کچھ کہتے ہو اس میں سے اکثر باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم لوگوں میں ایک کمزور آدمی ہو۔ اگر تمہارے ساتھ تمہاری برادری کے لوگ نہ ہوتے تو ہم ضرور تمہیں سنگسار کر دیتے۔ تمہاری ہمارے سامنے کوئی ہستی نہیں۔

اس جواب پر صحیح تبصرہ خود حضرت شعیب کے ارشاد میں موجود ہے جو اس سے اگلی آیت میں ہے۔ آپ نے فرمایا۔

قَالَ لِقَوْمِ أَرَهَيْتُمْ عَلَىٰ آعْرَأَ عَلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَاَتَّخَذُ ثَمُودُ وَ رَأَىٰ كُمْ
ظَهْرِيًّا إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝ (۱۱/۹۲)

شعیب نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! کیا اللہ سے بڑھ کر تم پر میری برادری کا دباؤ ہوا؟ اور اللہ تمہارے لئے کچھ نہ ہو گا کہ اسے یونہی ساتھ رکھ لیا کہ جب کوئی اور تدبیر کارگرنہ ہو تو اسے آخری حربے کے طور پر استعمال کر لیا جائے۔ (اچھا، جو کچھ تم کرتے ہو، میرے پروردگار کے احاطہ علم سے باہر نہیں۔"

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے دو الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ دنیا میں انسان دوسرے انسانوں کا پاس خاطر تو کرتا ہے لیکن خدا کا خیال کبھی نہیں کرتا! آپ نے کیسی حقیقت گستا اور دلائل و ثبوتات کہی ہے کہ کم بختو! تمہارے انسانوں کا پاس خاطر لیکن! تمہارے نزدیک (معاذ اللہ) کچھ شے ہی نہیں کہ اسکا بھی کچھ خیال رکھا جائے! غور کیجئے! کیا دنیا میں تمام بڑی بڑی خرابیوں کی علت یہی نہیں کہ لوگ انسانوں کا پاس خاطر تو کرتے ہیں لیکن اللہ کو پس پشت ڈالے رکھتے ہیں۔ اگر اللہ کا وہ بیان پیش نظر ہے تو غلش و اضطراب اور فتنہ و فساد کی یہ جہنم سکون و طمانیت کی جنت بن جائے۔

مندرجہ صدر آیت (۱۱/۹۲) میں ظہریًّا کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ عربوں کے ہاں قاعدہ تھا کہ جب وہ سفر میں جاتے تو بٹنے اونٹوں کی فی الواقع ضرورت ہوتی ان سے ایک آدھ زاید ساتھ لے لیتے کہ اگر راستے میں میعاد اونٹوں میں سے کسی کو کوئی عارضہ لاحق ہو گیا یا مادہ پیش آگیا تو یہ فالتو اونٹ (EXTRA) کام آجائے گا۔ حضرت شعیب نے ان سے کہا کہ تم خدا کا نام ضرور لیتے ہو اور اس کے ماننے کے مدعی بھی ہو۔ لیکن عملی زندگی میں تم نے اس کی حیثیت ایک ظہریٰ جیسی رکھ چھوڑی ہے کہ جب کوئی اور تدبیر کارگرنہ ہو تو اسے بطور آخری حربہ استعمال کر لیا جائے۔

یہ ہے تمہارا خدا کو ماننا!

غور کیجئے! کیا آج ہماری بھی یہی حالت نہیں؟

جب حضرت شعیب نے دیکھا کہ قوم اپنی ضد پر بُری طرح سے جمی ہوئی ہے تو فرمایا کہ میں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ تم اگر تباہ ہونے پر تکلے بیٹھے ہو تو تمہیں اللہ کے عذاب سے کون بچا سکتا ہے؟

وَلْيَقُومِ اَعْمَالُكُمْ عَلٰی مَا كَانَتْكُمْ اِتٰی عَامِلًا سَوَّوْا تَعْلَمُوْنَ لَمَنْ يَّاتِيْهِ
عَنْ اَبِّ يُخْزِيْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ وَّ اَرْتَقِبُوْا اِتٰی مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ۝ (۱۱/۹۳)

اور اے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ کام کتنے جاؤ! میں بھی (اپنی جگہ) سرگرم عمل ہوں۔ بہت جلد معلوم کر لو گے کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے گا اور کون فی الحقیقت جھوٹا ہے؟ انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

یعنی وہی استنباحی طریق استدلال (PRAGMATIC TEST) کہ میرے پروگرام کو تکمیل تک پہنچا لینے دو! اس کے نتائج خود بتا دیں گے کہ میرا دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا۔



سورۂ شعراء میں ہے کہ قوم نے کہا کہ تمہاری ان باتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ (خاکم بدہن) تمہارا دماغ ٹھیک نہیں رہا۔ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

قَالُوْا اِنَّمَا اَنْتَ مِنَ الْمُسْتَحْوِيْنَ ۝ (۲۶/۱۸۵)

شعیب کی قوم نے کہا: اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے (جو یوں ہلکی ہلکی باتیں کرنے لگے ہوں)۔

اس لئے کہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ **بشر اور رسول؟** تم پر اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے لیکن تم تو ہمارے جیسے انسان ہو۔ تم پر وحی کیسے ہو سکتی ہے؟ یعنی اسی سازگاری کی صلے بازگشت جو ہم اس سے پیشتر اہم سابقہ کے احوال و کوائف میں سنتے چلے آئے ہیں۔

وَمَا اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (۲۶/۱۸۶)

اور تم اس کے سوا کیا ہو کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو (پھر تم رسول کہاں سے بن بیٹھے) بلاشبہ

ہم تمہیں جھوٹے لوگوں میں سے (ایک جھوٹا آدمی خیال کرتے ہیں۔
اگر تم واقعی سچے ہو تو وہ عذاب لے آؤ جس کی دھمکی دے رہے ہو۔
فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ إِن كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ (۲۶/۱۸۴)
اگر تم سچ بولنے والوں میں سے ہو تو آسمان کا کوئی ٹکڑا ہم پر گرا دونا! (دیکھیں تمہارا خدا کس طرح یہ کچھ
کو دیتا ہے!)۔

اس کے جواب میں آپ نے فقط اتنا فرمایا کہ
قَالَ رَبِّيَ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ (۲۶/۱۸۸)
شعیب نے (جواب میں) کہا (گھبراؤ نہیں) میرا خدا اچھی طرح جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو (اس کا قانون
مکافات غافل نہیں ہے تمہارے اعمال کی سزا مل کر رہے گی)۔
وہ تمہارے اعمال سے واقف ہے اور اعمال کے ظہور نتائج کا وقت بھی اُس کو معلوم ہے۔ اس لئے میں تم پر
عذاب کیا لاؤں گا؟ عذاب لائیں گے خود تمہارے اعمال!

ظہور نتائج کا وقت | قوم مدین اپنی بد عنوانیوں اور سرکشیوں میں آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ
خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق ہلکتا کارا نہ ختم ہو گیا اور ظہورِ عذاب
شروع ہو گیا۔ تورات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ مدیانیوں کا فتنہ و فساد حد سے بڑھ چکا ہے
اس لئے اب ان سے انتقام لو۔

پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ مدیانیوں کو ننگ کرو اور انہیں مارو۔ (گنتی ۱۴-۱۵/۱۴)
پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اہل مدین سے بنی اسرائیل کا انتقام لے اور تو بعد
اُس کے اپنے لوگوں سے مل جائے گا۔ (گنتی ۲/۳۱)

چنانچہ ایک قیامت نیز جنگ ہوئی جس میں مدیانی بُری طرح سے تباہ ہوئے۔ قرآنِ کریم میں جنگ کا ذکر
نہیں بلکہ اس کے بعد کا ذکر ہے جو زلزلہ اور آتشِ فشاں کی صورت میں اُن پر مسلط ہوا اور جس سے ان کی بستیاں
ویرانوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے بعد انہیں مزید ہلکتا دی گئی کہ وہ اپنی حالت میں
اصلاح کر لیں لیکن جب وہ اس پر بھی اپنی سرکشیوں اور بد عنوانیوں سے باز نہ آئے تو پھر ان کی بربادی کا وقت

آپہنچا۔ سورۃ اعراف میں ہے۔

فَاَخَذْنَا مِنْهُمُ الرِّجْفَةَ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جِثِيْنًا ۝۹۱ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَكُنُوْا فِيْهَا ۝۹۲ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَكُنُوْا فِيْهَا
الْحٰسِرِيْنَ ۝ (۹۱-۹۲/۷)

پس ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آلیا اور جب ان پر صبح ہوئی تو گھروں میں اوندھے
مُندے پڑے تھے!

جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا، ان کا کیا حال ہوا؟ گویا ان بستیوں میں کسی بے ہی نہ تھے!
جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا، وہی برباد ہونے والے تھے!

یہی الفاظ سورۃ عنکبوت میں ہیں۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذْنَا مِنْهُمُ الرِّجْفَةَ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جِثِيْنًا ۝۳۷
تو (دیکھو) شعیب کو اس کی قوم کے لوگوں نے جھٹلایا۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی ہولناکی نے
انہیں آلیا اور جب ان پر صبح ہوئی تو گھروں میں اوندھے مُندے پڑے تھے!
حضرت شعیب اس سے پہلے ہی ان سے الگ ہو چکے تھے۔

فَقَتَلُوْا عَنْهُمْ وَاَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُمْ رِسَالَتِ رَبِّيْ وَ نَهَضْتُمْ لَكُمْ
فَكَيْفَ اَسَى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۝۸۴ (۸۴/۷)
بہر حال شعیب ان سے کنارہ کش ہو گیا۔ اُس نے کہا: بھائیو! میں نے پروردگار کے پیغامات تمہیں
پہنچا دیئے تھے اور تمہاری بہتری چاہی تھی! مگر جب تم نے جان بوجھ کر ہلاکت کی راہ پسند کی تو میں
نماننے والوں (کی تباہی) پر اب کیسے افسوس کروں۔

آیت کے آخری الفاظ پر غور فرمائیے۔ ان میں بظاہر قوم کے عبرت انگیز انجام سے بے تعلق پائی جاتی ہے لیکن
ذرا گہرائی میں جا کر دیکھئے تو اس بے تعلق میں یاس و تأسف اور ہمدردی و شفقت کے کس قدر نازک اور شدید
جذبات مضمحل ہیں! مصلحین کو بھی کیسا درد مند دل عطا ہوتا ہے! (نیز دیکھئے ۹۲-۹۵/۱۱ : ۱۸۹/۲۶)۔

یہ ہے سرگذشت قوم مدین۔ اصحاب الایکھ کا ضمنی ذکر قرآن کریم کے دو اور مقامات میں بھی آیا ہے۔

وَأَمْوَالُهُمْ وَأَمْوَالُهُمْ وَأَمْوَالُهُمْ وَأَمْوَالُهُمْ وَأَمْوَالُهُمْ
اور نمود اور قوم لوط اور گھنے جنگلوں والے (اہل مدین) سب کے سب تباہ کر دیئے گئے۔ یہ سب
بڑی بڑی جماعتیں تھیں۔ (مگر جب عذاب آیا تو ان کی جمعیت کچھ بھی کام نہ آئی)۔

خلاصہ بحث حضرت ابراہیمؑ کا ایک بیٹا مدین، حجاز کے شمال میں شام سے متصل علاقہ میں آباد ہو گیا تھا۔ اس کی نسل، قوم مدین کہلائی۔ اس قوم کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ یہ قوم، وقت اور دولت کے نش میں ہدمست، کمزور و ناتواں انسانوں کی بے حد حق تلفی کرتی تھی۔ ان کا معاشی نظام بچدنا ہموار اور سلب و نہیب پر مبنی (سرمایہ دارانہ) تھا۔ حضرت شعیبؑ نے انہیں اس ظلم و فساد سے روکا تو انہوں نے چاہا کہ کسی طرح باہمی مصالحت (COMPROMISE) کی صورت نکل آئے جس کی رُو سے حضرت شعیبؑ "خدا کی عبادت" اپنے طور پر کرتے رہیں اور اس قوم کے "دنیاوی" معاملات میں دخل نہ دیں۔ لیکن انہوں نے دین کا مفہوم ہی نہیں سمجھا تھا۔ دین میں اس قسم کی تفریق کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت شعیبؑ نے اپنے مشن کو جاری رکھا اور قوم نے جی بھر کے مخالفت کی۔ بالآخر قانون مکافاتِ عمل کی رُو سے ان کی تباہی کوہِ آتش فشاں کی شعلہ باریوں کی صورت میں اُن پر مسلط ہو گئی اور اس قوم کے فقط افسانے باقی رہ گئے۔

ان کے بعد انبیاء کرامؑ کا تذکرہ جلیلہ (۱) برقی طور اور (۲) شعلہ مستور میں ملے گا اور پھر حضور خاتم النبیینؐ کے تذکارِ جمیلہ "معراجِ انسانیت" میں۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ!

پرویز

کتبہ عبدالجبار